امام محمد باقرؑ نے فرمایا
''ہر آدمی کی قیمت اور قدر اسکی معرفت ہے''
(معانی الاخبار)

کشف المعارف

سید باقر نثار زیدی

نام کتاب	کشف المعارف
مؤلف	سید باقر نثار زیدی
ناشر	سید باقر نثار زیدی
کمپوزنگ	سید ناصر عباس زیدی
ٹائٹل ڈیزائننگ	سید صفدر عباس زیدی
ٹائٹل کنسلٹینٹ	سید آفتاب حسین رضوی
طبع اول	مئی ۲۰۰۵ء
تعداد	۱۰۰۰
ای میل ایڈریس	baqarnisar@hotmail.com
موبائل نمبر	0333-2120721
ملنے کا پتہ	حامد اربک ڈپو۔ امام بارگاہ شہدائے کربلا۔ انچولی کراچی
	اسد بک ڈپو۔ قدمگاہ مولا علی۔ حیدرآباد
	ممتاز علی نگر۔ نزد کیپری فوٹو اسٹوڈیو۔ اسٹیشن روڈ۔ لاڑکانہ
	امام بارگاہ مطہرہ نجفی۔ H-115 ماڈل ٹاؤن۔ لاہور
	الفائم بک ڈپو۔ بالمقابل امام بارگاہ بھون روڈ۔ چکوال

سید عمران حیدر نقوی۔ راولپنڈی۔ موبائل نمبر 0333-5231475

تنبیہ

نماز پڑھنا صرف اور صرف مومن کا حق ہے۔ منافق کو اتنا بھی حق نہیں ہے کہ وہ مصلے پر قدم بھی رکھ سکے کیونکہ وہ جتنا جتنا نماز پڑھے گا اتنا اتنا غضب خداوندی میں گرفتار ہوتا جائے گا۔ مومن کا یہ استحقاق اسلئے بنتا ہے کہ اسکے دل میں۔ اسکے خون میں۔ اسکی سانسوں میں بلکہ اسکے پورے وجود میں حقیقت نماز رچی بسی ہوتی ہے۔ وہ قیام کرتا ہے تو اسکے ذہن میں اپنے امام زمانہ کا قیام ہوتا ہے۔ وہ جب "اھدنا الصراط المستقیم" کہتا ہے تو اسکی مراد ولایت علی پر استقامت ہوتی ہے۔ وہ جب رکوع کرتا ہے تو اسکے تصور میں وہ ہوتا ہے جس نے حالت رکوع میں زکوٰۃ دی تھی۔ وہ جب سجدہ کرتا ہے تو اسکی نظر میں وہ ہوتا ہے جس نے ایسا سجدہ کیا کہ پھر سجدے سے سر نہ اٹھایا۔ وہ جب تشہد پڑھتا ہے تو شہادت ولایت علی کو مرکز شہادت قرار دیتا ہے۔ اس لئے مومن اور نماز ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں جنھیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ کچھ ایسے لوگ موجود ہیں جو مومن ہونے کا دعویٰ تو کرتے ہیں لیکن احکامِ خدا کا انکار کرتے ہیں۔ ان لوگوں سے ہوشیار رہنا از حد ضروری ہے کیونکہ کرتے یہ ہیں اور الزام مومنین پر آتا ہے۔ ہم واضح طور پر ایسے لوگوں سے براءت وبیزاری کا اعلان کرتے ہیں لہٰذا کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ ایسے لوگوں کا کوئی تعلق ہم سے جوڑے۔

وضاحت

میرے چند احباب نے مجھ سے سوال کیا ہے کہ میرے ادارے میں کتنے افراد شامل ہیں اور اس ادارے کا کام کیا ہے؟۔ان دوستوں کی اطلاع کے لئے میں واضح طور پر اعلان کرتا ہوں کہ میرا کوئی گروپ۔کوئی ٹیم۔کوئی حلقۂ اثر اور کوئی ادارہ نہیں ہے۔نہ ہی میرے پاس کوئی پبلشر ہے۔میں نے جو کام بھی کیا ہے اور جو کام بھی میں کر رہا ہوں وہ تن تنہا کر رہا ہوں جس میں میرا کوئی شریک و سہیم نہیں اور نہ میں کسی کے کام میں شریک ہوں۔میں فقط اپنے امام پر ہی توکل کرتا ہوں اور ان ہی کی مدد کا طلبگار رہتا ہوں کیونکہ میرا پیر۔میرا مرشد۔میرا مولا۔میرا رہبر اور میرا مرجع صرف اور صرف میرے زمانے کا امام ہے۔اس کے علاوہ کسی اور کی طرف میری نظر اٹھتی ہی نہیں۔اسلئے مجھے کسی اور کے افعال کا ذمہ دار نہ سمجھا جائے۔

ہدیہ

میں اپنی اس ادنیٰ کوشش کو ہدیہ کرتا ہوں اسکی بارگاہ میں

جو علیِ اعلیٰ ہے
جو اس عالمِ ہست و بود کو خلعتِ وجود بخشنے والا ہے
جو عالمین کی پرورش کرنے والا ہے
جسکے حکم سے تقدیرات لکھی اور مٹائی جاتی ہیں
جو علی ہے۔ اعلیٰ ہے۔ اعلیٰ الا علیٰ ہے۔ اعلیٰ الا علیٰ الا علیٰ ہے
جو عظیم ہے۔ اعظم ہے۔ اعظم الا عظم ہے۔ اعظم الا عظم الا عظم ہے
جو کریم ہے۔ اکرم ہے۔ اکرم الا کرم ہے۔ اکرم الا کرم الا کرم ہے
جو کبیر ہے۔ اکبر ہے۔ اکبر الا کبر ہے۔ اکبر الا کبر الا کبر ہے
جس سے اس دنیا میں سب سے زیادہ محبت کی گئی
اور جس سے اس دنیا میں سب سے زیادہ دشمنی کی گئی
میرے ماں باپ قربان ہوں اس مقدس وجود پر۔

انتساب

میں اس کتاب کا انتساب اپنے مرحوم والدین سید نثار حسین زیدی اور سیدہ ریاض فاطمہ زیدی کے نام کرتا ہوں جنکی دعائیں آج بھی میری ساعت کا تعاقب کرتی ہیں اور جنکی ربوبیت اور شفقت آج بھی میرے لئے سایبان بنی ہوئی ہے۔

رَبِّ ارحمہما کما ربّیانی صغیرا

ماخذ

کتاب	مولف
قرآن حکیم	
تفسیر المتقین (ترجمہ وتفسیر)	علامہ امداد حسین کاظمی
اصول کافی	محمد بن یعقوب کلینیؒ
فروع کافی	محمد بن یعقوب کلینیؒ
مدینۃ المعاجز	سید ہاشم بحرانی
تفسیر فرات	علامہ فرات بن ابراہیم کوفی
التوحید	شیخ صدوق
کمال الدین وتمام النعمہ	شیخ صدوق
ثواب الاعمال وعقاب الاعمال	شیخ صدوق
من لا یحضرہ الفقیہ	شیخ صدوق
نہج الاسرار	خطبات امیر المومنین
نہج البلاغہ	خطبات امیر المومنین
مفاتیح الجنان (مترجمہ حافظ سید ریاض حسین)	علامہ عباس قمی
عمدۃ المطالب	محمد بن علی ابن شہر آشوب
کوکب دری	سید محمد صالح کشفی ترمذی
انسائیکلوپیڈیا حضرت علیؑ	طالب حسین کرپالوی

ماخذ

مولف	کتاب
سید صادق حسینی شیرازی	علی فی القرآن
آغا خمینی	تفسیر سورۂ حمد
علامہ محمد بشیر انصاری	حقائق الوسائط
اقوال امیر المومنین	حکمت بوتراب
علامہ نذر حسین قمر	شہادت ولایت علی
علامہ نثار عباس نقوی	اکمال الدین بولایت امیر المومنین
سلیم بن قیسؓ	کتاب سلیم بن قیس
جواد قیومی اصفہانی	صحیفۂ الحسین
جواد قیومی اصفہانی	صحیفۂ زہراؑ
جواد قیومی اصفہانی	صحیفۂ رضا
علامہ بوعلی شاہ	مولود کعبہ
شیخ صدوق	امالی
شیخ صدوق	معانی الاخبار
علامہ غضنفر عباس تونسوی	توحید العارفین من کلام المعصومین
مولانا ظفر حسن امروہوی	مجمع الفضائل
علامہ عبداللہ شاہ عبد	العلی سلطانا نصیرا

فہرست مضامین

فہرست مضامین

فہرست مضامین

فہرست مضامین

فہرست مضامین

فہرست مضامین

فہرست مضامین

فہرست مضامین

ثمرِ محبت

جوہرِ انسانیت عقل ہے۔ جوہرِ عقل علم ہے۔ جوہرِ علم معرفت ہے اور جوہرِ معرفت محبت ہے۔ انسان کی دنیاوی ترقی و مراتب کے لئے جن چیزوں کو کام میں لاتا ہے وہ بھی چار چیزیں ہیں یعنی عقل، علم، معرفت، محبت۔ ان میں سے اول الذکر دو چیزوں یعنی عقل، علم کا تعلق دنیا سے بھی ہے اور آخرت سے بھی۔ اب یہ خود انسان پر منحصر ہے کہ وہ ان کو کس مقصد کے لئے استعمال کرتا ہے۔ دنیا کے لئے یا آخرت کے لئے یا دونوں کے لئے۔ لیکن آخر الذکر دو چیزوں یعنی معرفت اور محبت کا تعلق خالصتاً آخرت سے ہے اور عقل و علم کو بھی حصول آخرت کے لئے صرف اسی صورت میں استعمال کیا جا سکتا ہے جبکہ مقصود معرفت و محبت ہوں ورنہ اگر معرفت کا مقصود محبت نہ ہو تو یہی معرفت حسد اور دشمنی کو جنم دیتی ہے اور جتنی جتنی معرفت بڑھتی جاتی ہے اتنی اتنی حسد اور دشمنی کی آگ اور بھڑکتی جاتی ہے۔ اسی سے اللہ نے بھی اپنے بندوں پر پہلے محبت فرض کی ہے اور اس کے بعد معرفت تاکہ محبت میں مسلسل اضافہ ہوتا رہے۔ اسی لئے ہم نے بھی ابتدا محبت سے کی ہے قبل اس کے کہ ہم حقائق معرفت بیان کریں۔

ہوتا یہ ہے کہ کچھ لوگ بظاہر عاقل و فہیم نظر آتے ہیں اور قوت عقلیہ کی مدد سے وہ مختلف علوم حاصل کر لیتے ہیں مثلاً صرف و نحو، منطق، کلام، فلسفہ، سائنس وغیرہ۔

کچھ لوگ علوم دینیہ میں بھی مہارت حاصل کر لیتے ہیں مثلاً قرآن، حدیث، فقہ وغیرہ، لیکن چونکہ ان کا مطمح نظر معرفت و محبت نہیں ہوتا اور وہ یہ تمام علوم محض لوگوں کا مرجع بننے، شہرت حاصل کرنے اور مال بنانے کے لئے حاصل کرتے ہیں اس لئے آخرت کے اعتبار سے جاہل کے جاہل رہتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو غرور میں آ کر چھوٹ جاتے ہیں۔ عربی لحن اختیار کر لی جاتے ہیں۔ "ع"، "ق"، "ض" اور "ظ" کے مخارج کو بڑی قوت سے ادا کرتے ہیں اور اسی لہجے سے ادا کرتے ہیں۔ ان کی پہچان شعر و شاعری ہوتا ہے اور اپنی پہچان کو نمایاں کرنے کے لئے وہ ایک خاص لباس، ایک خاص چلن اور ایک مخصوص چال ڈھال کو اپناتے ہیں۔ لیکن اگر لوگوں کے سامنے ذکر معرفت کا ذکر کیا جائے تو یہ کراہت کا اظہار کرتے ہیں اور کیونکر کراہت نہ کریں جبکہ یہ محبت سے محروم ہیں۔

ایک ضروری بات

ایک سازش ہے جو مومنین کو ہر دور میں پیش آتی رہی ہے اور آج بھی درپیش ہے۔ یہی سازش ہے جس کے سبب سے لوگوں میں ذوق مطالعہ اور شوق حصول علم رفتہ رفتہ ناپید ہوتا جا رہا ہے اور ذرائع علم پر ایک خاص ٹولے کی اجارہ داری روز بروز مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جا رہی ہے۔ وہ سازش ہے زبان عرب سے پوری طرح واقفیت نہ ہونا اور اسی پر مومنین کو ہدف طنز و طعن بنایا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ ترجمے

پڑھے بغیر کوئی عالم نہیں بن سکتا بلکہ عربی ادب پڑھنا ضروری ہے۔ اگر آپ کسی پر کوئی دلیل قائم کریں تو وہ آپ کی دلیل کو توڑنے کا ایک طرف، اور چھوٹتے ہی آپ سے سوال کرے گا: "آپ کو عربی آتی ہے؟"۔ یہ سنتے ہی مومن کی گاڑی کو بریک لگ جاتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس مغالطے کا بھی ازالہ کرتے چلیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ ان کا شدید ترین احساسِ کمتری ہے جو عربی زبان سے ظاہر ہوتا ہے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ عربی کے ماہر بن جانے کے باوجود نہ تو قرآن کی سمجھ میں آیا اور نہ حدیث۔ نہ ہی حقائق معرفت ان تک پہنچ سکے۔ اس صورت حال میں جب وہ دیکھتے ہیں کہ ایک ایسا شخص اسرارِ معرفت بیان کر رہا ہے جو عربی کا ماہر نہیں ہے تو ان کے حسد کے لاوے کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے اور ان کی پگڑی اور جبہ اترنے لگتی ہے اور پھر ان کے پاس کوئی چارہ کار باقی نہیں رہ جاتا سوائے اس کے کہ وہ زبان عرب کا سہارا لیں۔

قرآن عربی زبان میں نازل ہوا ہے اور عربی کا ایک مخصوص لہجہ اور مخصوص محاورات ہیں جن کے بغیر صحیح مطلب ادا نہیں ہو سکتا۔ اس صورت میں مولوی کو مشغلہ مل جاتا ہے کہ وہ مومنین کو طعنہ دے کہ "تم تو قرآن کو صحیح طور پر پڑھ بھی نہیں سکتے"۔ لیکن اللہ ان تمام چیزوں سے بے نیاز ہے۔ چنانچہ اصول کافی۔ کتاب فضل القرآن۔ باب ۱۲ میں امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: "میری امت کا غیر عربی اگر قرآن

کوئی زبان میں پڑھے گا تو فرشتے اسے عربی لہجے میں بارگاہِ الٰہی میں پہنچائیں گے"۔

جب ہم تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ جب کوئی غیر عرب حضور کی خدمت میں حاضر ہوتا اور عربی میں گفتگو کرتا تو حضور اسے روک دیتے اور خود اس کی زبان میں بات کرتے۔ حضرت سلمان فارسی ایران کے رہنے والے تھے اور ان کی مادری زبان فارسی تھی۔ وہ تو ایمان کے آخری درجے پر فائز ہو گئے اور "سلمان منا اہل البیت" میں شامل ہو گئے لیکن عربی فر فر بولنے والے وہیں رہے جہاں وہ تھے۔ بلکہ ان میں سے کچھ قرآن پڑھ کر منافق بن گئے۔

جناب شہر بانو بھی ایرانی تھیں اور فارسی ہی میں گفتگو کیا کرتی تھیں لیکن اللہ نے انہیں بی بی جنت کا تاج پہنا دیا اور عربی بولنے والی عورتیں محروم رہیں۔

فاعتبروا یا اولی الابصار

حقیقت یہ ہے کہ لسانیات یعنی زبانوں کے علم کا تعلق کسی بھی اعتبار سے دین سے نہیں بنتا بلکہ یہ خالصتاً دنیاوی علم ہے اور دنیا میں انسان ایک دوسرے کا محتاج رہتا ہے۔ اس لئے معاشرے کے افراد مختلف کاموں کو آپس میں بانٹ لیتے ہیں۔ کوئی کھیتی باڑی کا کام اپنے ذمے لیتا ہے اور معاشرے کو غلہ فراہم کرتا ہے۔ کوئی کپڑا بنانے کی ذمہ داری لے لیتا ہے اور معاشرے کو لباس مہیا کرتا ہے۔ کوئی برتن بنانے کے کام کو اختیار

رہتا ہے اور معاشرے کو بہتری فراہم کرتا ہے۔ اس طرح کچھ لوگ اپنے لئے سائنیات کے میدان کا انتخاب کرتے ہیں اور طرح کی ذمہ داری ہوتی ہے (اس میں شک نہیں) کہ مختلف علوم کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کریں تاکہ معاشرہ ان علوم سے فائدہ اٹھائے جو ابھی اس کی دسترس میں نہیں ہوتے۔ فلسفے کے حوالے سے سب سے پہلے یونان کا تصور ذہن میں آتا ہے لیکن اس کی ابتدا چین سے ہوئی اور فلسفے کا قدیم ترسرمایہ چینی زبان میں ہی تھا۔ یونان والوں نے اس کا ترجمہ اپنی زبان میں کیا اور یونان کے جتنے بھی عظیم فلاسفہ کو ہم جانتے ہیں یہ سب کے سب ترجمے پڑھ کر ہی فلسفے کے مقامات بلند پر پہنچے تھے۔ پھر جب مسلمانوں کی حدود مملکت وسیع ہوئی اور وہ ان علوم سے متعارف ہوئے جو عرب میں ناپید تھے تو انہوں نے بھی مختلف زبانوں کے سرمایہ کو عربی زبان میں منتقل کرنا شروع کیا اور مامون رشید کے زمانے میں باقاعدہ ایک بیت ادارے کا قیام عمل میں لایا گیا جس کا کام ہی ترجمے کرنا اور مختلف علوم کو عربی میں منتقل کرنا تھا۔ مسلمانوں میں جتنے بھی بڑے بڑے فلاسفہ اور حکماء گزرے ہیں وہ انہی تراجم کو پڑھ کر اس مقام تک پہنچ پائے تھے۔

آج علم کیمیا پر اہل مغرب کا مکمل قبضہ ہے اور وہ بلاشرکت غیرے اس کے صاحب ہیں۔ لیکن سب جانتے ہیں کہ علم کیمیا کا موجد ایک عرب تھا جس کا نام جابر بن حیان تھا اور اس نے اپنی کتاب "الکیمیا" عربی زبان میں ہی لکھی تھی۔ اہل مغرب عربی زبان کی ابجد سے بھی واقف نہ تھے لیکن انہوں نے اپنی اپنی زبانوں میں "الکیمیا" کا ترجمہ

اور یہ تمام تحقیقی کام انھوں نے انہی ترجموں کی بنیاد پر کیا یہاں تک کہ وہ آج دنیا پر حکومت کر رہے ہیں جب کہ جو لوگ عربی زبان میں گلے گلے تک غرق ہیں وہ ابھی تک ہاتھ میں لوٹا اور بغل میں چٹائی لئے پھر رہے ہیں۔

قرآن مجید، کتب احادیث، کتب تاریخ اور دیگر اسلامی لٹریچر کو بھی دوسری [illegible] نے اپنی اپنی زبانوں میں ترجمے کئے ہیں اور انہی ترجموں کی بنیاد پر دنیا بھر میں تحقیقی کام ہو رہے ہیں۔ قرآن مجید کا ارشاد بھی یہی ہے کہ "وہ کتاب ہدایت کرتی ہے متقین کی (چاہے وہ کوئی بھی زبان بولتے ہوں) نہ کہ صرف عربی جاننے والوں کی ورنہ تو متقی بننے کے لئے عربی کا ماہر ہونا لازمی قرار پاتا اور تقویٰ صرف سرزمین عرب تک محدود ہو کر رہ جاتا جبکہ تقویٰ ایک قلبی کیفیت کا نام ہے نہ کہ زبان دانی کا۔ حقیقت یہ ہے کہ جو کتاب متقین کی ہدایت کرتی ہے وہ منافقین کو پہچانتی بھی ہے۔ اگر نہ پہچانتی تو ہدایت کیسے کرتی؟ چنانچہ مومن جب قرآن کھولتا ہے تو قرآن اپنے معنی اس پر کھول دیتا ہے چاہے وہ ترجمہ ہی کیوں نہ پڑھ رہا ہو اور جب منافق قرآن کھولتا ہے تو قرآن اپنے معنی اس سے چھپا لیتا ہے اور ایسے شخص کو سوائے صرف و نحوی قلابازیوں کے اور کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔

آپ نے کبھی نہیں دیکھا ہوگا کہ کسی فن کے ماہر نے کبھی معاشرے پر احسان جتایا ہو۔ آپ کبھی کسی کسان کو یہ کہتے ہوئے نہیں سنیں گے کہ "میاں اگر میں تمھیں غلہ فراہم نہ کرتا تو تم بھوکے مر جاتے"۔ نہ ہی کبھی کسی کپڑے کے تاجر نے یہ

بات کی کہ "بھائی صاحب! اگر میں تمہیں پڑھا لکھا نہ دیتا تو تم بدھو ہی پڑے رہتے"۔ مگر یہ مولوی کی قوم واحد قوم ہے جو بات بات پر احسان جتاتی ہے حالانکہ وہ کام معاوضے لے کر کرتے ہیں لیکن ان کا مقولہ یہ ہے کہ "کھائی سو کھائی مع ہے، منت احسانی"۔

یہ ایک ضمنی بات تھی جس کا تذکرہ کرنا ہم نے ضروری سمجھا اور اب ہم ان ذرائع کے بارے میں اپنے سلسلہ کلام کو آگے بڑھاتے ہیں جو حصول مراتب کے لئے اختیار کئے جاتے ہیں یعنی عقل، علم، معرفت، محبت۔

اگر دیکھا جائے تو ان چاروں میں بنیادی چیز محبت ہوتی ہے۔ محبت ہی وہ شے ہے جو محب کو مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنے محبوب کی زیادہ سے زیادہ معرفت حاصل کرے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ دنیاوی امور میں بھی جو کوئی کسی کا عاشق ہوتا ہے تو وہ صرف اس کے فن (Performance) تک ہی محدود نہیں رہنا چاہتا بلکہ اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کا متمنی رہتا ہے یہاں تک کہ اس کی نجی زندگی کے بارے میں بھی جاننے کا مشتاق ہوتا ہے اور یہ درحقیقت اس کی محبت کا تقاضا ہوتا ہے۔ پھر معرفت دین میں فطرت انسانی کیونکر بدل جائے گی؟۔ اور انسان جس سے محبت کرتا ہے اس کی معرفت کا کیونکر مشتاق نہ ہوگا؟۔ پس جو شخص لفظ معرفت سے چڑتا ہو اس کے دل میں اہل بیت کی محبت ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ یہ بات خلاف

فطرت ہے۔ اور یہیں سے سمجھئے کہ حصول مراتب اخروی کے لئے استعمال ذرائع کی ترتیب اس طرح ہوگی۔

۱۔ دل میں اہلبیت کی محبت پہلے سے موجود ہو۔

۲۔ محبت میں اضافے کے لئے معرفت حاصل کی جائے۔

۳۔ معرفت کے لئے علم حاصل کیا جائے۔

۴۔ علم حاصل کرنے کے لئے عقل سے مدد لی جائے۔

پس جان لینا چاہئے کہ عقل وہی ہے جو انسان کو علم کی ترغیب دے اور علم وہی ہے جس سے معرفت حاصل ہو اور معرفت وہی ہے جس سے محبت میں اضافہ ہو۔

جو کچھ خلق ہو چکا، جو کچھ تخلیق کے مراحل سے گذر رہا ہے اور جو کچھ آئندہ خلق ہوگا ان سب کی بنیاد محبت ہے۔ کمال تخلیق ہوا ہے، ہو رہا ہے اور ہوگا محبت کی طرف سے۔ محبت کے ذریعے۔ محبت کی طرف اور محبت کے لئے۔ لہذا جو شخص ذوق محبت سے نا آشنا ہے وہ نہ تو اپنے مقصد تخلیق کو جانتا ہے اور نہ اپنے خالق سے واقف ہے اور جب واقف ہی نہیں تو اپنا مقصد حیات کیونکر پورا کر سکتا ہے؟

یہ حقیقت وجود، اصل وجود، عین وجود اور سرچشمہ وجود علم خدا کے سربستہ رازوں میں پوشیدہ تھا۔ ہم مجبور ہیں کہ اتنا ہی کہیں کیونکہ علم خدا سے آگے دشت حیرت کا آغاز ہوتا ہے جہاں عقول کے بال و پر جلنے لگتے ہیں اور زبانیں

گنگ ہو جاتی ہیں۔ یہ ہماری مجبوری ہے۔ ہماری حد ہے۔ ہمارا نقص تخلیق ہے
ورنہ وہ سرچشمہ وجود کہاں پوشیدہ تھا۔ وہ خود جانتا ہے یا پھر وہ جانتا ہے جس نے
اسے اپنی ذات کی طرح چھپا کر رکھا ہوا تھا۔ یہ اصل وجود جمال ہی جمال تھا اور یہ
جمال ظاہر رہنا چاہتا ہے لیکن یہ کس طرح اس کے سامنے آئیں بلکہ اسکے سامنے جو جمال کی
پرکھ رکھتا ہو۔ اسکی باریکیوں کو سمجھتا ہو اور اسکے جلال و جمال کی برداشت رکھتا ہو۔ یہ نہ
ہو تو جلال جمال کی ایک ہلکی سی کرن کی بھی تاب نہ لا سکتا ہو اور صرف اسکے تصور سے
احساس سے ہی غش کھا کر گر پڑے۔ بلکہ ایسا ہو کہ دیکھے اور نظر کا ہر زاویہ دیکھے اور خود مشہود
اسکو یہ سند عطا فرمائے کہ "اس نے میرے جلوہ بے پناہ کی ایک جھلک ایسی میں
صورت دیکھی کہ نہ تو اسکی آنکھوں میں کجی ہوئی اور نہ اسکے دل نے جھٹلایا"۔

جمال کے اس پیچھے ہوئے سمندر میں حسن کی بجلیاں تڑپ رہی تھیں اور حسن چاہتا
ہے کہ کوئی اسے دیکھے اور اسکی تعریف کرے۔

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں

ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

چنانچہ اس طلب مشیت میں تحریک ہوئی۔ "كنت كنزاً مخفياً فأحببت أن
أعرف فخلقت الخلق" یعنی "میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا۔ مجھے محبت ہوئی کہ
میں پہچانا جاؤں تو میں نے ایک خلق کو خلق کیا"۔ اور یہ خلق چونکہ نقش اول تھی اور

تنہائے قرب سے وجود میں آئی تھی اس لئے حسن ہی حسن تھی۔ پیار حسن کو بہت د
بھی دیکھتا ہی رہ گیا۔ یہ دنیا تو محبوب ہی کی تصویر تھی۔

جس نے چاہا تھا کہ خود اس سے محبت کی جائے
خود وہی دام محبت میں گرفتار ہوا

پس سلسلۂ تخلیق کی اصل محرک اور بنیاد محبت تھی۔ جن لوگوں کا مقصد نفسوں سے کھیلنا ہے وہ فقط نظارے لیتے ہیں اور حقیقت مقصد کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ اگر توجہ کرتے تو ہر مذہب محبت کا مذہب ہوتا۔ ڈنڈے کا مذہب نہ ہوتا۔ اور وہ حقیقت تخلیق سے واقف ہوتے تو جانتے کہ عمل کی بنیاد محبت ہوتی ہے نہ کہ شریعت۔ شریعت بذات خود مقصد نہیں ہے بلکہ اس کا کام فقط لوگوں کو ڈسپلن کرنا ہوتا ہے۔ جیسے فٹبال کے میدان میں جو حدود بنی ہوتی ہیں اور قوانین کھیل کے بنے ہوتے ہیں ان کا مقصد کھلاڑیوں کو ڈسپلن کا پابند بنانا ہوتا ہے لیکن کھلاڑی ان حدود و قیود کے لئے نہیں کھیلتا بلکہ ایک جذبے کے تحت کھیلتا ہے اور وہ جذبہ ہوتا ہے "کھیل سے محبت"۔ آپ اگر غور کریں تو فوراً محسوس فرمائیں گے کہ دنیا کا ہر کام محبت کے تحت کیا جاتا ہے۔ ملازمت۔ تجارت اور زراعت کی جاتی ہے پیسے کی محبت میں۔ شادی کی جاتی ہے عورت اور اولاد کی محبت میں۔ سیاست کی جاتی ہے اقتدار اور شہرت کی محبت میں۔ جب ہر شے کی روح محبت ہے تو دین و مذہب کو محبت سے مستثنیٰ کیونکر کیا جا سکتا ہے؟ بلکہ دین و محبت کو تو ہر کام پر فوقیت و اولیت حاصل ہے لہٰذا یہاں تو انتہائی حالت محبت کا وجود لازمی ہے۔ اور پیار ہے

بھی۔ دین تو ابتدا سے آخر انتہا تک محبت ہی محبت ہے۔ اور دیکھا جائے تو دنیا میں لاتعداد ادیان پھیلے ہوئے ہیں لیکن اگر سوچا جائے تو صرف دو ہی دین ہیں۔ ایک علی کی محبت کا دین اور دوسرا علی کی دشمنی کا دین۔ انسان پر لیبل چاہے کوئی بھی لگا ہو مگر وہ ان دو میں سے کسی ایک کیمپ میں ضرور ہوتا ہے۔ خود مسلمانوں کے بارے میں حضرت ختمی مرتبت کا جو ارشاد ہے کہ ان میں تہتر ۷۳ فرقے ہوں گے جن میں سے بہتر ۷۲ جہنم میں جائیں گے اور ایک جنت میں تو وہ ایک فرقہ جو جنت میں جائے گا وہ وہی ہو گا جو علی سے محبت کرتا ہو گا اور باقی بہتر ۷۲ فرقے وہ ہوں گے جو علی سے دشمنی رکھتے ہوں گے اور جنتی ہونے کے لئے علی سے محبت کا لازم ہونا احادیث سے بتواتر ثابت ہے۔ یہ بات طے ہے کہ نجات وہی پائے گا جو اس سے محبت کرتا ہو اور غرق وہی ہو گا جو اللہ سے دشمنی رکھتا ہو۔ اب اللہ کی دوستی اور دشمنی کا مطلب کیا ہے یہ ہم مدینۃ المعاجز (اردو) جلد ۱ صفحہ ۲۶۸ سے آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں جس میں آنحضرت فرماتے ہیں کہ مجھ سے اللہ نے فرمایا "اے محمدؐ! میں نے اپنی ذات کی قسم کھا کر یہ فیصلہ کیا ہے کہ میں علی کی محبت کی طرف اس کے دل میں الہام کروں گا جو میرا پیارا ہو گا چنانچہ میں جس سے محبت کرتا ہوں اس کے دل میں علی کی محبت ڈال دیتا ہوں اور جس سے بغض رکھتا ہوں اس کے دل میں علی کی دشمنی ڈال دیتا ہوں"۔

جب نجات و ہلاکت کا معیار علی کی محبت اور دشمنی ٹھہرا۔ مجھے حیرت ہوتی ہے ان لوگوں پر جو اس خوش فہمی میں رہتے ہیں کہ محض نیک اعمال بخشوا دیں گے۔ آپ یقین کریں

پسند کریں مگر حقیقت یہی ہے کہ یہ مذہب وہی ہے جو شیطان کا مذہب تھا۔ یعنی اپنے اعمال و عبادت پر گھمنڈ کرنے والی پہلی شخصیت شیطان کی ہی تھی۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ اس ملعون نے ایک سجدہ چار ہزار سال طویل کیا تھا؟ مؤلف موصوف حاصل یہ کہ یہ ایسا سجدہ تھا کہ چار ہزار سال کے اس طویل عرصے میں اکا دکا بھی ٹھہرا ہی نہیں۔ جس کے ایک سجدے کا یہ عالم ہو تو باقی عبادات کا کیا حال ہوگا؟ مگر یہ سارے اعمال و عبادات دھرے کے دھرے رہ گئے اور صرف ایک سجدہ نہ کرنے کی پاداش میں راندہ درگاہ اور ملعون قرار دیا گیا جبکہ آدم نے ابھی کوئی عمل نہیں کیا تھا اس کے باوجود انہیں تمام عالم ملکوت سے سجدہ کرایا گیا۔ جو لوگ شیطان کی طرح اپنے اعمال کو سبب نجات سمجھتے ہیں وہ حقیقتاً حضرت امیر المومنین کی شدید توہین اور ان کی منزلت میں تنقیص کرتے ہیں۔ شیعہ سنی کتب اس حدیث سے بھری پڑی ہیں جس میں رسول اللہ فرماتے ہیں۔ "یا علی انت قسیم النار و الجنة" یعنی اے علی تم جنت اور جہنم کے تقسیم کرنے والے ہو۔ اب اگر علی انسان کو بخشوا نہیں سکے تو "قسیم النار والجنة" اعمال ہوئے نہ کہ علی۔ یہ بے خبر لوگ مولویوں کے پیچھے آنکھ بند کرکے بھاگ رہے ہیں اور انکو یہ تک معلوم نہیں کہ علی "قسیم النار والجنة" ہیں تو کیونکر؟ اور تقسیم جنت و نار کا مطلب یہی ہے کہ اچھے عمل والوں کو جنت میں بھیج دو اور برے اعمال والوں کو جہنم میں تو یہ کام تو چند فرشتے بھی

کر سکتے ہیں۔ اس میں علی کی کیا خصوصیت ہے؟ تقسیم جنت و جہنم کا یہ مطلب ہے جانے دیجئے۔ بحث دریا برد کیجئے۔ خود حضرت امیر المومنین "قسیم النار والجنۃ" کا مفہوم بتاتے ہوئے فرماتے ہیں۔ "میں جہنم کے دروازے پر کھڑا ہوں گا اور اس سے کہوں گا کہ اسے پکڑ لے یہ میرا دشمن تھا اور اسے چھوڑ دے یہ میرا دوست اور محب تھا" جو شخص اس بات پر یقین نہیں رکھتا وہ علی کا بھی مجرم ہے اور رسول کا بھی۔ اس کتاب سے ہمارا مقصد یہی ہے کہ ہم شیعوں کو یاد دلائیں کہ مذہب شیعہ کس چیز کا نام ہے اور لفظ شیعہ کا اطلاق کس پر ہوتا ہے اور اس دنیا میں شیعوں کے فرائض کیا ہیں۔ مگر جو لوگ شریعت کی زبان ہی سمجھتے ہیں تو ہم اس زبان میں بھی بات کرنے کو تیار ہیں۔ وہ لوگ جان لیں کہ ولایت علی کی تلوار ہر گردن پر لٹک رہی ہے جس سے وہ بھاگ نہیں سکتے۔ خدا ہی لوگوں کو بخوبی جانتا ہے اس لئے اس نے شروع سے فرائض کی تمام رخصتیں عطا کر دی ہیں۔ ہم صحیفۃ المعانی (اردو) جلد ۱ صفحہ ۳۲۸ اور ۳۲۹ سے یہ حدیث پیش کرتے ہیں تاکہ ان شیعان علی کی تسلی ہو جائے۔

رسول اللہ نے فرمایا کہ اللہ نے فرمایا۔ "میں نے نماز فرض کی ہے لیکن سفر میں اسے قصر کیا ہے (یعنی آدھی نماز معاف کر دی ہے)۔ میں نے روزہ فرض کیا ہے اور مسافر لوگوں میں چھوٹ دی ہے۔ میں نے حج فرض کیا ہے لیکن جسے استطاعت حاصل نہ ہو اس پر حج معاف کر دیا ہے۔ میں نے زکوٰۃ فرض کی ہے لیکن مفلس کو معاف کیا

ہے۔ میں نے علی ابن ابی طالب کی محبت کو بلند آسمان و زمین پر فرض کیا ہے اور اس میں کسی کو کسی طرح کی رعایت نہیں دی ہے"۔

یہ حدیث میں نے ان لوگوں کے لئے بیان کی ہے جو صرف ذکر علی کرتے ہوتے ہیں اور فرض عملی سے غافل بلکہ متنفر ہیں اور نہ صرف عمل کا ہی ان لوگوں سے زیادہ معترف ہوں لیکن بت پرستی کی حمایت میں کسی صورت نہیں رکھتے اور میرا یہاں ہے کہ حقیقی اور مقبول بارگاہ خداوندی وہی عمل ہے جو علی کی محبت میں سرشار ہو کر کیا جائے کیونکہ بندوں سے عمل کروانے سے بھی مقصود مطلوب خدا ہے کہ لوگوں میں اس کی محبت کو پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ سورہ ابراہیم کی ایک آیت میں حضرت ابراہیم کی وہ دعا نقل کی گئی ہے جو انہوں نے اس وقت کی تھی جبکہ وہ حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیل کو مکہ کے قریب غیر آباد علاقے میں تنہا چھوڑ کر جا رہے تھے۔ حضرت ابراہیم نے دعا کی کہ "اے پروردگار ان آدمیوں میں سے بعض کے دل ان کی طرف مائل اور پیوستہ کردے"۔ اس آیت کی تفسیر میں امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں۔ "ابراہیم نے خانہ کعبہ کی طرف نہیں بلکہ اپنی اولاد کی طرف لوگوں کے دل موڑنے کو کہا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ خدا نے ان پتھروں کے پاس آنا ان پر فرض کیا ہے۔ لیکن اہل بیت کی محبت رکھنے کا ان سے سوال ہوگا۔ خدا کی قسم اللہ نے ہماری محبت کے سوا اور کچھ فرض نہیں کیا"۔ (تفسیر فرات صفحہ ۱۰۵)

اس سے زیادہ وضاحت اس تفصیل میں پیش نہیں کر سکتا۔ انصاف پسند حضرات میری بات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ میرا معروضہ یہ ہے کہ عمل یقیناً انسان کو فائدہ پہنچائے گا مگر ہر عمل نہیں بلکہ صرف وہ عمل جسے اللہ قبول کرلے۔ اب "عمل عمل" کی پکار مچانے والے یہ بتائیں کہ ان کے پاس کوئی گارنٹی ہے کہ ان کے اعمال قبول ہو رہے ہیں؟۔ اللہ نے ہمیں کسی ذریعے سے یہ بتا دیے جانے کا حکم تو نہیں دیا۔ لہٰذا وہی عمل کارآمد ہو سکتا ہے جس کی بنیاد محبت اہلبیت ہو چاہے وہ کتنا ہی قلیل کیوں نہ ہو اور وہ عمل برباد ہے جس کا تعلق محبت اہلبیت سے نہ ہو چاہے وہ کتنا ہی زیادہ کیوں نہ ہو۔ اسی لئے حضرت امیر المومنین نے فرمایا ہے: "کثرت عمل کی بجائے قبولیت عمل کی فکر کرو کیونکہ اللہ جس سے محبت کرتا ہے اس کے قلیل عمل کو بھی قبول فرماتا ہے اور کیونکر قلیل ہو سکتا ہے وہ عمل جسے اللہ قبول کرلے"۔ اسی طرح التوحید صفحہ ۱۹ حدیث ۲ میں امام جعفر صادق فرماتے ہیں۔

"تم ایسے تھوڑے سے عمل کرو اور زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرو"۔

حقیقتاً محبت و معرفت اہلبیت ہی وہ مرکز ہے جس کے گرد یہ پوری کتاب گردش کر رہی ہے۔ ہم نے اپنی کم فہمی اور بے حالی کے باوجود ایک ایسی وادی میں قدم رکھا ہے جہاں ہم جیسی ہستیوں سے پہاڑوں کو ریزہ ریزہ ہوتے دیکھ رہے ہیں۔ جہاں کثرت عبادت خود باب نظر بنا ہوا ہے۔ جہاں ایک طرف سے "اللہ" کی آواز حق

ہے تو اس کی بازگشت "علی! علی! علی!" کی صورت میں گونجتی ہے۔ جہاں آنکھیں دیکھتی ہیں مگر نہیں دیکھتیں۔ کان سنتے ہیں مگر نہیں سنتے۔ ہاتھ حرکت کرتے ہیں مگر گرفت نہیں کرتے۔ پاؤں چلتے ہیں مگر فاصلے طے نہیں کرتے۔ فقط ایک شے ہے جو بحال رہتی ہے اور وہ ہے محبت علی اور وہ بھی اس شدت کے ساتھ کہ دل پہلے سے زیادہ مضبوط ہو۔ جیسے مومن ہو اور مقبول پختہ کار ہو۔ ایسے مقام پر ٹھہرے ہو کر بات کرنا کتنا مشکل کام ہے، اس کا اندازہ آپ بخوبی لگا سکتے ہیں۔ اصل دشواری یہ ہے کہ میرے قارئین میں ہر طرح کی ذہنی سطح کے لوگ شامل ہیں بلکہ معترضین و منکرین کے ہاتھوں میں بھی یہ کتاب جائے گی اور یہیں سے میری مشکل کا آغاز ہوتا ہے کیونکہ میرے مولا نے فرمایا ہے۔ "جاہل جو بات نہیں جانتا اس سے نہیں کہا کر کیونکہ وہ تیری تکذیب کرے گا۔ تیرا علم تیرے لئے حق ہے اور تیرا حق تجھ پر یہ ہے کہ علم کو مستحق تک پہنچائے اور غیر مستحق سے باز رکھ"۔ (نہج الاسرار صفحہ [illegible])

تفسیر فرات صفحہ ۲۵ پر امام جعفر صادق فرماتے ہیں۔ "ہم لوگوں سے کئی قسم کی احادیث بیان کرتے ہیں۔ ہماری بعض احادیث وہ ہیں جنکو ہم بلا خوف و خطر منبر پر بیان کرتے ہیں جو ہمارے لئے زینت اور ہمارے دشمنوں کے لئے رسوائی کا باعث ہیں۔ بعض احادیث وہ ہیں جو ہم صرف اپنے شیعوں سے بیان کرتے ہیں اور پھر وہ جن کی وہ تصدیق کرتے ہیں۔ بعض احادیث وہ ہیں جو صرف ایک یا دو آدمیوں سے بیان

کرتے ہیں۔ اور ایسی حدیث جن آدمیوں سے بیان کی جائے تو وہ بیکار ہو جاتی ہے۔ یہ حدیث ہماری وہ ہے جس کو ہم صرف محفوظ قلعوں۔ امین دلوں۔ فہم رسا اور عقول سنجیدہ کے سپرد کرتے ہیں۔ ایسے لوگ حدیث کے ظروف۔ تبیین۔ ثبوت دینے والے۔ حفاظت کرنے والے اور خزینہ بن جاتے ہیں"۔

اسی صورت حال میں معرفت کے موضوع پر ایسے اسلوب سے لکھنا کہ وہ تمام طبقات کے لئے قابل قبول بن جائے اگر ناممکن نہیں تو انتہائی مشکل ضرور ہے۔ اسی لئے اگرچہ حقائق معرفت کا موجیں مارتا ہوا سمندر دل کو تہ و بالا کر رہا ہے پھر بھی ہم نے اپنی سی بھرپور کوشش کی ہے کہ خود کو محدود رکھیں کیوں کہ ہمارے یہاں منقول کو چھوڑنے اور ان سے کھیلنے۔ ان پر اعتراضات کرنے اور فتوے لگانے کا رواج عام ہے اور معنی کی گہرائیوں میں اتر کر حقائق کے آبدار موتی لانے کو معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اس مصیبت سے محفوظ رہنے کے لئے ہم اپنے مقصد اعلیٰ کی طرف آہستہ آہستہ۔ درجہ بدرجہ اور قدم بقدم چلے ہیں تاکہ ہمارے قارئین ہر مرحلے پر ہمارے ساتھ ساتھ رہیں اور اچانک کوئی بات ایسی نہ آجائے جہاں وہ معطل ہو کر رہ جائیں۔ اسی لئے ہم نے اپنے موقف کے اثبات کے لئے قرآن و احادیث کے علاوہ دعاؤں اور زیارات پر بھی کتاب "مفاتیح الجنان" سے خصوصی استفادہ کیا ہے کیونکہ یہ وہ کتاب ہے جو ہر شیعہ گھر میں پائی جاتی ہے اور جس کو خیر و برکت اور حصول ثواب کا سرچشمہ سمجھا جاتا ہے اور اس طرح ہم نے معترضین کا منہ پہلے ہی مرحلے میں بند کر دیا ہے۔

ادعیہ وزیارات کی حقیقت

دعا کرنا اور اپنے محبوب سے ملاقات کی خواہش رکھنا انسانی فطرت کا تقاضا ہے لیکن ان دونوں چیزوں کے لیے کچھ آداب ضروری ہیں۔ معلمین اخلاق یعنی ائمہ معصومین نے جہاں دیگر مکارم اخلاق کی تعلیم دی ہیں دعا کرنے اور زیارت کرنے کے آداب بھی ہمیں سکھائے تا کہ دعاؤں اور زیارات کو شرف قبولیت مل سکے لیکن مفاد پرستوں نے ان دعاؤں اور زیارات کو ایک "دھندا" سمجھا اور وہ انھیں منتر جنتر کی طرح پڑھنے لگے درحقیقت وہ انکی حقیقت سے بے خبر تھے۔

ائمہ طاہرین اپنی معرفت کرانے اور اپنے ذریعے اللہ کی معرفت کرانے کے لئے آئے تھے لیکن انکا زمانہ اس قدر تقیہ اور بحران کا تھا کہ انکے لئے علانیہ طور پر اپنے فضائل بیان کرنا انتہائی مشکل تھا۔ اس لئے انھوں نے صرف ادبیت سے کام لیتے ہوئے دعاؤں اور زیارات کے کوزے میں محبت ومعرفت کے ایک ایسے سمندر کو بند کردیا کہ اگر انسان کی صرف نظر توجہ کرلے تو سمجھ سکتے ہیں وہ یہ دونوں مستور جاتیں۔ جب آپ یہ کتاب پڑھیں گے تو آپ کو ہماری صداقت کا ضرور یقین آجائے گا۔

شیعہ

نہج البلاغہ صفحہ ۱۸۰ پر حضرت امیر المومنین فرماتے ہیں۔ "کوئی شخص کسی مقام کا

مستحق نہیں ہو سکتا جب تک وہ اس مقام کے مراتب کو نہ جانے"۔

جناب کے اس ارشاد کی رو سے وہ شخص شیعہ کہلائے جانے کا مستحق نہیں ہے جسے مقامات و مراتب شیعہ کا علم نہ ہو۔ لہذا ضروری ہے کہ خود کو شیعہ کہنے سے قبل اس بات پر غور کیا جائے کہ شیعہ ہوتا کیا ہے۔

سب سے پہلے ہم اس لفظ کے لغوی معنی پر نظر کرتے ہیں اس کے بعد اس کی حقیقی معنویت پر گفتگو کریں گے۔ آپ کوئی بھی لغت اٹھا کر دیکھیں چاہے وہ عربی ہو، فارسی ہو یا اردو۔ اس میں لفظ شیعہ کے متعدد معنی تو کئی ملیں گے لیکن اس لفظ کے خصوصی معنی جو لغت میں لکھے گئے ہیں وہ ہیں۔ "حضرت علی کے حمایتی" ہمیں سوچنا چاہیے کہ کیا ہم واقعی علی کے حمایتی ہیں؟۔

۱۔ کیا ہم علی کے قول کو دوسرے کے قول پر ترجیح دیتے ہیں؟۔

۲۔ کیا ہم کسی ایسے شخص کی حمایت تو نہیں کرتے جو علی کے حکم کے خلاف حکم کرتا ہو؟۔

۳۔ کیا ہم کسی ایسے شخص کی حمایت تو نہیں کرتے جو علی کی برابری کا دعویٰ کرتا ہو؟۔

۴۔ کیا ہم کسی ایسے شخص کی حمایت تو نہیں کرتے جو علی کے خطابات و القاب کو اپنے لیے استعمال کرتا ہو؟۔

۵۔ کیا ہم کوئی عمل کرنے سے پہلے یہ تلاش کرتے ہیں کہ اس مسئلے میں علی کا حکم کیا ہے؟۔ اور کہیں علی کا حکم تلاش کرنے کی بجائے ہم یہ تو تلاش نہیں کرتے کہ فلاں شخص کا فتویٰ کیا ہے؟۔

۶۔ کیا ہم علی کے فضائل میں شک تو نہیں کرتے؟ کیا ایسے ویسے تو نہیں کہتے؟ کیا ہمیں علم ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا ہے۔ ''علی کے متعلق شک کرنا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرنا ہے''۔ (مدینۃ المعاجز صفحہ ۳۵۹) نیز آنحضرت نے یہ بھی فرمایا ہے۔ ''جو خدا کی نافرمانی کرے گا علی کی ولایت کے بارے میں وہ جہنم کی آگ میں ہمیشہ رہے گا''۔ (تفسیر فرات صفحہ ۳۵۹)

۷۔ کیا ہم کسی ایسے خطیب کو وقت تو نہیں دیا کرتے جو فضائل علی کا بائیکاٹ کرتا ہو؟ اور کیا ہم کسی ایسی محفل میں شرکت تو نہیں کرتے جس میں فضائل علی بیان نہ کیے جاتے ہوں؟ جبکہ رسول اللہ نے واضح طور پر حکم دیا ہے کہ ''زینوا مجالسکم بذکر علی ابن ابی طالب''۔ اپنی مجالس کو علی کے ذکر سے زینت دیا کرو۔

جب ان سوالات کے تسلی بخش جوابات مل جائیں تب کسی کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ خود کو لفظ شیعہ سے موسوم کر سکے۔

دوسری بات

ہر مذہب کی پہچان اس کے کلمے سے ہوتی ہے اور مذہب شیعہ کی پہچان کلمہ ''علی ولی اللہ'' ہے جس کی دلیل یہ ہے کہ کسی مسجد سے اذان میں علی ولی اللہ کی آواز آتی ہو تو اس اذان کو سن کر ہی لوگ سمجھ لیتے ہیں کہ یہ شیعوں کی مسجد ہے۔ اگر یہ کلمہ ہٹا دیا جائے تو مذہب شیعہ اور دیگر مذاہب میں کوئی فرق ہی باقی نہ رہے۔ لہٰذا اس شخص کا کلمہ صرف

"لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ" پڑھ کر لفظ مسلمان کا اطلاق تو ہوتا ہے مگر لفظ "شیعہ" سے اسکا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ جیسا کہ رسول اللہ نے فرمایا۔ "علی وہ کلمہ ہے جس کو متقین نے لازم باندھ دیا ہے"۔ (تفسیر فرات صفحہ ۲۱۰)۔ پہلے تو انسان کو متقی بننا پڑتا ہے تا کہ وہ بیعت پا سکے۔ شیعہ بننا تو بعد کی بات ہے۔ شیعہ تو بیعت پانے کے بعد بنتا ہے۔ جب انسان متقی ہی نہ ہو تو وہ اپنے لئے لفظ شیعہ کیونکر استعمال کرتا ہے؟۔ اسی سے مفاتیح الجنان صفحہ ۹۹ پر یہ دعا منقول ہے کہ "پروردگارا ہمیں محشور فرما ان لوگوں میں جنہوں نے لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ علی ولی اللہ پڑھا"۔ کتنی عجیب بات ہے کہ محمد کی شہادت اور ولایت علی کی مخالفت کی جائے اور دعا یہ کی جائے کہ ہمیں یہ شہادت دینے والوں کے ساتھ محشور فرما۔ یہ تو اللہ سے بدترین مذاق بازی و تمسخر و توہین کرنا ہے۔

محبت کا مذہب

مذہب شیعہ محبت کا مذہب ہے۔ اسکا اوّل و آخر محبت ہے اور ظاہر و باطن محبت ہے۔ خالص محبت۔ عقل کا کام معرفت کرنا ہے اور معرفت کا کام محبت کرنا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ اگر کسی دور دراز علاقے میں کوئی بہت بڑا عالم مر جائے تو یہ خبر سن کر آدمی کو افسوس تو ہوتا ہے مگر بالکل واجبی۔ اسکے برخلاف اگر اسکا پڑوسی مر جائے تو اسکو بہت افسوس ہوتا ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ وہ اس عالم کی معرفت نہیں رکھتا لیکن اپنے

بڑی ہی معرفت رکھتا ہے۔ اس لئے معرفت سے وہی لوگ بچتے ہیں جو محبت سے فراری ہوتے ہیں۔ معرفت سے لوگوں کو بچائے رکھنے کا آسان ترین طریقہ یہ ہے کہ جو بھی علی کی کوئی فضیلت بیان کرے تو فوراً اس پر شیعہ ہونے کا فتویٰ لگا دیا جائے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ابتداء سے یہی ہوتا آیا ہے۔ منافقین کا رویہ ہمیشہ یہی رہا ہے چنانچہ مودۃ المطالب ج ۱ صفحہ ۵۰۳ پر ابن عباس سے روایت ہے کہ آیت "ان الذین یؤذون اللہ و رسولہ (جو لوگ خدا اور اسکے رسول کو اذیت دیتے ہیں) اس وقت نازل ہوئی جب منافقین نے کہا کہ حضرت محمدؐ ہم سے یہ چاہتے ہیں کہ ہم زبردستی اہلبیت رسول کی پوجا کریں"۔

مذہب شیعہ کی تو بنیاد ہی یہ عقیدہ ہے کہ علی کی مدح کرنا مخلوق کی طاقت سے باہر ہے کیونکہ مخلوق اپنے خالق کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ لہٰذا کوئی بھی ہو بہر حال مخلوق ہے اس سے جو الفاظ کی گرفت میں آجائے وہ علی نہیں ہوسکتا جیسا کہ آنجناب نے خود فرمایا ہے۔ "ہم کو ربوبیت سے پاک رکھو (یعنی رب یعنی خدا مت بناؤ) اور صفات بشریہ سے بلند رکھو پھر ان صفات سے جو تمہارے لئے جائز ہیں۔ پس ہم میں سے کسی ایک پر بھی لوگوں کے سے قیاس نہیں کیا جاسکتا کیونکہ بتحقیق ہم اسرار الٰہیہ ہیں جو ہیاکل بشریہ میں ودیعت کئے گئے ہیں اور خاکی اجساد میں ہم پروردگار کے کلمات ناطق ہیں۔ جتنی تمہاری استطاعت ہو ہماری فضیلت میں بیان کرو۔ پس بتحقیق کہ ہم سمندر رشد

نہیں ہوتا۔ غیب کے اسرار پہچانے نہیں جاسکتے اور خدا کے کلمات کی توصیف نہیں کی جاسکتی"۔ (نہج الاسرار صفحہ ۵۰)۔

علی کے معنی ہیں بلند اس لئے علی سے محبت وہی کرتا ہے جس کی نگاہیں بلندیوں کی سیر کرتی ہوں اور آسمانوں کو چھوتی ہوئی عرش معلیٰ سے ملاقی ہوں۔ جس کی نظریں پاتال میں گڑی ہوں اسکو سوائے نیچے کے علاقوں کے اور کچھ نظر ہی نہیں آئے گا۔ وہ کیسے جان سکتا ہے کہ علی کون ہے۔

کیا پوچھتے ہو کہ علی کون ہے کیا ہے
سمجھو تو وہ بندہ ہے نہ سمجھو تو خدا ہے

علی کی محبت "لا الٰہ الا اللہ" کی مانند ہے کہ جیسے ہی غیر کا تصور دخل ہو ویسے ہی علی کی محبت کے سارے جلوے نابود ہو جاتے ہیں۔ علی خالص محبت کا خریدار ہے۔ یہاں کھوٹ کا کوئی کام نہیں جیسا کہ تفسیر فرات صفحہ ۳۹ پر حضرت امیرالمومنین فرماتے ہیں۔ "جس کے دل میں غیر کی محبت ہے وہ ہمارا قاتل ہے"۔ اب یہ جاننا ضروری ہوگیا کہ یہ "غیر" کون ہے؟۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ بال کس طرف پھینکا جائے گا لیکن پہلی صورت سمجھ لیجئے کہ اس "غیر" کی زد میں وہ شخص آئے گا جو علی کی طرف سے لوگوں کی توجہ ہٹا کر خود کو بڑا جتانا چاہتا ہو۔ جس کی محبت علی کی طرف سے غافل کرتی ہو۔ جس کی صحبت علی کی اطاعت کی طرف سے برگشتہ کرتی ہو۔ جس کی اہمیت علی کی

ولایت کی قائم مقام بنانا چاہتی ہو۔ مذہب شیعہ ان تمام خرافات سے پاک ہے۔ ہم دلیل کے طور پر مفاتیح الجنان صفحہ ۱۰۴ پر درج زیارت امیر المومنین کا ایک جملہ آپ کی خدمت میں ہدیہ کرتے ہیں۔

"اے مولا آپ پر اللہ کی درود، جو آپ سے منہ موڑ کر چلے وہ تباہ ہو جاتا ہے۔ میں <u>آپ کے سوا کسی کا طالب نہیں ہوں اور آپ کے علاوہ کسی کو اپنا ولی نہیں بناتا</u>۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ کی ولایت کے ذریعے اعمال قبول ہوتے ہیں (کیا نماز عمل نہیں ہے؟ پھر بغیر ولایت کے نماز کیسے قبول ہو جائے گی؟) جو آپ کی ولایت سے برگشتہ ہو اور آپ کی معرفت نہ رکھتا ہو اور آپ کی جگہ کسی اور کو مانتا ہو تو خدا اسے منہ کے بل آگ میں ڈالے گا اور اس کے اعمال قبول نہیں کرے گا"۔ اسی مفاتیح الجنان کے صفحہ ۴۴۰ پر زیارت امام زمانہ کا ایک جملہ یہ ہے۔ "سلام ہو آپ پر اے حق جدید۔ محی مومنین و مولی امر ہے"۔ پس مذہب شیعہ ان ذوات مقدسہ کے علاوہ کسی اور کو ولی امر تسلیم کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا اور جس کسی کو خدا کے علاوہ کسی اور کو ولی بنانے اور ماننے کا شوق ہو وہ کسی اور مذہب کی پناہ لے کیونکہ مذہب شیعہ میں ایسا ماحول اسے میسر نہیں آئے گا۔ مذہب شیعہ کا مرکز تو صرف اور صرف علی ہے کیونکہ صرف وہی ہے جو نقطہ بائے بسم اللہ ہے۔ پوری کائنات ان کے گرد گردش کرتی ہے۔ ہر چرند و پرند و درند غرض کائنات کا ایک ایک ذرہ ان کے نام کی مالا جپتا ہے۔ ہوائیں ان کی ثنا کرتی گنگناتی ہیں۔ دریا کی لہریں ان کے گیت گنگناتی ہیں۔ بادلوں کی جھرمٹ اور

نبیوں کی طرح ان کا فرمان امر و نہی پر مشتمل ہیں اور تمرد عصیان۔ طغیان۔ یہ باب دروازے حق کے غضب کا اعلان کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ملائکہ مقربین جنھیں پیدا ہی عبادت کے لئے کیا گیا ہے ان کے نام کی تسبیح پڑھتے ہیں اور یہی علی عبادت ہوتی ہے۔ کنج الاسرار صفحہ ۵۸ پر انہی حضرت کا فرمان موجود ہے "بہ تحقیق کہ میری ولایت اہل آسمان پر اسی طرح لازم کی گئی ہے جیسا کہ اہل زمین پر اور فرشتے ملائکہ میری فضیلت کا ذکر کرتے رہتے ہیں اور اللہ کے نزدیک یہی ان کی تسبیح ہے"۔

علی اور اللہ میں فرق کرنا ہی اصل شرک ہے یہی وجہ ہے علی کی اطاعت کو اللہ نے اپنی اطاعت پر مقدم کیا ہے چنانچہ کوکب دری صفحہ ۲۴۳ پر حضرت نبی مرتبت کا یہ فرمان محفوظ ہے کہ اللہ نے مجھ سے ارشاد فرمایا۔ "جس نے مرتضیٰ کا حق پہچانا وہ پاک اور خوش ہوا اور جس نے اس کے حق کا انکار کیا وہ ملعون اور زیاں کار ہوا۔ میں اپنی عزت کی قسم کھاتا ہوں کہ جو شخص علی کی نافرمانی کرے گا اسے دوزخ میں داخل کروں گا اگرچہ وہ میری اطاعت کرے۔ اور جو شخص علی کی فرمانبرداری اور اطاعت کرے گا اسے بہشت بریں میں داخل کروں گا اگرچہ وہ میری نافرمانی کرے"۔ علی کی محبت حقیقت ایمان بھی ہے اور حقیقت عمل بھی۔ ہم تفسیر فرات صفحہ ۳۰۹ سے ایک حدیث پیش کرتے ہیں تاکہ محبت کی قوت کا اندازہ کیا جا سکے۔

"ایک شخص رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا۔ "یا رسول اللہ میں روزہ داروں کو دوست رکھتا ہوں لیکن روزہ نہیں رکھتا۔ نمازیوں کو دوست رکھتا ہوں مگر خود نماز

نہیں رکھ سکتا۔ صدقہ دینے والوں کو دوست رکھتا ہوں مگر خود صدقہ نہیں دیتا"۔ رسول اللہ نے فرمایا۔ "تو اسی شخص کے ساتھ ہوگا جس سے تو محبت کرتا ہے"۔ اس نے حضرت شیخ مرتضیٰ نے فرمایا ہے۔ "علیؑ کی محبت ایسی نیکی ہے کہ اس نیکی کے ہوتے ہوئے کوئی بدی نقصان نہیں پہنچاتی اور علیؑ کی دشمنی ایسا گناہ ہے کہ اس گناہ کے ہوتے ہوئے کوئی نیکی فائدہ نہیں دیتی"۔ (کوکب دری صفحہ ۱۲)۔

جنت علیؑ کے دوستوں کی ہی مشتاق ہے اور جہنم علیؑ کے دشمنوں سے ہی شدید عداوت رکھتا ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ نے فرمایا۔ "اے ابن عباس! اس ذات کی قسم جس نے مجھے نبی برحق بنایا ہے۔ دوزخ کو دشمن علیؑ سے جتنی عداوت ہے ان سے بھی نہیں جو خدا کے لئے بیٹے کا عقیدہ رکھتے ہیں"۔ (تفسیر فرات)

ہم علیؑ والے ہیں

ہمارے فخر کرنے کے لئے یہی کافی ہے کہ ہم علیؑ والے ہیں۔ نقلی و عقلی طور پر شیعہ کتب کی رو سے ہیں جو علی والا ہے اور علی والا کون ہوتا ہے اس کی چند تفصیلات ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں۔

تفسیر فرات صفحہ ۳۵۔۳۶

رسول اللہ نے حضرت امیر المومنین سے فرمایا "اے ابوالحسن تمہیں مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ روز قیامت تمہیں سفید اونٹنیوں پر سوار کرے گا جنہیں اللہ کا جلال خالق نور کی

ہوگی۔ وہ نکلی تمہارے پاس جا کر بیٹھ جائیں گی۔ ان سے کہا جائے گا کہ اے ولی اللہ ان پر سوار ہو جاؤ۔ علی تمہارا سید سالار ہو۔ تم ان کے امام ہو گے۔ انکو جنت کی طرف لے جاؤ گے۔ ایک ہوا جاری ہوگی جو ان کے چہروں پر مشک خالص کی بارش کرے گی۔ وہ لوگ کہیں گے کہ "ہم تو علی والے ہیں" تو ان سے کہا جائے گا کہ اگر تم علی والے ہو تو آج تم پر کوئی خوف اور حزن نہیں ہے"۔

تفسیر فرات کے صفحہ ۳۵۱ پر زید بن علی سے روایت ہے کہ قیامت کے روز ایک منادی ندا دے گا: "وہ لوگ کہاں ہیں جنہیں فرشتوں نے پاک حالت میں قبض کیا؟" وہ کہیں گے: "ہم امیر المؤمنین کو دوست رکھنے والے ہیں"۔ تو ان سے کہا جائے گا: "اپنے عمل کی وجہ سے تم جنت میں چلے جاؤ"۔ (یہاں سے ثابت ہوتا ہے کہ حقیقت عمل علی سے محبت کرنا ہے)۔

بس آگے بڑھنے سے پیشتر یہاں رک جانا لازم ہے کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ لوگ غیر ضروری خوش فہمی میں مبتلا ہوں۔ بات صرف اتنی ہے کہ جو لوگ علی کی محبت سے بیزار ہو کر اپنے عمل پر فریفتہ ہیں ان کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ایسے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ محبت کوئی بہت ہی آسان چیز ہے اور عمل مشکل۔ حالانکہ حقیقت کے برعکس ہے۔ صفین والوں نے نماز روزہ نہیں چھوڑا لیکن علی کا ساتھ ضرور چھوڑ دیا۔ کربلا میں صاحبانِ عمل کی بہتات رہی لیکن حسین کی نصرت کیلئے چند نفوس ہی

میدان میں آئے۔ میرے سوال کا انتہائی سنجیدگی کے ساتھ جواب دیجئے۔ تاریخ عاشور جب امام حسینؑ نے جماعت نماز قائم کی تو کچھ اصحاب تو نماز کے لئے کھڑے ہوئے اور کچھ اصحاب امام کے سامنے دیوار بن کر بیٹھ گئے تا کہ جو تیر آئیں وہ اپنے سینوں کو چھلنی کر لیں لیکن امام محفوظ رہیں اور روایات میں آیا ہے کہ اس حملے میں چھتیس اصحاب اپنے سینوں پر تیر کھا کر شہید ہوئے۔ میرے عزیزو! میرے بھائیو! انصاف سے بتائیے کیا وہ چھتیس محبت کرنے والے بغیر نماز پڑھے اس دنیا سے چلے گئے؟ کیا کسی میں طاقت ہے کہ ان جیسی نماز پڑھ سکے؟ اب تو مجھ کو عمل سے کہتے ہیں ا
نجم آفندی نے کیا خوب کہا ہے۔

حق عبادت ادا اہل وفا کر گئے
اب وہ نمازیں کہاں۔ سجدے جو کر گئے

نہیں نہیں! محبت انتہائی مشکل چیز ہے۔ دعویٰ سب کرتے ہیں مگر بہت ہی کم لوگ۔ ہم تو کہتے ہیں محبوں کے محب بھی بن جائیں تو بڑی بات ہوگی۔ ہم نے اپنی بات کو اس لئے روکا ہے تا کہ آپ کو شیعہ اور غیر شیعہ کی پہچان کرا دیں تا کہ ہر کوئی اپنا جائزہ خود سے لے اور ہر جائزہ لینے کے بعد کوئی یہ محسوس کرے کہ وہ حقیقی مومن ہے تو اس کو دنیا و آخرت کی سعادتیں مبارک ہوں۔

کون کون شیعہ نہیں ہو سکتا؟

حضرت ختمی مرتبت چند باتوں سے بچنے کی تاکید فرماتے ہیں اور یہ انتہائے حیثیت ہے کہ عصمت مطلقہ پر فائز ہوتے ہوئے بھی تمام نقائص کو اپنی طرف منسوب کرکے نفی کرتے ہیں اور پھر ہمیں منع کرتے ہیں۔ ہر شیعہ ان خصوصیات کو غور سے پڑھے اور کوشش کرے کہ ان سے اجتناب نہیں یا اتقاؤب کرے۔
تفسیر فرات صفحہ ۲۰۳۔

رسول اللہ نے فرمایا: ''اے لوگو! خدا نے ہم اہل بیت کو مندرجہ ذیل چیزوں سے بچایا ہے۔

۱۔ ہم جھوٹے نہیں ہیں۔

۲۔ کاہن نہیں ہیں۔

۳۔ جادوگر نہیں ہیں۔

۴۔ سارق نہیں ہیں۔

۵۔ خائن نہیں ہیں۔

۶۔ جسم کا [illegible] والے نہیں ہیں۔

۷۔ بدعتی نہیں ہیں۔

۸۔ شکی نہیں ہیں۔

۹۔حق سے روکنے والے نہیں ہیں۔

۱۰۔منافق نہیں ہیں۔

جس شخص میں یہ باتیں موجود ہیں وہ ہم سے نہیں ہے۔ہم اس سے نہیں ہیں۔خدا اس سے بیزار ہے۔ہم بھی اس سے بری ہیں"۔

۲۔کوکب دری صفحہ ۳۲۸۔

حضرت امیر المومنین نے فرمایا" پانچ شخص ہمارے خاندان کے دوست کبھی نہیں ہو سکتے خواہ وہ کتنی کوشش کیوں نہ کریں۔(اس جملے میں یہ مفہوم بھی مضمر ہے کہ جو شخص ہم سے محبت نہیں کرتا اس میں مندرجہ ذیل صفات میں سے کم از کم ایک صفت ضرور موجود ہوگی)۔

اول۔دیوث۔دیوث ایسے شخص کو کہتے ہیں جسکو معلوم ہو کہ اسکی زوجہ زنا کار ہے اور وہ اس صورت حال پر راضی ہو۔

دوم۔مخنث۔ہیجڑا یا ایسا شخص جو پیدائشی طور پر مخنث ہو۔

سوم۔حرام زادہ۔اس سے مراد وہ شخص ہے جسے لوگ کسی ایک دوسرے کو اس نسب سے پکارتے رہتے ہیں۔

چہارم۔وہ شخص جسکی ماں ایام حیض میں اس سے حاملہ ہوئی ہو۔

پنجم۔پشت ندرز۔اس لفظ کے معنی ہمیں معلوم نہیں۔لغت میں ہم نے دیکھا تو کے

معنی یہ ہے "علت ذلی (علامۃ الشان) میں بڑا شخص"۔ مگر یہ معنی بھی ہمارے لئے ناقابل فہم ہیں۔ اس لئے اس کے معنی کسی واقف کار شخص سے پوچھے جائیں۔

۳۔ تیسری خصوصیت جو لفظ شیعہ کو مانع ہے وہ ترک تقیہ ہے۔ یاد رکھے کہ وہ شخص ہرگز شیعہ نہیں ہوسکتا جو غیبت امام کے زمانے میں سیاسی اچھل کود دکھانے کا مشتاق۔ جب وہ جدل و قوت کے مظاہرے میں بڑا نظر آئے اور جو شیعوں کو ترک تقیہ پر مجبور کرتا ہو تاکہ دشمن کو زحمت تلاش نہ کرنا پڑے اور وہ اطمینان سے ایک وقت سب کو نقصان پہنچا سکے۔

(الف)۔ کمال الدین و تمام النعمہ صفحہ ۱۰۳۔ امام علی رضا نے فرمایا "جس نے ہمارے قائم کے ظہور سے پہلے تقیہ ترک کر دیا وہ ہم میں سے نہیں ہے"۔

(ب)۔ کمال الدین و تمام النعمہ صفحہ ۶۱۱۔ راوی نے امام جعفر صادق سے روایت کیا کہ "آقا! باطل حکومتوں کے دور میں امام قائم کے دامن سے منسلک رہتے ہوئے چھپ چھپ کر عبادت کرنا افضل ہے یا ظہور امام کے بعد آپ کے عہد حکومت میں علانیہ عبادت کرنا؟"۔ آپ نے فرمایا "اے عمار! باطل حکومتوں میں پوشیدہ خیرات خدا کی قسم علانیہ خیرات سے افضل اور بہتر ہے۔ اسی طرح باطل پرست حکومتوں کے دور میں امام غائب کے دامن سے وابستہ رہتے ہوئے پوشیدہ عبادت افضل ہے۔ تم دیکھتے رہو کہ تمہارے امام کا حق اور تمہارا حق ظالموں کے ہاتھوں میں

ہے۔ تمہیں تمہارا حق نہیں دیا گیا اور مجبور کیا گیا کہ تم لوگ اپنے دین پر صبر کے ساتھ قائم رہتے ہوئے اللہ کی عبادت اور اطاعت کرتے رہو۔ اپنے دشمنوں سے ڈرتے ہوئے سب معاشرہ میں گھرے رہو۔ پس اس طرح اللہ نے تمہارے اعمال میں اضافہ کیا ہے۔ یہ فضیلت تمہیں مبارک ہو"۔

شانِ مومن

اب آخر میں ہم ان چند ممتاز لوگوں کا مختصر سا تعارف کرتے ہیں جو مندرجہ بالا صفات رذیلہ سے پاک اور نیز محبت میں ہوا کرتے ہیں۔

۱۔ تفسیر فرات صفحہ ۲۹۷۔ امام محمد باقرؑ نے فرمایا: "ہمارے شیعہ اہلبیت میں شامل ہیں۔ کیونکہ ان کو اہلبیت کی محبت القا ہوتی ہے۔ اہلبیت کی محبت کا نتیجہ یہی ہوتا ہے"۔

اس سے بڑھ کر چند خوش نصیبی کی مثال مل ہی نہیں سکتی۔ بارگاہِ رحمت سے نوازی گئی ہے جس کو یہ شرف ہے جو قبیلہ سلمان میں شامل ہونا چاہتا ہو اور سلاسل امامیہ کا پابند رہتا ہو۔

۲۔ تفسیر فرات صفحہ ۳۰۶۔ سورہ زمر میں ارشاد ہوتا ہے۔ "کیا وہ لوگ جو جانتے ہیں ان لوگوں کے برابر ہیں جو نہیں جانتے؟ بس نصیحت تو صاحبانِ عقل ہی حاصل کرتے ہیں"۔

اس آیت کی تفسیر میں امام جعفر صادقؑ اپنے والد بزرگوار سے روایت کرتے ہیں۔ "جاننے والے ہم ہیں۔ نہ جاننے والے ہمارے دشمن ہیں۔ نصیحت حاصل کرنے والے صاحبانِ عقل ہمارے شیعہ ہیں"۔

عقل مخصوص ہے شیعہ سے کیونکہ عقل کا کام ہی ہادی کا تعارف کرانا ہوتا ہے۔ پس جو ہادی کی معرفت رکھتا ہے وہی شیعہ ہے اور وہی صاحب عقل ہے۔ اسکے علاوہ جو بھی ہے خدا کے نزدیک وہ شمار بے عقلوں میں ہوتا ہے۔

۳۔ تفسیر فرات صفحہ ۳۸۹۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا "قیامت کے روز شیعوں کا حساب ہم لیں گے۔ اور خدا کا جو حق بنتا ہے (مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ) تو محمدؐ خدا سے معاف کرا لیں گے۔ اور بندوں کا جو حق بنتا ہے تو محمدؐ معاف کروا لیں گے۔ اور ہمارا جو حق بنتا ہے تو ہم معاف کر دیں گے اور وہ جنت میں بے حساب چلے جائیں گے"۔

کیا اب بھی کوئی بچا ہے جو قیامت کے خوف سے تھر کانپ رہا ہو؟۔ ایک کتاب کی لکھی جس کا نام تھا "اس دن سے ڈرو"۔ یعنی قیامت سے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ اس دن سے مخصوص نہیں۔ اس دن سے ڈرو۔ یعنی آج سے۔ آج اگر تم شیعہ نجات میں ہو کر ہو گئے تو پھر اس دن کی فکر سے فرصت ہی فرصت ہے۔ یہ وہ بات ہے کہ کسی کو اپنے منہ کے قول و وعدے پر اعتماد ہی نہ ہو۔

۴۔ کمال الدین و تمام النعمہ صفحہ ۳۰۲۔ حدیث ۸۔

رسول اللہ نے فرمایا "یا علیؑ! جان لو کہ ان لوگوں کا ایمان عجیب ترین اور ان کا یقین عظیم

ترین ہے جو آخری زمانے میں ہونگے جبکہ ان کے درمیان کوئی نبی نہ ہوگا اور حجت خدا ان کی نظروں سے پوشیدہ ہوگی۔ لیکن باوجود اندھیروں میں روشنی پر ایمان رکھیں گے"۔

آپ مقامات شیعہ پر غور فرمائیں کہ خود حضرت ختمی مرتبتؐ ایسے ایمان کو تعجب خیز اور سب سے یقینی و عظیم ترین قرار دے رہے ہیں صرف اس لئے کہ وہ اندھیروں (غیبت) میں روشنی (حضرت حجتؑ) پر ایمان لائیں گے اور کبھی نہیں ڈگمگائیں گے۔

۵۔ کمال الدین و تمام النعمہ صفحہ ۳۲۰۔ امام زین العابدینؑ نے فرمایا: "اس (حضرت قائمؑ) کی غیبت کے زمانے میں وہ لوگ جو اس کی امامت کے قائل اور اس کے ظہور کے منتظر ہونگے وہ تمام زمانوں کے لوگوں سے افضل ہونگے کیونکہ اللہ نے انکو عقل و فہم و معرفت عطا کی ہے کہ ان کے نزدیک غیبت مشاہدے کی طرح ہوگئی۔ ان کا مرتبہ ان مجاہدین کے برابر ہوگا جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ کے ساتھ تلوار سے جہاد کیا۔ یہی لوگ حقیقتاً ہمارے مخلص اور سچے شیعہ ہونگے۔ وہ لوگوں کو اللہ کے دین کی طرف ظاہری اور پوشیدہ دعوت دیں گے"۔

عالم کا انتظار وہی لوگ کر رہے ہیں جو ہر طرف سے مصائب و آلام میں گھرے ہوئے ہوں اور دعا میں رہتے ہوں کہ جلد ہمارے امام کا ظہور ہو تاکہ ہماری کشادگی کا زمانہ

گے جن لوگوں کے سارے کام بغیر امام کے ٹھیک ٹھاک چل رہے ہوں انہیں امام کی ضرورت ہی کیا ہے اور وہ امام کا انتظار کیوں کریں گے؟۔

ا۔ تفسیر فرات صفحہ ۲۶۷۔ حضرت امیر المومنین نے فرمایا "اہل جنت ہمارے شیعوں کے منازل کو اس طرح دیکھیں گے جیسے دنیا والے آسمان کے ستاروں کو دیکھتے ہیں"۔

ب۔ ہادی جی نے ترجمہ حسین میں نقل ہوا "اولئک فی جنت مکرمون" میں شامل ہو جائے اور اس مقام تک کوئی اور شے لے جا ہی نہیں سکتی سوائے محبت اہل بیت کے کہ شیعوں کے دلوں پر جو الہام ہوتا ہے۔

ج۔ نہج البلاغہ صفحہ ۶۸۰ مکتوب نمبر ۲۸۔ حضرت امیر المومنین نے فرمایا "اگر خداوند عالم نے خودستائی سے منع نہ کیا ہوتا تو بیان کرنے والا (یعنی خود امیر المومنین) بے شمار فضائل بیان کرتا کہ مومنین کے دل جن کی معرفت رکھتے ہیں"۔

یہ کلام خود ایک معجزہ ہے اس پر غور کیا جائے تو حقیقی مومن کی پہچان ہو جاتی ہے۔ ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ مولا نے اپنے جو فضائل بیان فرمائے ہیں لوگ تو ان ہی کا انکار کرتے ہیں اور ان میں طرح طرح کے اشتباہات پیدا کرتے ہیں لیکن یہاں سے مولا مومن کی یہ شان بیان فرما رہے ہیں کہ جو فضائل انہوں نے بیان ہی نہیں فرمائے مومن ان کی بھی معرفت رکھتا ہے اور مومن ان فضائل کو کس طرح جان لیتا ہے۔ پہچان لیتا ہے اور

مان لیتا ہے یہ وہی لوگ جان سکتے ہیں جنھوں نے دو مقامات پر لبیک کہی ہو۔ صحیح
ست ور عصر حاضر کے معاشرے سے کوئی مرد اس بات کو سمجھ سکتا ہے اور نہ مان سکتا
ہے اور شیعہ قوم میں کسی کی جرأت ہی نہیں ہے کہ وہ علی کے حقیقی فضائل کی ایک ادنیٰ جھلک
بھی کسی نے دیکھی ہو تو کمال حرکت کرنا چھوڑ دے گا۔ ن
ہیں با معرفت قدرت خود کو

غیر اللہ

شیطان نے جب اللہ کے مقابلے کی ٹھانی تو اس نے اپنے لشکروں کو ترتیب دیتے وقت ایک اصول تراشا۔ وہ جانتا تھا کہ اللہ کو نہ تو کبھی اس نے دیکھا ہے نہ کبھی اس سے بات کی ہے نہ کبھی اس سے ملاقات کی۔ اس لئے اللہ پر حملہ کرنا یا اللہ کو قتل کرنا اس کے لئے ممکن نہ تھا۔ لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اللہ اپنی مخلوق کے لئے ظہور فرماتا ہے تو خلیفۃ اللہ کے حجاب کے ذریعے۔ اسی اعتبار سے اس نے اپنا نام "نقاب" رکھا ہے۔ لہٰذا اللہ کی مخالفت کا واحد طریقہ یہی ہے کہ خلیفۃ اللہ کی مخالفت کی جائے اور خلیفۃ اللہ کی مخالفت کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اس کے اور اللہ کے درمیان تفریق پیدا کر دی جائے۔ یہی وہ ہتھیار تھا جسے شیطان نے سب سے پہلے ایجاد کیا اور جس کے ذریعے وہ مخلوق خدا پر حملہ آور ہوا۔ اس ہتھیار کا نام اس نے "غیر اللہ" رکھا جس کا مقصد اللہ کی آڑ میں خلیفۃ اللہ کی مخالفت کرنا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے قارئین اس بنیادی بات کو ہمیشہ ذہن میں رکھیں کہ اگر خلیفۃ اللہ کو اللہ سے جدا کیا گیا تو پھر توحید کا وجود ہی ختم ہو جاتا ہے اور وہ ایک تصور موہوم سے کچھ بھی باقی نہیں رہ جاتا کیونکہ توحید کے ادراک کا واحد ذریعہ اور وسیلہ خود خلیفۃ اللہ کا وجود ہے جس کے بغیر توحید کوئی معنی و مفہوم ہی نہیں رکھتی۔ اور انسان کسی ان دیکھی، ان سنی یا انجانی شے کا تصور کرتا ہے تو

وہ تصور خود کے ذہن کی تخلیق ہوتی ہے اور خود اپنی مخلوق کی پرستش کرنا در اصل توحید کی نفی کرنا اور بت پرستی کرنا ہے۔ جو لوگ بتوں کو پوجتے ہیں وہ کیا کرتے ہیں؟ وہ بھی تو اپنے تصور کے ذریعے ایک بت تراشتے ہیں اور پھر اس کی پوجا کرتے ہیں۔ بت چاہے پتھر کا ہو، مٹی کا ہو، لکڑی کا ہو یا خیال کا، وہ بہر حال بت ہی کہا جائے گا۔ اس کا نام چاہے God رکھ لو، بھگوان رکھ لو یا اللہ رکھ لو مگر نام رکھ دینے سے اس کی حقیقت نہیں بدل جائے گی۔ اگر ضد اور ہٹ دھرمی کو ایک طرف رکھ کر حقیقت پسندی کے ساتھ غور کیا جائے تو یہ بات فوراً سمجھ میں آجائے گی کہ کسی شے کو جانے بغیر سجدہ کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔ اگر کوئی کہے کہ اللہ کی مخلوق کو دیکھ کر اللہ کو جانا جاتا ہے تو کیا وہ اس بات کا انکار کرے گا کہ انسانوں کی ایک بڑی تعداد ایسی ہے جس نے ہمیشہ اللہ کے وجود کا انکار کیا ہے؟ کیا اللہ کی مخلوقات کو ان لوگوں نے نہیں دیکھا؟ پھر یہ انکار کیسے ممکن ہوا؟ ہم تو تب مانیں گے جب کوئی سورج کی کرنوں کو دیکھ کر سورج کا انکار کرے۔ لیکن آج تک ایک بھی دیوانہ انسان نہیں گزرا جس نے سورج کا انکار کیا ہو۔ پھر اللہ کا انکار کیسے ممکن ہوا؟ پتہ چلا کہ مخلوقات کو دیکھ کر وجود خالق کا تو ادراک کیا جا سکتا ہے مگر تمام مخلوقات مل کر بھی اللہ کی توحید نہیں بن سکتیں۔ اس بات کی توثیق امام رضا کے اس فرمان سے ہوتی ہے جو صحیفہ رضا صفحہ ۳۳ پر درج ہے۔

آپ فرماتے ہیں۔ ''اے اللہ میں ان سے برأت طلب کرتا ہوں جو تجھے تیری مخلوق

کے ذریعے پہنچنا چاہتے ہیں"۔

خالق کو مان کر کسی نے کہا کہ وہ فطرت (Nature) ہے۔ کسی نے کہا کہ وہ مادہ ہے۔ کسی نے کہا کہ وہ روح ہے۔ کوئی دو خداؤں کا قائل ہوا۔ کوئی تین کا اور کوئی ہزاروں کا۔ پس وجود خالق کا ادراک بھی کسی انسان کو توحید تک نہیں پہنچا سکا۔ جس کسی کو بھی توحید کا ادراک ہوا ہے تو صرف خلیفۃ اللہ کے ذریعے سے ہوا ہے۔ اسی کے حسن و جمال و کمال کو دیکھ کر انسان نے توحید کو جانا ہے اور مانا ہے۔ لہٰذا لفظ "غیر اللہ" زبان سے ادا کرتے وقت انسان کو ذرا رک کر سوچنا پڑے گا اور اس لفظ کی حدود کو جاننا پڑے گا کیونکہ یہی وہ مقام ہے جہاں زبانی توحید عملی شرک میں تبدیل ہو جاتی ہے اور یہی وہ نقطہ ہے جس سے شیطان کا مشن آگے بڑھتا ہے۔

غیر اللہ کون ہے؟

لغوی اعتبار سے اللہ کے سوا جو کچھ ہے وہ غیر اللہ ہے لیکن معنوی اعتبار سے غیر اللہ وہ ہے جو اللہ کے مقابلے پر آئے۔ یعنی یہاں غیر بمعنی مخالف ہوتا ہے۔ جو شے اللہ کی طرف سے ہو۔ اللہ کے لئے ہو۔ اللہ کے حکم سے ہو اور اللہ کی طرف لے جاتی ہو وہ ہرگز ہرگز غیر اللہ نہیں ہو سکتی۔ اس بات پر توجہ کرنے کی ضرورت ہے اور اسی حقیقت کو ہم چند مثالوں کے ذریعے واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم یہ کوشش اس لئے کر رہے ہیں کہ آپ مبادیات کو جان لیں اور ان سے مانوس ہو جائیں تاکہ آئندہ جو تفہیم

شامل مباحث آرہے ہیں وہ آپ کے لئے اجنبی نہ رہیں۔ اس باب میں ہم نے علامہ عبداللہ شاہ عبدی کی کتاب "الحق سلطانا نصیرا" سے خصوصی استفادہ کیا ہے جو ہمیں اپنے مقصد تک پہنچانے کے لئے بہت ضروری تھا۔

اسم اور ذبیحہ

جب ہم کوئی جانور ذبح کرتے ہیں تو اس کی چند شرائط ہیں۔ اوّل یہ کہ وہ جانور بذات خود حلال ہو۔ دوم یہ کہ ذبح کرتے وقت اس پر اللہ کے اسم کا ذکر کیا جائے جیسا کہ مندرجہ ذیل آیات سے ظاہر ہوتا ہے۔

۱۔ حج ۲۸۔ "تاکہ وہ اپنے فائدوں کو دیکھیں اور جو اس (اللہ) نے چوپائے مویشی عطا کئے ہیں۔ جانے بوجھے دنوں میں ان کے ذبح پر اللہ کے اسم کا ذکر کریں"۔

۲۔ حج ۳۶۔ "اور قربانی کے موٹے تازے اونٹ۔ ہم نے تمہیں تمہارے لئے اللہ کی نشانیوں میں سے قرار دیا ہے۔ اس میں تمہارے لئے بھلائی ہے پس تم ان پر ان کے صف بستہ کھڑے ہونے کی حالت میں اللہ کے اسم کا ذکر کیا کرو"۔

ان آیات سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ جانور کو ذبح کرتے وقت اس پر اللہ کا ذکر نہیں کرنا بلکہ اللہ کے اسم کا ذکر کرنا ہے۔ اور یہ بات ایک بچہ بھی جانتا ہے کہ کسی شے کا اسم اس شے کا غیر ہوتا ہے۔ قربانی خالصتاً اللہ کے لئے کی جاتی

ہے۔ اس میں "اسم" کو شریک کرنا شرک پسندوں کی نظر میں یقیناً شرک ہونا
چاہئے۔ لیکن ایسا کرنے کے لئے سب سے پہلے انہیں قرآن کو جھٹلانا پڑے گا اور
قرآن کی تکذیب کرنے والا ہر دو اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ یہ کتنا اچھا سودا ہوگا
کہ انسان اپنے خود ساختہ شرک سے بچنے کے لئے اسلام ہی سے خارج
ہو جائے؟۔ معلوم ہوا کہ "اسم اللہ" اللہ کا غیر ہوتے ہوئے بھی غیر اللہ میں داخل
نہیں ہے بلکہ ذکر اللہ، للہ، باللہ، باسم اللہ اور الی اللہ کے زمرے میں آتا
ہے۔ تیسری شرط یہ ہے کہ جانور کا چہرہ قبلے کی طرف ہو، اگر جان بوجھ کر ایسا نہ کیا
جائے تو چونکہ وہ جانور بذات خود حلال ہے اور اس پر اسم اللہ کا ذکر بھی کیا گیا ہے مگر
اس کے باوجود اس کا کھانا حرام ہوگا۔ اس صورت میں کعبہ اس عمل میں شریک ہو جاتا
ہے جو خالصتاً اللہ کے لئے کیا جا رہا تھا۔ کعبہ غیر اللہ ہے لیکن اس مقام پر اسے غیر
اللہ میں داخل کیا گیا تو ارتکاب کفر ہوگا۔ یہی صورت نماز، حج اور ان دیگر امور میں
ہے جن میں رو بقبلہ ہونا لازمی امر ہوتا ہے کہ بغیر رو بقبلہ بحالت اختیاری نماز باطل
ہوگی۔ بلکہ جب کوئی غیر اللہ سمجھ کر کسی طرف رخ کیا جائے گا تو نماز نہ صرف باطل ہوگی
بلکہ باعث جہنم بھی۔ پس اس سے ثابت ہوا کہ اگرچہ کعبہ اللہ نہیں ہے بلکہ غیر اللہ
ہے لیکن اللہ نے اسے اپنے حکم سے غیر اللہ سے نکال کر باسم اللہ اور ذکر اللہ و للہ
میں داخل کر دیا ہے۔

عظمت

"عظمت للہ" مشہور و معروف ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ عظمت صرف اللہ کے لئے ہے لہٰذا غیر اللہ کی عظمت حرام ہے۔ لیکن اللہ نے خود فرمایا ہے۔ "جو شعائر اللہ کی تعظیم بجا لائے پس وہ دل کی پرہیزگاری سے ہے"۔ (حج ۳۲)۔

حضرت اللہ نے اپنے اس فرمان سے شعائر اللہ کی تعظیم کو اپنی عظمت و تعظیم میں شامل کر لیا ہے۔ اب ہر کوئی مسلمان شعائر اللہ کو غیر اللہ جان کر ان کی تعظیم نہ کرے تو وہ اس حکم کے تحت کافر ہو جائے گا لہٰذا کسی مسلم کی مجال نہیں کہ وہ شعائر اللہ کو غیر اللہ میں داخل کر سکے اور جو کوئی ایسا کرے گا تو وہ اللہ کا مجرم ٹھہرے گا اگر چہ وہ عظمت للہ کی وجہ سے ایسی تعظیم نہ کرتا ہو۔ پس شعائر اللہ غیر اللہ نہ ہوئے بلکہ لکون للہ و للہ و بامر اللہ کہا جائے گا۔

حکم

سورۂ مومن کی آیت ۱۲ میں ارشاد ہوتا ہے۔ "پس حکم اللہ ہی کے لئے ہے جو علی الکبیر ہے"۔ اسی طرح یوسف ۴۰ میں اللہ ارشاد فرماتا ہے۔ "نہیں ہے حکم مگر صرف اللہ کے لئے"۔

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کے سوا کسی کو حاکم سمجھنا شرک باللہ ہے۔ لیکن وہی

اللہ تعالیٰ نے یہ کہا ہے سورہ نساء ۶۵ میں یوں ارشاد فرماتا ہے۔ "پس تیرے رب کی قسم یہ مومن نہ ہوں گے جب تک کہ اپنے جھگڑوں میں تجھے حاکم نہ بنائیں۔ پھر تیرے فیصلے کے خلاف اپنے دلوں میں ذرا بھی تنگی نہ کریں اور اس طرح قبول کریں جس طرح قبول کرنے کا حق ہے"۔ اللہ کے اس واضح حکم کے بعد کون مسلمان ایسا ہوگا جو حضرت علی مرتضیٰ کو اپنا حاکم نہ مانے اور اگر نہیں مانے گا تو تکذیب خدا کا مرتکب ٹھہرے گا اور مسلمان ہی نہ رہے گا۔ لہٰذا رسول اللہ غیر اللہ میں داخل نہیں ہو سکتے بلکہ من اللہ و بامر اللہ تسلیم کیا جائے گا اور یہ ایمان رکھنا پڑے گا کہ آپ کو حاکم ماننا ہی اللہ کو حاکم ماننا ہے کیونکہ حکم خدا اسی مقدس وجود سے جاری ہوتا ہے اسی لئے جب جنگ صفین میں خوارج نے "الحکم للہ" کا نعرہ لگایا تو حضرت امیرالمومنین نے فرمایا کہ "کلمۃ الحق یراد بہ الباطل" یعنی کلمہ تو حق ہے مگر اس سے مقصد ایک باطل ہے وہ باطل یہ ہے۔ یعنی جہاں بھی اللہ اور خلیفۃ اللہ میں تفریق کی جائے گی وہاں باطل ہی کہنا پڑے گا۔

ولایت

ترجمہ: "اور اللہ کے سوا تمہارا کوئی ولی ہے اور نہ مددگار"۔

مددگار کے بارے میں ہم بعد میں گفتگو کریں گے لیکن اس آیت سے یہ تو بہرحال ثابت ہو رہا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی ولی نہیں ہے اور جو شخص اللہ کے علاوہ کسی اور کو ولی

مانے وہ بھی شرک ہے۔ یعنی خود اللہ سورہ مائدہ کی آیت ۵۵ میں فرماتا ہے۔ "اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ تمہارا ولی ہے اور اس کا رسول اور وہ مومنین جو بحالت رکوع میں زکوٰۃ دیتے ہیں تمہارے ولی ہیں"۔ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کا رسولؐ اور حالت رکوع میں زکوٰۃ دینے والے مومنین تمام مسلمانوں کے ولی ہیں۔ لہٰذا جو مسلمان اس حکم کے تحت رسولؐ اور ان مومنین کو اپنا ولی نہ مانے وہ خود اللہ کی ولایت کا منکر ہوگا۔ پس رسولؐ اور وہ خاص مومنین ہرگز ہرگز غیر اللہ میں داخل نہیں ہو سکتے بلکہ وہ من اللہ اور بامر اللہ ہیں۔

خلق

قرآن میں اللہ نے جابجا اپنی خالقیت کا اعلان کیا ہے۔ اگر یہ کوئی معمولی چیز ہوتی تو اللہ اتنی شدت سے اپنی اس صفت کا اظہار نہ کرتا۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ خالق اللہ کے سوا کوئی نہیں۔ اور اللہ کے علاوہ کسی اور کو اس صفت سے متصف کرنا شرک کے زمرے میں داخل ہے۔ یعنی آل عمران ۴۹ میں اللہ حضرت عیسیٰؑ کا ایک قول نقل کرتا ہے جس میں حضرت عیسیٰؑ فرماتے ہیں۔ "میں تمہارے لئے مٹی سے پرندے کی شکل جیسی (چیز) خلق کرتا ہوں۔ پھر اس میں پھونک مارتا ہوں۔ پس وہ اللہ کے حکم سے پرندہ ہو جاتا ہے۔ اور میں مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو تندرست کر دیتا ہوں اور اللہ کے حکم سے مردوں کو زندہ کرتا ہوں"۔

ہم اس پوری آیت پر "خلق" کے حوالے سے بات کریں گے لیکن سب سے پہلے یہ بات توجہ کے قابل ہے کہ اس آیت میں لفظ "خلق" کی نسبت براہ راست حضرت عیسیٰ کی طرف کی گئی ہے اگرچہ حکم اللہ کا ہے۔ یعنی وہ حضرت فرماتے ہیں کہ "میں خلق کرتا ہوں" لہٰذا قرآن کی رو سے حضرت عیسیٰ کو خالق کہنا درست ہے۔ جب ہم دوسری توجہ طلب بات یہ ہے کہ خلق کے سلسلے میں جو الفاظ اللہ نے اپنے لئے استعمال فرمائے ہیں بعینہ وہی الفاظ حضرت عیسیٰ کے لئے بھی استعمال ہوئے ہیں۔ اپنے لئے اللہ فرماتا ہے "انی خالق بشرا من طین" اور حضرت عیسیٰ فرماتے ہیں "انی اخلق لکم من الطین" لہٰذا اس مقام پر اللہ اور عیسیٰ میں فرق کرنا اللہ کی تکذیب کرنا ہوگا۔

شفاء بمعنی خلق

"اور میں مادر زاد اندھوں اور کوڑھیوں کو اچھا کرتا ہوں یعنی شفا دیتا ہوں"۔ اس بات سے اکثر لوگ سرسری طور پر گزر جاتے ہیں اور حضرت عیسیٰ کو ایک ڈاکٹر کا درجہ دیکر مطمئن ہو جاتے ہیں حالانکہ یہ امر پہلے امر (یعنی مٹی سے پرندے خلق کرنا) سے بھی عظیم تر ہے کیونکہ اس سے حضرت عیسیٰ کے لئے انسان کو خلق کرنا ثابت ہوتا ہے۔ یہ بڑا اہم کام ہے کہ پروردگار عالم کسی شخص کو حسب حال، حکمت، ضرورت نابینا یا کوڑھی خلق کرتا ہے۔ اس پر تقدیر تکوینی جاری ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد وہ شخص

حضرت عیسیٰ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے اور آپ سے درخواست کرتا ہے کہ میری ناقص خلقت کو کامل کر دیں تو آپ اسکے بدن سے صرف اپنا ہاتھ مس کرتے ہیں۔ فوراً ہی اللہ کی تقدیر تحقیق پاتی ہے اور اسکی ساخت کا نقص دور ہو جاتا ہے اور وہ یہ ہو جاتا ہے کہ اسکی خلقت میں کوئی نقص نہیں رہتا۔ کیا یہ خلق کرنا نہیں تو اور کیا ہے؟ جس چیز کو اللہ نے اسکے جسم میں خلق ہی نہ فرمایا تھا حضرت عیسیٰ علیہ السلام صرف ہاتھ سے مس کرکے خلق کر دیتے ہیں!

مردے کو زندہ کرنا بمعنی خلق

اور اسکے بعد فرمایا "اور تمہارے لئے مردوں کو زندہ کرتا ہوں"۔

یہ پہلے سے بھی بڑا دعویٰ ہے۔ ہم عرض ہے کہ وہ مردہ شخص تقدیر اور قضاء وقدر کے تحت اپنی مقررہ زندگی گزار کر اپنی اجل مقسوم کے تحت مر چکا۔ اجل مقسوم نے جسم و روح کے بیچ میں دوری پیدا کر دی اور جسم گل سڑ کر تحلیل اور فنا ہو چکا۔ پھر علیہ السلام دوبارہ شکل سابق تخلیق فرما کر زندہ کر دینا خلق نہیں تو اور کیا ہے؟۔ اور ان امور پر نص قرآنی موجود ہے۔ بلکہ اس مقام پر اللہ اور عیسیٰ میں جدائی ڈالنے والا اور عیسیٰ کو غیر اللہ میں داخل کرنے والا اللہ کی نصوص متواترہ کا انکاری ہے۔

سجدہ

کوئی فرد واحد بھی اس بات سے انکار نہیں کرسکتا کہ سجدہ صرف اللہ کے لئے ہے وغیرہ

لہٰذا غیر اللہ کو سجدہ کرنے والا یقیناً کافر و مشرک ہے۔ جبکہ باوجود سورۃ ص کی آیت ۷۱ تا ۷۲ میں ارشاد خداوندی ہوتا ہے۔ ''(اور وہ وقت یاد کرو) جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ یقیناً میں مٹی سے ایک بشر پیدا کرنے والا ہوں۔ پس جب میں اسے درست کر چکوں اور اس میں اپنی طرف کی روح پھونک دوں تو تم اس کے آگے فوراً سجدہ کرنے کے لیے گر پڑنا''۔

ان آیت سے ثابت ہو رہا ہے کہ اللہ نے خود حکم دیا فرشتوں سے آدم کو سجدہ کریں۔ ملائکہ نے کیا۔ وہ سجدہ کرنے والا کافر کیوں ہوتا ہے لیکن آپ اس بات پر غور فرمائیں کہ اگرچہ انہوں نے خلافت آدم پر اعتراض کیا تھا لیکن سجدے پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ جبکہ برخلاف شیطان نے خلافت آدم پر کوئی اعتراض نہیں کیا لیکن سجدے پر اعتراض کیا۔ اس متضاد عمل سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملائکہ نے سجدہ کو نہیں دیکھا بلکہ امر خدا کو دیکھا جبکہ شیطان نے سجدہ کو دیکھا اور امر خدا کی مخالفت کی۔ ملائکہ انتظار میں تھے کہ کب آدم کے پتلے میں روح پھونکی جائے اور کب وہ سجدے میں گریں۔ اور شیطان سوچ رہا تھا کہ یہ تو غیر اللہ کے سجدے کی تیاری ہو رہی ہے اور غیر اللہ کو سجدہ کرنا حرام ہے۔ امر رب کے مقابلے میں اجتہاد کرنے نے ہی اسے کافر بنا دیا۔ جب امر رب کا انکار کافر بنا دیتا ہے تو صاحب امر کا انکار کرنے والا کس طرح مسلمان رہ سکتا ہے؟

یہ مسئلہ تھا ہم نے کہا اس سے سرسری طور پر نہیں گزر جاسکتا کیونکہ ہم دیکھتے
ہیں کہ سجدۂ آدم کو جس نظر سے شیطان نے دیکھا تھا اسی نظر سے مسلمانوں نے
بھی دیکھا بعد میں اس سے شیعہ علماء بھی محفوظ نہ رہ پائے اور غیر اللہ کے سجدے سے
خوف زدہ ہو کر اس سجدے کی طرح طرح سے تاویلیں کرنے میں مشغول
ہو گئے۔ حیرت ہے کہ ملائکہ جو ابلیس سے کہیں زیادہ عالم، اللہ کے فرماں
بردار، وحدت کے پرستار اور غیر اللہ سے بیزار تھے انھوں نے بلا کسی جھجک کے فوراً
سجدہ کر لیا۔ جب وہ سجدہ کر رہے ہیں جیسے کہ قرآن میں "لا یعصون بامر اللہ" کہا ہے تو
پھر اس سجدے کو غیر اللہ میں کیوں داخل کیا جا رہا ہے اور کبھی اسے سجدہ عبادتی اور سجدہ
تعظیمی کی حد میں یا تاویلیں کیوں کی جاتی ہیں؟۔ یہ سب امور تو یہ ثابت کرتے
ہیں کہ واقعا سجدہ آدم غیر اللہ کا سجدہ تھا۔ اب وہ عبادتی تھا یا تعظیمی اس سے کوئی
فرق نہیں پڑتا کیونکہ جس طرح عبادت محض اللہ کے لئے ہے اسی طرح عظمت
بھی محض اسی کے لئے ہے اور "العظمة لله والشفقة على خلق الله"
فرمان رسول اس پر دلیل ہے۔ پس عبادت ہو یا عظمت سب ہی اللہ کے لئے
ہے۔ عظمت الہیہ پر تو متعدد بالا احادیث اور قرآن مجید میں "وهو العلي
العظیم" شاہد ہے کہ عظمت صرف اللہ ہی کے لئے ہے اور تعظیم قول بزبان اور
تصدیق دل سے بھی ہو جاتی ہے۔ اور کسی کے لئے کھڑے ہونے سے بھی ہو جاتی ہے

اور کسی کے آگے جھک جانے سے بھی ہو جاتی ہے اور کسی کے لئے سجدہ کرنے سے بھی ہو جاتی ہے۔ اور نماز جسے عبادت کہا جاتا ہے اس میں یہ تمام امور یعنی کھڑے ہونا (قیام)۔ جھک جانا (رکوع) اور سجدہ سب ہی شامل ہیں اور انہی افعال کا نام عبادت ہے۔ اس بنا پر "سجدہ تعظیمی" کی تاویل سے فائدہ کیا ہوا؟ اور اس سے معنوی فرق کیا پڑا؟ اگر غیر اللہ کو تعظیمی سجدہ کرنا جائز مانا جائے گا تو وہ شخص جو غیر اللہ کا سجدہ کرتا ہو اس کے عمل کا جواز ثابت ہو جائے گا۔ لہٰذا سجدہ آدم کو سجدہ تعظیمی کہنے سے کفر کی حد میں داخل ہو جاتے ہیں کیونکہ غیر اللہ کو کسی بھی قسم کا سجدہ کرنا کفر ہے۔ حقیقت میں زیادہ سے دیکھا جائے تو عبادت خدا سے مراد اطاعت خدا ہے اور اس کے ہر حکم کی اطاعت کرنا اسکی عبادت میں داخل ہے۔ جب ملائکہ کا بامر اللہ آدم کو سجدہ کرنا ان کے نزدیک اللہ کی عبادت تھی۔ جس نے امر خدا سے انکار کیا اسی نے آدم کو غیر اللہ سمجھا۔ اور وہ سجدہ جس کے کرنے کا حکم خود اللہ دے وہ عبادت میں داخل ہے جبکہ ملائکہ کا آدم کو سجدہ عبادتی سجدہ تھا۔ جو فعل بامر اللہ کیا جائے وہ غیر اللہ میں داخل نہیں ہوتا اور جو فعل بلا امر اللہ کیا جائے وہی غیر اللہ میں داخل ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص صبح کی نماز میں بجائے چار رکعت پڑھے تو اگرچہ اس نے کوئی برا کام نہیں کیا بلکہ نماز پڑھی ہے لیکن چونکہ امر خدا کے خلاف پڑھی ہے لہٰذا اسکی یہ نماز غیر اللہ کی نماز ہوگی۔ جس فعل کا اللہ حکم دے وہ غیر اللہ نہیں ہوتا اور جس فعل کا اللہ حکم نہ دے بلکہ انسان خود اپنے نفس کی

خوشنودی کے لئے کرے تو وہ بھی غیر اللہ میں داخل ہوگا۔

سجدہ کی اہم بحث سے متعلق واضح طور پر سامنے آتے ہیں۔

۔عبادت خدا کا مطلب اس کے امر کے آگے سر جھکانا ہے۔

۲۔"ایاک نعبد" کا مطلب یہ بھی ہے کہ اللہ جس کی تعظیم کا حکم دے اسی کی تعظیم کی جائے۔ اللہ نے جس کے سامنے جھک جانے کا حکم دے اس کے سامنے فوراً جھکا جائے۔ اور اللہ جس کو سجدہ کرنے کا حکم دے اسے سجدہ کرنے میں ذرہ برابر بھی تاخیر روا نہ رکھی جائے۔ اور جو شخص امر خدا کے مقابلے میں اپنی رائے کو مقدم کرے وہ بھی غیر اللہ کا پجاری ہے چاہے وہ زبان سے اللہ اللہ کیوں نہ کرتا ہو اور چاہے وہ زبان سے غیر اللہ کی کتنی ہی مذمت کیوں نہ کرتا ہو۔

یہاں ہم نے "ایاک نعبد" کا حقیقی مقصد واضح کیا ہے اور اب "ایاک نستعین" کی طرف توجہ کرتے ہیں۔

استمداد و استعانت

اب ہم آتے ہیں اس موضوع کی طرف جو غیر اللہ کے پجاریوں کی فکر کا محور بنا ہوا ہے اور جو ان کا اصل ہدف ہے اور وہ ہے "استمداد و استعانت" یعنی مدد مانگنا۔ قرآن مجید میں طلب استعانت کے سلسلے میں سات قسم کی آیات ملتی ہیں جو سب کی سب بظاہر ایک دوسرے سے متصادم ہیں۔ جبکہ خود قرآن کا دعویٰ ہے کہ اس میں کوئی تضاد

ہے ہی نہیں۔ اور تضاد مل جائے تو یہ کلام خدا ہی نہیں رہتا۔ معلوم ہوا کہ ان تمام آیات میں جو تضاد بظاہر نظر آتا ہے وہ درحقیقت تضاد نہیں ہے بلکہ لوگ تفہیم میں غلطی کر رہے ہیں۔ لہٰذا ضرورت صحیح تفہیم کی ہے نہ کہ قرآن کو غلط بنانے کی۔

پہلی قسم کی آیات وہ ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ مدد کرنے والا صرف اللہ ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں باطل قوتیں اپنے پرستاروں پر چھا جاتی ہیں اور غیر اللہ کا بھوت عمل و تارک اولیاء میں مدہوشیاں کرتا ہے۔

۱۔ فاتحہ ۵۔ "ایاک نعبد و ایاک نستعین" کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ "ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں"۔ حالانکہ یہ ترجمہ ہی سراسر غلط ہے۔ "ایاک" جب دونوں ٹکڑوں میں مشترک ہے۔ جب پہلے ٹکڑے میں کا ترجمہ "تیری ہی" کیا جا رہا ہے تو دوسرے ٹکڑے میں کا ترجمہ "تجھ سے ہی" کیونکر ہو جائے گا۔ لہٰذا کا صحیح ترجمہ یہ ہوگا کہ "ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تیری ہی مدد چاہتے ہیں"۔ صرف صحیح ترجمے سے ہی کتنی مشکل حل ہوگئی۔

ہم حقیقتاً اللہ ہی کی مدد کے طالب ہیں لیکن اگر اللہ کی مدد آتی ہی غیر کی شکل میں ہو تو پھر ناگوار کیوں گزرے اور ناک بھوں چڑھانے کا یہاں کیا جواز ہے؟

۲۔ بقرہ ۱۰۷۔ "اور اللہ کے سوا نہ تو کوئی تمہارا ولی ہے اور نہ کوئی مددگار (نصیر)"۔

۳۔ توبہ ۱۱۶۔ "اور اللہ کے سوا تمہارا نہ کوئی ولی ہے اور نہ مددگار (نصیر)"۔

نساء ۱۲۳ ۔ "جو شخص بھی برائی کرے گا اس کا بدلہ پائے گا اور وہ خدا کے سوا کسی کو نہ اپنا ولی پائے گا اور نہ مددگار (نصیر)"۔

دوسری قسم ان آیات پر مشتمل ہے جن میں من جانب اللہ کسی مددگار کا ذکر کیا گیا ہے۔

بقرہ ۱۲۰ ۔ "اے رسول! اگر آپ نے اس "علم" کے آجانے کے بعد بھی (یہود و نصاریٰ کی) خواہشات کی پیروی کی تو اللہ کی طرف سے نہ تمہارا کوئی ولی ہوگا نہ مددگار (نصیر)"۔

انفال ۱۰ ۔ "اور نہیں ہے کوئی مدد مگر اللہ کی طرف سے"۔

اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی بھی جو اللہ نہیں ہے مگر جب اللہ بھی شامل ہے اور کسی کی مدد اللہ کی مدد کہلاتی ہے اور "اللہ کے سوا نہ تو تمہارا کوئی ولی ہے نہ نصیر" کا مصداق ہی ہے۔

آیات کی تیسری قسم وہ ہے جن میں کسی سے مدد مانگنے کا حکم دیا گیا ہے۔

بقرہ ۴۵ ۔ "مدد مانگو صبر سے اور صلوٰۃ سے"۔

یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ نہ تو "صبر" خدا ہے اور نہ "صلوٰۃ"۔ اس کے باوجود ان دونوں سے مدد مانگنے کا حکم دیا جا رہا ہے لہٰذا جس شخص کا بھی یقین اس بات پر ہے کہ کلام اللہ ہونے کے ناطے قرآن میں تضاد ہونا محال ہے وہ اس بات پر بھی یقین رکھے گا کہ یہ دونوں چیزیں یعنی صبر اور صلوٰۃ غیر اللہ نہیں بلکہ من اللہ اور الی اللہ ہیں اور ان سے مدد

مانگنا حقیقتاً اللہ ہی سے مدد مانگنا ہے۔

چوتھی قسم ان آیات کی ہے جن میں ہمیں ایک دوسرے کی مدد کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

مائدہ ۲: "اور تم نیکی اور پرہیزگاری میں ایک دوسرے کی مدد کرو"۔

اس آیت کی رو سے مومنین اگرچہ اللہ نہیں ہیں لیکن چونکہ باہم ایک دوسرے کی مددگار ہیں اس لئے غیر اللہ سے خارج ہیں۔

پانچویں قسم ان آیات کی ہے جن میں خود اللہ کسی مدد کرنے والے کا ذکر یہ انداز میں کر رہا ہے۔

حدید ۲۵: "اور ہم نے لوہا اتارا کہ اس میں سخت خوف ہے اور لوگوں کے لئے فائدے بھی۔ تاکہ اللہ ظاہر کردے کہ کون اسکی (یعنی اللہ کی) اور اسکے رسولوں کی مدد کرتا ہے پوشیدہ طور پر"۔

اس آیت سے ظاہر ہے کہ اللہ ایک ایسے وجود کا تعارف کرانا چاہتا ہے جو اللہ نہیں ہے لیکن اسکے باوجود اللہ اور اسکے تمام رسولوں کا مددگار ہے جیسا کہ حضرت ختمی مرتبتؐ نے فرمایا: "یا علی! تم نے تمام انبیاء کی نصرت کی پوشیدہ طور پر اور میری نصرت کی ظاہر بظاہر ہو کر"۔ اللہ حکیم مطلق ہے اور حکیم کا کوئی فعل عبث نہیں ہوا کرتا لہذا غور کرنا چاہئے کہ اس "مددگار" کا تعارف کرانے سے اللہ کا مقصد کیا ہے؟ ہو سکتا ہے کہ جب معصوم انبیاء بھی مدد کے بغیر کار رسالت انجام نہیں دے سکتے تو ہم جیسے گناہگار اور

کمزور انسان اس کی مدد کے بغیر امور دنیا و آخرت کیونکر بجا لا سکتے ہیں اور یہ کہ ہمارے پاس کوئی چارہ کار ہے ہی نہیں کہ ہر کام شروع کرنے سے پہلے اس سے مدد طلب کریں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر کام شروع کرنے سے پہلے ''بسم اللہ الرحمن الرحیم'' کہنے کا حکم ہے کیونکہ یہ میرے مولا کا کلام ہے۔ اس کی تفسیر انشاء اللہ آئندہ اوراق میں آئے گی۔

چھٹی قسم ان آیات کی ہے جن میں اللہ خود بندوں سے مدد مانگ رہا ہے۔

صف آیت ۱۴ ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو تم اللہ کے مددگار ہو جاؤ جیسا کہ عیسیٰ ابن مریم نے حواریوں سے کہا کہ کون ہیں اللہ میں میرے مددگار ہیں۔ حواریوں نے کہا کہ ہم ہیں اللہ کے مددگار''۔

یہ آیت بھی اہم ہے کہ اگر اس کی صحیح تفہیم ہو گئی تو سارا مسئلہ خود بخود حل ہو جائے گا۔ اس میں تین باتیں قابل غور طلب ہیں۔

۱۔ اللہ حکم دے رہا ہے کہ میری مدد کرو اور مثال عیسیٰ کی دے رہا ہے۔ (''جیسا کہ عیسیٰ نے حواریوں سے کہا'')۔

۲۔ یعنی حضرت عیسیٰ اپنے حواریوں سے یہ نہیں کہہ رہے کہ اللہ کی مدد کرو بلکہ وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ میری مدد کرو۔ اس صورت میں یہ مثال کیونکر صحیح ہو سکتی ہے؟

۳۔ عیسیٰ کے حواریوں نے اس فرمان سے وہی مطلب اخذ کر لیا ہے جو اللہ کا ہے۔ عیسیٰ کے طلب کرنے پر وہ یہ نہیں کہتے کہ ہم آپ کی مدد کریں گے بلکہ یہ کہتے ہیں کہ ''ہم

اللہ کے مددگار ہیں"۔

اس صورت سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ نے اپنے اور اپنے نبی کے درمیان تفریق روا نہیں رکھی اور اپنی مدد سے مراد عیسیٰ کی مدد کو لیا۔ اس طرح حضرت عیسیٰ کے غیر اللہ نہ رہے بلکہ من اللہ میں داخل ہو گئے۔ اسی طرح سے حواری بھی مدد کرنے کے عمل میں غیر اللہ نہ ہوئے بلکہ بامر اللہ قرار پائے۔

آیت کی ساتویں قسم وہ ہے جن میں اللہ خود حضرت خاتم النبیین کو حکم دیتا ہے کہ مجھ سے مدد نہ مانگو بلکہ مددگار مانگو کیونکہ مدد میں خود نہیں کرتا بلکہ وہ مددگار کرتا ہے اور تیری مدد میری مدد کہلاتی ہے۔

بنی اسرائیل ۸۰ "اور اے رسول! کہو کہ اے میرے پروردگار مجھے داخل کر سچا داخل کرنا اور مجھے نکال سچا نکالنا اور میرے لئے اپنی جناب سے قرب سے ایک مددگار قرار دے جو غالب علی کل غالب ہو"۔

شرک اور غیر اللہ کے متوالوں کو سوچنا چاہئے کہ جب اللہ اپنے محبوب کی مدد بھی براہ راست نہیں کرتا اور نہیں کرنا چاہتا ہے تو پھر ان غیر اللہ کی جیبوں میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں کہ اللہ اپنے تمام اصول توڑ کر ان کی مدد کے لئے شخصی طور پر زمین پر اتر آئے گا؟ یہ نہیں سمجھتے کہ جہاں بھی اللہ نے "نصیر" ہونے کا دعویٰ کیا ہے تو وہاں "نصیر" سے مراد یہی ساختہ نصیر یعنی ولی امر اللہ

کا یہی ولی مطلق۔ یہی امر کا مالک۔ یہی قدرت کاملہ کا وجود مجسم۔ میرے مولا
حضرت امیر المومنین کو ہی پایا ہے۔ جب یہ علم اللہ کا علم۔ یہی مشیت اللہ کی
مشیت۔ یہی ارادہ اللہ کا ارادہ اور یہی امر اللہ کا امر ہے تو پھر یہ شرک غیر اللہ میں کیونکر
ہو سکتا ہے اور ان سے طلب امداد کس بنا پر غیر اللہ کی امداد کہا جا سکتا ہے؟۔

اور یہ مطالب آپکے اذہان تک پہنچ گئے ہیں تو اب ملاحظہ فرمائیے کہ ایک
نامور شیعہ فاضل، مجتہد اور مذہب کے محقق عالم "یا علی مدد" کی تردید میں یوں گوہر افشانی
فرماتے ہیں۔

''مذہب سے بیگانہ مستعین کا اظہار اور دل سے غیر اللہ کی مدد، حضرت کا قرض خدا سے
غداری ہے''۔

ان کلمات کو دیکھیے اور پھر ان کی عبارت ملاحظہ فرمائیے۔ کیا آپ اندازہ لگا سکتے ہیں
کہ انہوں نے استعمال کردہ الفاظ "خدا سے غداری" کی زد کہاں کہاں تک پہنچتی ہے؟۔ اسکی
زد خود رسول اللہ پر پڑتی ہے جنکی ساری زندگی یا علی مدد کہتے گزری۔ اسکی زد تمام انبیاء
پر پڑتی ہے کہ علی سے طلب استعانت جنکی زندگی کا منشور تھا۔ اسکی زد حسنین معصومین پر
پڑتی ہے جنکے آپ کے الفاظ آج بھی فضائے کون و مکاں میں گونج رہے ہیں۔ "جل
من داسمر یشمرہا"۔

اس سے زیادہ افسوس کچھ نہیں ہو سکتا۔

اب تک تو ہم جواز استعانت پر گفتگو کر رہے تھے لیکن اب ہم یہ ثابت کریں

لگے کہ میں "حفظ نا نفسی" سے مدد مانگنا واجب و لازم اور نہ مانگنا شرک و حماقت ہے۔

۱۔ شیطان نے اللہ کو سجدہ کرنے سے انکار نہیں کیا تھا بلکہ اللہ نے جس کا سجدہ کرنے کا حکم دیا تھا اس کو سجدہ کرنے سے انکار کیا تھا اس لئے تا ابد ملعون ہوا۔ اسی طرح جو شخص اللہ سے مدد مانگنے پر تیار ہو مگر جن سے مدد مانگنے کا اللہ نے حکم دیا ہے ان سے مدد مانگنے سے انکاری ہو تو وہ شخص بھی شیطان کے ساتھ ہوگا کیونکہ جرم دونوں کا ایک ہی نوعیت کا ہے۔

۲۔ سورہ انا انزلناہ میں "کل امر" سے ثابت ہے کہ کسی امر کا تعلق نہیں رہا کیونکہ خدا کے تمام امور صاحب امر کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ جب ایسا ہے تو ہر امر کو ان سے طلب کرنا جائز ہی نہیں بلکہ واجب و لازم ہے کیونکہ خدا نے تمام امور کی تقسیم و ترتیب کو انکے اختیار میں دے کر انکو ولی الامر بنایا ہے۔ اگر کوئی شخص آٹا لینے کے لئے دکان پر جانے کے بجائے سیدھا کسان کے پاس پہنچ جائے تو ایسے شخص کو دنیا احمق و پاگل ہی کہے گی۔

۳۔ امام محمد باقرؑ نے فرمایا "ہمارا نور تمہارے رب کے نور سے اس طرح صادر ہوتا ہے جس طرح آفتاب سے اس کی شعاعیں جدا ہوتی ہیں"۔ (غایت المرام فی ضرورت الامام)۔

دنیا کی ہر شے آفتاب سے فیض حاصل کرتی ہے بلکہ بقائے حیات کی وجہ آفتاب پر

منحصر ہے۔ لیکن چونکہ اشیاء عالم میں یہ صلاحیت ہی نہیں کہ آفتاب سے براہ راست
فیض حاصل کرسکیں اس لئے یہ اشیاء مجبور ہیں کہ شعاع کی طرف رجوع کریں کیونکہ
وہی واحد وسیلہ ہے۔ اس لئے اشیائے عالم کو فیض آفتاب حاصل کرنے کے لئے
آفتاب کے پاس جانے کی ضرورت نہیں بلکہ شعاع آفتاب سے تعلق پیدا
کرنے کی ضرورت ہے۔ جب اشیاء نے بھی شعاع سے تعلق پیدا کرلیا تو فوراً فیض
آفتاب جاری ہوگیا۔ آفتاب کی شعاعوں کا عکس یا جز ثابت کرنا یا تسلیم کرنا خود آفتاب
کا عکس اور جز ثابت کرنا ہوگا۔ کیونکہ آفتاب کی شعاعیں اپنا ذاتی کچھ ظاہر نہیں رکھتیں
بلکہ جو کچھ آفتاب میں ہے یہی لوگ ظاہر کرتی ہیں۔ اسی وجہ سے انکو آفتاب کہا بھی جاسکتا
ہے اور نہ کہا بھی جاسکتا ہے اور شعاعوں کو آفتاب کہنے سے آفتاب کا انکار نہیں
ہوتا۔ ایک انسان شعاع آفتاب سے بہت دور یا علیحدہ ہوکر ہر قسم کی دعائیں اور
التجائیں کرے کہ "اے آفتاب اپنی شعاع اور کرنوں کے واسطے اور وسیلے سے مجھے
سردی سے بچا یا کہ میرے اندر حرارت داخل کردے" لیکن ان دعاؤں سے کچھ بھی نہ ہوگا۔ اب
جیسے ہی کسی شعاع میں جاکر بیٹھ گیا تو فوراً فیض جاری ہوجائے گا اور بغیر طلب و دعا
کے جاری ہوجائے گا۔ جب مخلوق در مخلوق کا یہ حال ہے کہ ہم بغیر کسی وسیلے کے
فیض حاصل نہیں کرسکتے تو خالق کے معاملے میں کیا یہ کبھی ممکن ہوسکتا ہے اور یہ کیسے
ہوسکتا ہے کہ کوئی براہ راست خالق کی بارگاہ میں جاکر حاضر ہوجائے۔ ہمیں بہرحال

اپنی حاجت کے لئے وسیلے کی طرف ہی رجوع کرنا پڑے گا۔ ذات وسیلہ سے فیض حاصل کرنے کا ذریعہ وسیلہ صرف یہی ذوات مقدسہ ہیں۔ ان کے بغیر کسی کو بھی اللہ کے فیوض حاصل نہیں ہو سکتے۔ آخر اللہ نے انکو یہ درجات و اختیارات عطا کیوں کئے فرمائے تھے؟ ان درجات و اختیارات کو بروئے عمل لانے اور انکا اظہار کرنے کے لئے یا محض ان درجات کا ذکر کر کے ہم پر احسان رکھنے کو؟ جب یہ اولی بالتصرف ہیں اور ہم پر حاکم ہیں تو ہر شخص کا فرض ہے کہ اپنے مالک و حاکم سے ہی ہر شے طلب کرے کیونکہ انکو بطور حاکم خود اللہ نے ہی بنایا ہے۔ اس لئے ان سے مانگنا اللہ سے مانگنا ہے اور ان سے نہ مانگنا اللہ سے تکبر کرنا ہے۔ (امام معصومین کی دعاؤں میں اللہ سے مانگنے کا درس اس لئے دیا گیا ہے کہ نافہم اور کم ظرف لوگ وہی کچھ نہ کر بیٹھیں جو پچھلی امتوں نے کیا تھا یعنی یہ لوگ خود ان ذوات مقدسہ کی پرستش شروع نہ کر دیں۔ لیکن مومن ان تمام اشتباہات سے منزہ و مبرا ہے اور وہ اللہ اور غیر اللہ میں واضح طور پر فرق کرتا ہے۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اللہ سے مانگنے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ وسیلے کی طرف رجوع کیا جائے جن سے مانگنا ہی اللہ سے مانگنا کہلاتا ہے)۔

"ایاک نعبدو ایاک نستعین" کا لفظ عمومی ہی وہ کنجی ہے جس پر غیر الٰہی فرقے کا یہ داب ہے اور ان پہلوؤں کو نظر میں رکھ کر وہ اقتضائے عام میں پیچ و مرشدے ولایتی نظریے کا پرچار کرتے ہیں۔ ہم نے اس کنجی کو کاٹ دیا ہے

کے دونوں ٹکڑوں کا اصل مفہوم خود قرآن سے ثابت کر دیا۔ یہ مفہوم ہر مومن کو معلوم ہونا چاہئے اور یاد رکھنا چاہئے تاکہ علماء باطن سے خود بھی محفوظ رہ سکے اور دوسروں کو بھی بچا سکے۔ اس لئے ہم خلاصے کے طور پر اس آیت کے قرآنی مفہوم کو جلی حروف میں لکھ رہے ہیں تاکہ نگاہ سے کبھی اوجھل نہ ہوں۔

"ایاک نعبد" کے معنی یہ ہیں کہ اللہ جس کی تعظیم کا حکم دے اس کی تعظیم کی جائے۔ اللہ جس کی طاعت کا حکم دے اس کی اطاعت کی جائے۔ اللہ جس کے سامنے جھکائے اس کے سامنے جھک جائے اور سر نہ اٹھائے۔ اللہ جس کو سجدہ کرائے اس کو سجدہ کرنے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر روا نہ رکھے۔

"ایاک نستعین" کے معنی یہ ہیں کہ اللہ جس سے مدد مانگنے کا حکم دے صرف اسی سے مدد مانگی جائے۔

یہ ایک مبادیاتی بحث تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ غیر اللہ کے فرضی بھوت کا خوف لوگوں کے دلوں سے نکل جائے اور وہ بے خوف و خطر مظاہر اللہ کے فضائل سن سکیں اور ان کے مقامات کا حسب استطاعت ادراک کرتے ہوئے سبیل معرفت پر قدم بہ قدم اپنا سفر شروع کریں اور جاری رکھیں۔ ہمیں امید ہے کہ آگے چل کر جو مباحث آئیں گے ان سے مومنین کے دلوں کو ٹھنڈک پہنچے گی اور ان کی معرفت و یقین و طمینان میں مسلسل اضافہ ہوگا۔ ہمارا کام معرفت محمد و اہل بیت کا پودا

مومنین کے دلوں میں کاشت کرتا ہے۔ اس کی آبیاری اور نگہداشت کرنا اور پھر اسے ایک تناور درخت کی صورت میں پروان چڑھانا خود مومنین کی ذمہ داری ہے۔

من تو شدم تو من شدی

بحث کو سمیٹتے ہوئے ہم پھر اپنی بات کا اعادہ کرتے ہیں کہ جہاں بھی اللہ اور خلق میں تفریق ڈالی گئی ہے سے شرک شروع ہو جائے گا۔ خلق اللہ سے جدا نہیں ہے جیسے شعاع آفتاب سے جدا نہیں ہوتی۔ اسی اتحاد کو "وحدت صفات" کہا جاتا ہے جسے بعض صوفیوں نے خدا جانے کیا سے کیا بنا دیا ہے۔ خلق اللہ کی صفت کاملہ ہے جو کہ ذات سے نہ کبھی جدا تھی۔ نہ اب جدا ہے اور نہ کبھی جدا ہوگی۔ خلق سب حقیقت خدا کا نام ہے کیونکہ خدائے قدیم کی حادث کے ذریعے ظہور نہیں رکھتے۔ اور خدا کی کوئی بھی صفت اس وقت تک ثابت ہی نہیں ہو سکتی جب تک وہ خلق سے ظاہر نہ ہو جائے۔ خدا کے کسی فعل کا اس وقت تک تصور بھی نہیں کیا جا سکتا جب تک وہ ان مقدس ہاتھوں سے سرانجام نہ پائے۔ یہ چونکہ تفصیل کا محل نہیں اس لئے ہم اپنے موضوع کی مکمل تفہیم کے لئے چند احادیث "مومنین" کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ تفصیل انشاء اللہ آئندہ اوراق میں آتی رہے گی۔

۔ توحید صفحہ ۸ حدیث ۸۔ امام جعفر صادق نے فرمایا۔

"ہماری عبادت کی وجہ سے اللہ کی عبادت کی گئی۔ اگر ہم نہ ہوتے تو اللہ کی عبادت نہ کی

جاتی"۔

اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ کوئی محسوس موجود شے نہیں ہے جب کوئی اسکو محسوس ہی نہ کرسکتا، نہ کوئی مشاہدہ ہی نہ کرسکتا اور نہ کوئی ادراک ہی نہ کرسکتا تو اسکی عبادت کا تصور ہی محال تھا۔ جب ان مقدس ہستیوں کو دیکھا تو ان پر خدائی کا گمان ہوا اور خدا سمجھ بیٹھے اور جب انھوں نے عبادت کی تو خلق خدا نے سمجھا کہ یہ خدا نہیں ہیں بلکہ خدا کے بندے ہیں۔ اگر یہ عبادت نہ کرتے تو آج انکی عبادت کی جارہی ہوتی۔ انکی دلیل خدا صرف انکی عبادت ہے اور عبادت خدا کا واحد ذریعہ بھی ہیں۔ عبد و معبود کے اس فرق کے علاوہ ان میں اور اللہ میں کسی قسم کی تفریق نہیں کی جاسکتی۔

۲۔ توحید صفحہ ۱۶۴ حدیث ۱ حضرت امیر المومنین نے فرمایا۔

"میں اللہ کا علم ہوں اور میں اللہ کا یاد رکھنے والا قلب ہوں اور اللہ کی بولنے والی زبان۔ اللہ کی آنکھ۔ اللہ کا پہلو اور اللہ کا ہاتھ ہوں۔ جس نے مجھکو اور میرے حق کو پہچانا تو اس نے اپنے رب کو پہچانا"۔

امیر المومنین کے اس ارشاد سے ظاہر ہے کہ جو صفات ہم اللہ سے منسوب کرتے ہیں وہ صرف اس لئے کرتے ہیں کہ وہ علی سے ظاہر ہوئی ہے۔ اگر علی سے ظاہر نہ ہوتی تو اللہ سے بھی منسوب نہ ہوتی اور یہی وہ مقام وحدت ہے کہ علم و قدرت و تصرف و کلام و بصیرت و سماعت و مشیت و ارادہ۔ غرض ہر شے میں عبد اور معبود میں

گیا، اتحاد ہے کہ جب تک بندہ اپنی زبان سے نہ کہدے کہ میں بندہ ہوں اس وقت تک دونوں میں کوئی فرق ہی نظر نہ آئے۔

۳۔ نہج الاسرار صفحہ ۳۸ ۔ حضرت امیر المومنین نے فرمایا۔

''اور ہم ہی اللہ کا پہلو، ہاتھ، اس کی زبان اور اس کا امر ہیں۔ اور ہم ہی اس کا علم اور اس کا حق ہیں۔ جب ہم چاہتے ہیں تو اللہ بھی چاہتا ہے اور ہم جو ارادہ کرتے ہیں تو اللہ بھی وہی ارادہ کرتا ہے۔ پس ہم ہی وہ مثانی ہیں جنہیں اللہ نے اپنے نبی کو عطا کیا ہے اور ہم ہی وہ وجہ اللہ ہیں جو زمین میں تمہارے درمیان اپنی مرضی سے تصرف کرتے ہیں۔ پس جس نے ہماری معرفت حاصل کی اس کے ساتھ یقین ہے اور جس کو معرفت نہ ہو سکے اس کے آگے سجین ہے۔ اور ہم چاہیں تو زمین کو شق کریں اور آسمان کو صعود کر جائیں۔ بے شک تمام مخلوق کی بازگشت ہماری ہی طرف ہے اور پھر ہم ہی کل کا حساب لینے والے ہیں''۔

اس فرمان ذیشان میں کئی باتیں غور طلب ہیں۔ اول یہ کہ یہ مقدس ہستیاں اللہ کا علم بھی ہیں اور اللہ کا امر بھی اور آپ گذشتہ بیان سے یہ جان چکے کہ شیطان کے راندہ درگاہ ہونے کا باعث جب یہ تھا کہ اس نے امر خدا کی مخالفت کی تھی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ فعل میں متحد ہونا ہی ذات میں متحد ہونے کی دلیل ہے لہذا یہ اولی مقصرین بلکہ یہ اصول ہے کہ جو بھی امر خدا یعنی ائمہ معصومین کی مخالفت کرے گا

اسکا اور شیطان کا انجام ایک ہی ہوتا ہے یعنی عمل مخالفت معصوم میں دونوں متحد ہیں۔ دوسری بات یہ کہ "حق خدا" بھی حق معصومین ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جن جن چیزوں کو ہم حقوق اللہ کہتے ہیں مثلاً نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ وغیرہ ان سب کی حقیقت بھی یہی ہیں۔ لہٰذا جس نے ان کو چھوڑا وہی ان تمام عبادات کا تارک قرار پائے گا۔ اسی سے آپ سمجھ سکتے کہ تارک الصلوٰۃ کو کافر کیوں کہا گیا ہے۔ تیسری بات اللہ کی مشیت اور ارادہ ہے۔ لوگوں کی اکثریت یہی ہے جو خوش عقیدہ ہونے کے باوجود اس اتحاد مشیت و ارادہ کو ایک میکانکی عمل سمجھتے ہیں۔ جیسے سوئچ دبانے سے بلب روشن ہو جاتا ہے تو اس میں بلب کا کوئی اختیار نہیں ہوتا بلکہ وہ وہی کچھ کرتا ہے جو سوئچ چاہتا ہے۔ لیکن مولا کے اس فرمان سے ثابت ہو گیا کہ یہ حضرات اللہ کی مشیت اور ارادہ ہیں لیکن مشیت مجبور یا ارادہ مجبور نہیں بلکہ مشیت مختار و ارادہ مختار ہیں۔ اور ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ اسی لئے آنجناب نے فرمایا کہ "جب ہم چاہتے ہیں تو اللہ بھی چاہتا ہے اور جب ہم ارادہ کرتے ہیں تو اللہ بھی ارادہ کرتا ہے"۔ یعنی اللہ کا چاہنا ہمارا چاہنا اور ہمارا چاہنا اللہ کا چاہنا ہے۔ اللہ کا ارادہ ہمارا ارادہ اور ہمارا ارادہ اللہ کا ارادہ ہے۔ اور یہی وہ مقام اتحاد ہے جسکو ثابت کرنا مقصود ہے۔ اگر یہ بات کسی کا دل چھوڑنے لگا ہو اور ماتھے پر پسینہ آنے لگا ہو تو وہ سورہ دہر کی آیت ۲۸ تا ۳۰ کا مطالعہ کرے۔ ساری حقیقت کھل کر سامنے آ جائے گی اور

اگر ہمارے بس سے ممکن ہوا تو آئندہ صفحات میں ہم بھی ان آیات کا مختصر جائزہ لیں گے۔

۴۔ نہج البلاغہ صفحہ ۱۳۶۔ حضرت امیر المومنین نے فرمایا۔

"جس نے ہماری تردید کی اس نے خدائے قدیم کی بات کو رد کیا"۔

یہ ظاہر ہے کہ خدائے قدیم نہ تو کسی کے سامنے آتا ہے اور نہ کسی سے بات کرتا ہے اور جب بات ہی نہیں کرتا تو اس کی بات کو قبول یا رد کرنے کا کوئی معنی ہی نہیں بنتا۔ معصوم ہو کہ جو بات ان کی زبان مبارک پر جاری ہو وہ ان کی بات نہیں ہے بلکہ اللہ کی بات ہے اور جو نتیجہ اس حدیث سے نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ ان میں اور اللہ میں تفریق ڈالنے والا خداوند قدیم و قیوم کی ذات کا منکر ہے۔

۵۔ نہج البلاغہ صفحہ ۱۴۱۔ جناب امیر المومنین فرماتے ہیں۔

"پس جس نے خالق کی حد قرار دی اس نے کتاب اللہ ناطق سے کفر کیا"۔

یہ حدیث مبارکہ بھی وحدت صفات پر دلالت کرتی ہے۔ گذشتہ حدیث میں آپ نے اپنی بات کے رد کرنے کو اللہ کی بات کا رد کرنا قرار دیا تھا۔ اس حدیث میں وہی بات ترتیب معکوس کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ یعنی جس نے اللہ کی حد قرار دی تو اس نے کتاب اللہ ناطق یعنی ذات مرتضوی سے کفر کیا۔ مراد یہ ہے کہ جب مظہر لامحدود ہے تو مظہر کیونکر محدود ہو سکتا ہے؟

۶۔ مفاتیح الجنان صفحہ ۸۲۰۔ زیارت امام حسین کا ایک جملہ۔

"آپ کے ذریعے زمین درختوں کو اگاتی ہے۔ آپ ہی کے ذریعے زمین اپنے خزانے ظاہر کرتی ہے۔ آپ کے ذریعے سے آسمان سے بارش اور رزق نازل ہوتا ہے۔ آپ کے ذریعے سے خدا مصیبت دور کرتا ہے۔ اللہ کی تقدیریں آپ کے دلوں میں ڈالی جاتی ہیں۔ وہ آپ کے گھروں سے جاری ہوتی ہیں اور وہ فیصلے نافذ ہوتے ہیں جو خدا اپنے بندوں کے بارے میں کرتا ہے۔"

یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ جن جن افعال کو اللہ اپنی طرف منسوب کرتا ہے وہ تمام کے تمام ان مقدس ہستیوں کے ہاتھ سے ظاہر ہوتے ہیں اور اسی طرح ان افعال کو دونوں طرف منسوب کیا جا سکتا ہے اور کیا جاتا ہے یعنی اللہ کی طرف بھی اور ان کی طرف بھی جو ان افعال کے مظہر ہیں۔ آنے والی حدیث سے یہ بات بالکل واضح ہو جائے گی۔

۷۔ کوکب دری صفحہ ۳۵۔ حضرت امیر المومنین اس حدیث میں اپنی ایک ایک صفت بیان فرماتے ہیں اور پھر اس صفت کے معنی و مفہوم کی بھی وضاحت فرماتے ہیں۔ اس سے ہم پوری حدیث کا ایک ایک جملہ الگ الگ کر کے آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں تاکہ یہ بات الگ الگ آپ کے ذہنوں تک پہنچ جائے۔

(الف) "میں وجہ اللہ ہوں۔ میری طرف متوجہ ہونا اللہ کی طرف رخ کرنا ہے"۔

کسی بھی شے کی طرف توجہ کرنے یا کسی طرف رخ کرنے کے لیے اس شے کا تعین مطلق ضروری ہے اور پھر اسی تعین کے تحت اس کا تصور کرنا ایک لازمی امر ہے بغیر اس شے کی طرف نہ تو رخ کیا جا سکتا ہے اور نہ توجہ۔ انسان کی اس مجبوری کو دیکھتے ہوئے بوقتِ نماز مغرب کی طرف رخ کرنے کا حکم دیا گیا ہے لیکن آج تک اس بات پر غور نہیں کیا گیا کہ پتھروں اور سیمنٹ سے بنے ہوئے ایک حجرے کی طرف رخ کرنے سے کوئی اللہ کی طرف کیونکر متوجہ ہو سکتا ہے؟ اور کوئی یہ سمجھ کر مغرب کی طرف رخ کرتا ہے کہ وہی تو اللہ کا گھر ہے تو ایسا شخص تو اسلام سے ہی خارج ہو گیا کیونکہ اللہ حدود زمان و مکان سے باہر ہے۔ اور وہ اس بات کا اظہار کیا ہے کہ اللہ ہر جگہ موجود ہے تو پھر اس میں مغرب کی کیا خصوصیت ہوئی؟ بلکہ اللہ تو فرماتا ہے کہ ”میں مومن کے دل میں رہتا ہوں“ تو کیوں نہ وقتِ نماز اپنے دل کی طرف رخ کیا جائے؟ کاش کبھی کوئی مجھ سے یہ بات پوچھ لیتا تو خود مجھ سے آواز آتی کہ ”اے بندگانِ خدا! میں تو صرف ایک صدف ہوں۔ میرا گوہر کوئی اور ہے۔ میں صرف ایک مکان ہوں۔ میرا مکین کوئی اور ہے۔ میں تو صرف ایک مجاز ہوں میری حقیقت کوئی اور ہے۔ میں تو صرف ایک ملکیت ہوں میرا مالک کوئی اور ہے۔“ اس موقعے کے لیے بندۂ علی ابن ابی طالب یعنی غالب مرحوم نے کہا تھا۔

جب پردے سے حد اور رنگ سے اپنا جلوہ

قبلے کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

یعنی کعبہ قبلہ نہیں ہے بلکہ قبلہ کوئی اور ہے جس کی طرف کعبہ اشارہ کرتا ہے۔ متوجہ کی طرف ہوتا ہے نہ کہ پشت کی طرف۔ اسی حقیقت کو میرے مولا نے بیان فرمایا ہے کہ کسی کی طرف توجہ اسکے چہرے کے ذریعے کی جاتی ہے اور جان لو کہ میں ہوں اللہ کا چہرہ وہ جس طرف میرے دوستدار رخ کرتے ہیں۔ جانا جا سکتا ہے کہ اگر اللہ حجابِ بشریت میں آ سکتا ہے تو وہ کیسا ہوگا؟۔

(ب)۔ ''میں ہی جنب اللہ ہوں۔ مجھ تک پہنچنا اللہ کے پہلو میں بیٹھنا ہے اور منتہائے قرب پر پہنچانا ہے''۔

مولا کے اس فرمان سے ایک انتہائی اہم مسئلہ حل ہوگیا کیونکہ بڑی سے بڑی عبادت سے لیکر چھوٹی سے چھوٹی عبادت تک یہاں تک کہ انسان کے ایک ایک عمل کے پس پردہ ایک نیت ہوتی ہے جسکے بغیر ہر عمل اور ہر عبادت ایک فعل عبث ہوتی ہے اور وہ نیت ہے ''قربۃً الی اللہ''۔ اور اس حدیث سے معلوم ہوگیا کہ اللہ کے قرب کے معنی کیا ہیں۔ انسان کو سارا قصد کرنا ہے کہ علیؑ تک پہنچ جائے۔ علیؑ تک پہنچا تو گویا اللہ کے پہلو میں بیٹھ گیا حالانکہ بیٹھا علیؑ کے پہلو میں ہے۔ اور یہی وحدت صفات ہے۔ منتہائے قرب کی وضاحت کے لئے ہم عرض کرتے ہیں کہ جب آپ حیدرآباد سے کراچی

آتے ہیں تو سڑک پر سنگِ میل لگے ہوتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا رہتا ہے کہ راولپنڈی ابھی کتنے فاصلے پر ہے۔ لیکن آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب آپ راولپنڈی کی حدود میں داخل ہو جاتے ہیں اس وقت بھی سنگِ میل بتاتا ہے کہ آپ راولپنڈی سے ابھی پچیس کلومیٹر دور ہیں۔ آپ راولپنڈی کے اندر سفر کرتے رہتے ہیں لیکن یہ سنگِ میل ختم نہیں ہوتے بلکہ فاصلہ کم ہوتا رہتا ہے۔ یہ فاصلہ اس وقت ختم ہوتا ہے جب آپ [illegible] پر پہنچتے ہیں۔ وہاں ایک سنگِ میل لگا ہوا ہے جس پر لکھا ہے۔ "راولپنڈی زیرو کلومیٹر"۔ ہمارے شاہوں والے اسی اصول پر اپنے شاہوں کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ جن میں کتنی قربت ہے اور یہ اس وقت نصیب ہوتی ہے جب انسان کمال تک پہنچ جائے اور اسی وقت انسان کو شعور حاصل ہوتا ہے کہ اللہ کون ہے اور کتنی قربت یہ شے ہے اور یہی "مسلوبِ فی ذاتِ اللہ" کا مطلب ہے۔ اس سے پہلے آپ یہ بھی پڑھ چکے کہ آنجناب نے خود کو اللہ والا کہا ہے۔

امیر خسرو نے مستی کے عالم میں ایک شعر کہا تھا۔

خدا خود میرِ مجلس بود اندر لامکاں خسرو
محمد شمعِ محفل بود شب جائے کہ من بودم

اس رات میں ایک ایسے مقام پر تھا کہ جہاں لامکاں میں صدرِ مجلس خود اللہ تھا اور محمدؐ شمعِ محفل کی طرح درخشاں تھے۔

اللہ ہی جانتا ہے کہ امیر خسرو نے کس مقام پر پہنچ کر یہ شعر کہا تھا اور یہاں اللہ سے کلی

گیا مرحلہ ہے چونکہ "امکان" ختم ہونے کے باوجود بھی وہ ایک مقام کا ذکر ضرور کررہے ہیں۔ ہمارے لئے ممکن نہیں ہے کہ ہم اس مرحلے پر اس شعر کی وضاحت کرسکیں چونکہ ابھی ہم ابتدائی مراحل طے کررہے ہیں۔ مناسب مقام پر ہم انشاء اللہ نسبتاً زیادہ تفصیل کے ساتھ گفتگو کرسکیں گے اور بتاسکیں گے کہ "مقام اللہ" سے کیا مراد ہے۔

(ج)۔ "میں یہ کہتا ہوں۔ جو کچھ وہ (اللہ) کرتا ہے۔ مجھ سے کرتا ہے۔ جو کچھ کہ سے صادر ہوتا ہے میرے ہاتھ سے ہوتا ہے۔ میں کرتا ہوں اور اس کا کہا جاتا ہے"۔ اب بھی کوئی نہ سمجھے تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں لیکن اب یہ بات کسی کے لئے ممکن نہ رہی کہ وہ کہہ سکے کہ "یہ کام اللہ نے کیا ہے اور وہ کام مخلوق نے کیا ہے"۔ اور یہ بات روز روشن کی طرح ثابت ہوگئی کہ اللہ کا کرنا ہمارے فہم و ادراک سے بالا ہے چونکہ جو کچھ مخلوق کرے اس کو ہم کہتے ہیں کہ اللہ نے کیا ہے۔ اسکے باوجود یہ لفظ "اللہ" نہ تو مخلوق کو خدا بناتا ہے اور نہ خدا کو مخلوق بناتا ہے۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ حقیقتیں جدا جدا ہونے کے باوجود دونوں کے لئے ایک ہی لفظ استعمال ہورہا ہے یہ درست ہے کہ تحقیقی تو معنوی پر دلیل نہیں ہوا کرتا۔ اس بات پر وہی معترض ہوگا جو مخلوق کی پرستش کرتا ہو اور حقیقت سے بےخبر ہو۔ یہ مقام وحدت ہے یہاں عبد و معبود میں تفریق کرنا محض بدگمانی بن جاتا ہے۔ جس انسان نے اس حقیقت کو سمجھ لیا وہ شرک کی لعنت سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے پاک ہوگیا اور جو اس مقام پر اٹک گیا وہ شیطان کا قیدی بن

یہ کیونکہ اس مضمون کا شان ہی اللہ اور خلق میں تفریق ڈالتا ہے۔

(۱۰)۔ ''میں عین اللہ ہوں۔ اس (اللہ) کی آنکھ سے عالم کو دیکھتا ہوں اور دیدہ میں ایسے ہی ہے جیسے کہ آنکھ میں تل''۔

اللہ کی آنکھ سے دیکھنے کا مطلب کیا ہے؟ اللہ جب اشیائے عالم کو دیکھے گا تو کیسے دیکھے گا؟ ان سوالات پر جب ہم غور کرتے ہیں تو عقل سلیم ہمیں بتاتی ہے کہ اللہ جب عالم کون و مکاں کو دیکھے گا تو اسی طرح دیکھے گا جیسے۔

خالق اپنی مخلوق کو دیکھتا ہے۔

رب اپنے مربوب کو دیکھتا ہے۔

مالک اپنے مملوک کو دیکھتا ہے۔

قادر اپنے مقدور کو دیکھتا ہے۔

واجب ممکن کو دیکھتا ہے۔

معبود اپنے عبد کو دیکھتا ہے۔

مسجود اپنے ساجد کو دیکھتا ہے۔

غنی محتاج کو دیکھتا ہے۔

پس خالق کی نظر سے پوری کائنات کو دیکھتا ہے یعنی وہ اللہ کی آنکھ ہے۔

(۱۱)۔ ''میں قرآن ناطق اور زبان صادق ہوں۔ میں وجود حق اور دلیل وجود حق ہے۔ میں نقطہ تحت الباء ہوں جس میں کل کتاب جمع ہے''۔

یہاں ہم ''ناطق'' کے بارے میں ایک مختصر گفتگو کریں گے کیونکہ ''نطق'' کی حقیقت سے کم لوگ واقف ہیں۔ نطق کہتے ہیں اس قوت کو جس سے کلیات تشکیل دیئے جاتے ہیں اور اسی اعتبار سے انسان کو حیوان ناطق کہا جاتا ہے۔ یہاں ناطق سے مراد ''بولنے والا'' نہیں ہے۔ لوگ اگر یہ سمجھتے ہیں کہ جانور گونگے ہیں تو بالکل غلط سمجھتے ہیں بلکہ عین ممکن ہے کہ خود جانور انسان کو گونگا سمجھتے ہوں۔ ہر جانور بولتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم انکی زبان نہیں سمجھتے اور اسی بناء پر انہیں گونگا سمجھتے ہیں۔ لیکن جو مقدس ہستیاں انکی زبان سمجھتی ہیں وہ انکی بات بھی سنتی ہیں اور انکو انہی کی زبان میں جواب بھی دیتی ہیں اور تاریخ کے اوراق اسکے شاہد ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ کائنات کی ہر شے زبان رکھتی ہے اور بات کرتی ہے چنانچہ سورہ بنی اسرائیل کی آیت ۴۴ میں ارشاد ہوتا ہے ''ساتوں آسمان اور زمین اور جو کچھ ان میں ہے اس (اللہ) کی تسبیح کرتے ہیں اور کوئی چیز ایسی نہیں جو حمد کے ساتھ اسکی تسبیح نہ کرتی ہو لیکن تم انکی تسبیح کو نہیں سمجھتے ہو''۔ لہذا ''حیوان ناطق'' سے مراد ''بولنے والا حیوان'' ہرگز نہیں ہے بلکہ وہ حیوان ہے جو قوت نطق رکھتا ہو اور کلیات بناتا ہو۔ مثلاً پرندے اپنے گھونسلے جس طرح آج سے دو ہزار سال قبل بناتے تھے بالکل ویسے ہی آج بھی بناتے ہیں کیونکہ ان میں ارتقاء کی ذہنی قوت مفقود ہے جبکہ انسان پہلے غاروں میں رہتا تھا لیکن ترقی کرتے کرتے آج کئی کئی منزلہ عمارات میں رہتا ہے۔ اس طرح پانی کی یہ فطرت ہے کہ وہ ہمیشہ نیچے

کھینچ کر رکھتا ہے۔ پانی کی یہ خاصیت جانور بھی دیکھتا ہے اور انسان بھی لیکن جانور اس سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکا کیونکہ اسکے پاس نفس ناطقہ نہیں ہے جو آیات بنا سکے۔ لیکن انسان نے اس سے علمی تشکیل کیا اور اسکی مدد سے بلند و بالا مکانات میں بھی پانی پہنچایا۔ پس عقل والا صرف متن تک محدود نہیں رہتا بلکہ اس سے آیات تشکیل دیکر اس سے ہزاروں فائدے خود بھی حاصل کرتا ہے اور دوسروں کو بھی پہنچاتا ہے۔ یہیں سے کتاب ناطق کے معنی سمجھ میں آتے ہیں۔ یہاں سمجھے کہ کتابیں دو ہیں۔ ایک کتاب تو وہ ہے جسکے بارے میں ارشاد ہوتا ہے۔ "کوئی خشک و تر ایسا نہیں جو کتاب مبین میں نہ ہو"۔ (انعام ۵۹)۔ یہ قرآن ہے جو اللہ کی کتاب قولی ہے۔ اور دوسری کتاب وہ ہے جسکے بارے میں روم ۵۶ میں ارشاد ہوتا ہے۔ "اور جن لوگوں کو علم اور ایمان دیا گیا ہے وہ کہیں گے کہ یقیناً تم اللہ تعالی کی کتاب میں جی اٹھنے کے دن تک رہے ہو"۔ اس سے مراد کائنات ہے جو اللہ کی کتاب فعلی ہے۔ پس جو کتاب اللہ کا ناطق ہوگا وہ دونوں کتابوں کے حقائق پر محیط اور اسکے آیات و تجزیات پر متصرف بھی لائق ہوگا۔ پس اسی کا حق ہے کہ کتاب قولی کی تفسیر کرے اور اس سے لوگوں کے لئے فائدہ مند بنائے کیونکہ وہی اسکے اسرار اور حقائق علمیہ کا عالم ہے اور وہی ہے جو مشیت متکلم کو جانتا ہے لہٰذا اس کا قول قرآن مجید کی سند بنتا ہے اور اسکی تفسیر کے بغیر قرآن قرآن ہی نہیں رہتا بلکہ ایک جسد بے روح بن جاتا ہے جس طرح نفس

ناطقہ کے بغیر جسم بیکار ہو جاتا ہے اسی طرح صرف اسے ہی حق ہے کہ وہ کائنات میں جس طرح چاہے تصرف کرے یعنی وہ کائنات کی روح بھی ہے وہ نفس ناطقہ بھی اور وہ پلک جھپکنے کی مدت کے لئے بھی غائب ہو جائے تو پوری کائنات معدوم ہو کر رہ جائے اور یہی مذہب شیعہ اثنا عشریہ کا عقیدہ ہے۔

الولایۃ اللہ

ولایت وہ شے ہے جس کو بیان کرنے کیلئے، سننے کیلئے اور برداشت کرنے کیلئے پہاڑ جیسا مضبوط دل، ماننے والا سینہ اور ایسی زبان کی ضرورت ہے جو "لسان صدق علیا" سے منسوب ہو اور اسی سے نسب انوار رزق ہو۔ یہ وہ مقام ہے جہاں کائنات کی تمام حقیقتیں ضم ہو کر سامنے آجاتی ہیں۔ یہی وہ کلید ہے جس سے اسرار توحید کے عقدے کھلتے ہیں اور یہی وہ راز ہے جس کو جانے بغیر انسان اقرارِ توحید کرنے کے باوجود بت پرستوں کے زمرے میں شامل رہتا ہے۔ یہ وہ راہِ صدق ہے جس کے بغیر دین و مذہب محض ایک رسم و رواج اور ایک کھیل تماشے سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ اسی لئے مصنف نے فرمایا ہے۔ "الدین ہو الولا یۃ" یعنی دین فقط اور فقط ولایت ہے۔ ولایت سے ہٹ کر دین کوئی شے ہی نہیں۔ یہی سبب ہے کہ وہ لوگ جو دنیا کے متوالے، خیالی خدا کی پرستش کے حریص اور حقیقت دین سے بیزار ہوتے ہیں انہیں ولایت کے نام سے وحشت ہوتی ہے اور کوئی عجب نہیں کہ اگر ان کے سامنے حقائق ولایت مکمل طور پر بیان کر دیئے جائیں تو ان کے دل نازک پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ لہٰذا ہم بھی یہ حقائق انتہائی محتاط طریقے سے بیان کریں گے چونکہ کسی کو تکلیف پہنچانا بہر حال ہمارا مقصود نہیں۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ جو صاحبان بصیرت ہونگے وہ ہمارے چھوٹے نکتے کو بہت جانیں گے اور

حق ادا کرنا تمہارے لئے چنداں مشکل نہ ہوگا۔

وسیلہ

یہ ایک حقیقت ہے کہ عقل انسانی اگر کسی انداز سے خدا کا ادراک کرتی ہے تو اس کا واحد ذریعہ وسیلہ خود انسان کے مشاہدات ہوتے ہیں جن کے ذریعے وہ کائنات میں بکھری ہوئی اشیاء میں ہم آہنگی تلاش کرتا ہے اور عرفانیات کی زبان میں "کثرت میں وحدت" کو ڈھونڈتا ہے۔ یہ مشاہدات ہی ہیں جو حواس اشیاء کو جاننے کی تحریک پیدا کرتے ہیں اور انسان کسی شے کو بھی جانتا ہے تو اپنے حواس کے حوالے سے ہی جانتا ہے۔ اور یہ حواس کی ہی قوت ہے جو انسان کی رہنمائی کرتے ہیں جو حقیقت خواص و ادراک موجودات ہے۔ اور یہ انسان کی قوت کو خدا کا ادراک کرنے کی پر مشتمل ثابت کرتا ہے۔ ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ انسان کی عقل کی حد یہ ہے کہ وہ خالق کا ادراک کرے لیکن خالق کا تعین کرنا انسانی عقل کے بس کی بات نہیں اور خود تاریخ عالم ہماری بات پر دلیل قاطع ہے۔ بہرحال یہ حقیقت ہے کہ تعین خالق کے مسئلے پر انسان کبھی بھی متفق نہیں ہوسکا اور مختلف انسانی گروہوں نے ہر دور میں خالق سے مراد مختلف اشیاء کو لیا ہے۔ خدا ایک واحد کو ماننے والے اگرچہ بظاہر متحد الخیال نظر آتے ہیں لیکن حقیقتاً تصورات خدا میں بھی ایک وسیع خلیج موجود ہے اور یونان کے دیوتا آج بھی کئی توحیدی مذاہب میں رچے بسے ہوئے ہیں۔ خود

مسلمانوں کے درمیان اس مسئلے پر بے پناہ اختلافات پائے جاتے ہیں۔ اور یہ آج کی بات نہیں ہے بلکہ خود دور اول، اصحاب رسول اس معاملے میں مختلف الخیال تھے اور ان میں ایسے لوگ قابل ذکر تعداد میں موجود تھے جو رویت باری تعالیٰ کے قائل تھے۔ اسی نظریے کو ابن تیمیہ نے فروغ دیا۔ ابن بطوطہ اپنے سفرنامے میں لکھتا ہے کہ "ایک مرتبہ مجھے ابن تیمیہ کے درس میں شامل ہونے کا اتفاق ہوا۔ وہ منبر پر بیٹھے ہوئے بیان کر رہا تھا کہ ہر شب جمعہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے حالات کی خبر لینے کے لئے آسمان سے زمین پر اترتا ہے۔ سامعین میں سے کسی نے پوچھا کہ کیسے اترتا ہے؟ تو ابن تیمیہ نے منبر کی پہلی سیڑھی تک اتر کر بتایا کہ ایسے اترتا ہے"۔

بہت سے مسلمان علماء نے اللہ تعالیٰ کا حلیہ بشری بھی بیان کیا ہے۔ انتہا یہ کہ ان میں سے ایک نے یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ اس نے سو مرتبہ اللہ سے بالمشافہ ملاقات کی تھی اور یہ بات اسکے فضائل کے دوران آج بھی بیان کی جاتی ہے۔ کچھ لوگ اسکے بھی قائل ہوئے کہ دنیا میں تو اللہ کی رویت ممکن نہیں ہے لیکن قیامت میں اسکا دیدار ضرور ہوگا اور اس مدعا کیلئے قرآن کی ایک آیت کو دلیل بناتے ہیں۔ موجودہ دور کے شیعہ علماء بھی اس معاملے میں اگرچہ زبانی حد تک متفق نظر آتے ہیں لیکن رویے کے اعتبار سے ان کی توحید اور وہابیوں کی توحید میں کوئی فرق نہیں۔ اور ان تمام اختلافات پر غور کیا جائے تو یہ حقیقت منکشف ہوگی کہ یہ جھگڑے پیدا ہی اس لئے ہوئے کہ اس بات کو فراموش کر دیا گیا کہ تعیین خدا حد و تعالیٰ سے بالا ہے اور انسان جب بھی ان امور پر

اپنی عقل کے بل بوتے پر غور کرے گا تو ہمیشہ ناکام ہوگا۔ ناکام ہو کر ٹھوکر کھائے گا اور ٹھوکر کھا کر گمراہی میں جا پڑے گا جہاں ایک ٹھوکر کھانے والا پہلے سے ہی موجود ہے اور یہ تازہ وارد آنے والے کو خوش آمدید کہتا ہے۔

اس تمام بحث کی تان یہ ہے کہ معرفت خدا کے باب میں ایک اہم شئے کو نظر انداز کیا گیا۔ اس سے غفلت برتی گئی اور اس کی تفہیم میں تشکیک کی جو کلید توحید ہے اور جس کے بغیر توحید کوئی شے ہی نہیں۔ اور وہ ہے "وسیلہ"۔

مجھے نہیں معلوم کہ کتنے لوگ میری بات کو سمجھیں گے لیکن حقیقت یہی ہے کہ اللہ کی ذات میں شرک ہوتا ہی نہیں، ہو ہی نہیں سکتا ہے۔ شرک ہمیشہ وسیلے میں ہوتا ہے اور اسی کو خدا کے ساتھ شریک کرنا کہتے ہیں۔ جو لوگ بتوں کی پرستش کرتے ہیں وہ بھی ان بتوں کو خدا نہیں سمجھتے بلکہ وسیلہ سمجھتے ہیں اور یہی بات انکو مشرک بناتی ہے کہ اللہ کے بتائے ہوئے وسیلے کو چھوڑ کر انھوں نے خود ہی وسیلہ بنا لیا۔ ایسے لوگوں کے بارے میں سورۂ زمر کی تیسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے۔ "اور جن لوگوں نے اس کے سوا اوروں کو ولی بنا لیا ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم ان کی عبادت نہیں کرتے ہیں مگر اس لئے کہ یہ ہمیں اللہ تعالیٰ سے قریب کر دیں"۔

اس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ وسیلے کے لئے ولی ہونا لازمی ہے۔

ہم چونکہ توحید کے حوالے سے بات کر رہے ہیں اس لئے یہ بات ذہن میں

رہنی چاہئے کہ وسیلہ صرف ایک ہی ہوتا ہے۔ جو کہ بندے کو خدا سے ملتی ہے وہ ازروئے قرآن صراط مستقیم ہے۔ جیسا کہ سورہ حجر آیت ۴۱ میں ارشاد ہوتا ہے: "یہی وہ صراط مستقیم ہے جو مجھ تک پہنچتا ہے"۔ (اس آیت کا ترجمہ ہم نے قرآن سے لکھا ہے لیکن مفسرین سے جو کچھ منقول ہے وہ یہ ہے کہ "علی ہی وہ صراط مستقیم ہے جو مجھ تک پہنچتا ہے")۔ اور جیسا کہ ہم اور آپ ہر نماز میں دعا مانگتے ہیں کہ پروردگار ہمیں صراط مستقیم پر قائم رکھ۔

"خط مستقیم" کے معنی جو ریاضی دانوں نے بیان کئے ہیں وہ یہ ہیں کہ "دو نقطوں کے درمیان کم سے کم فاصلے کو خط مستقیم کہتے ہیں"۔ لہذا عقلی اعتبار سے خط مستقیم ایک ہی ہوتا ہے اور یہی علم ریاضی کا اصول ہے۔ پس صراط مستقیم بھی ایک ہی ہے اور چونکہ صراط مستقیم وسیلہ ہے اس لئے وسیلہ صرف ایک ہی ہوتا ہے۔ باقی تمام وسیلے اس وسیلے کے وسیلے ہیں۔ یعنی باقی تمام وسیلے خدا کے اس وسیلے تک پہنچاتے ہیں اور یہ وسیلہ اللہ تک پہنچاتا ہے۔ اسی لئے قرآن میں جہاں اللہ نے وسیلہ تلاش کرنے کا حکم دیا وہاں صیغہ واحد کا استعمال کیا اور فرمایا: "وابتغوا الیہ الوسیلہ" یعنی اللہ کی طرف جانے کے لئے ایک خاص وسیلہ تلاش کرو۔ اور نہیں فرمایا کہ "وابتغوا الیہ الوسائل" یعنی اللہ کی طرف جانے کے لئے بہت سے وسیلے تلاش کرو۔ اللہ نے اپنے بندوں کی ہدایت کے لئے سلسلہ نبوت کو جاری فرمایا اور

تمام علماء اس بات پر متفق ہیں کہ نبوت ظاہر ہے اور اس کا باطن ولایت ہے۔ تفسیر صافی صفحہ ۳۵۵ پر آیت "اولوا العلم قائماً بالقسط" (صاحبان علم جو عدل پر قائم ہیں) کی تفسیر کرتے ہوئے امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں۔ "عدل ظاہری سے مراد محمدؐ کی ذات ہے اور عدل باطنی سے علی ابن ابی طالب مراد ہیں"۔ لہذا نبی کا منصب و فریضہ ہے باطن کو ظاہر کرنا یعنی ولایت علی کی تبلیغ کرنا ہے۔ چنانچہ تفسیر فرات صفحہ ۳۵۹ پر یہ ارشاد معصوم موجود ہے کہ "جب اللہ کا بندہ (محمدؐ) عبادت سے فارغ ہو جاتا ہے تو علی کی ولایت کی طرف لوگوں کو بلاتا ہے"۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ نبیوں کی عبادت یہی ہے کہ وہ مخلوق خدا کو ولایت علی کی طرف دعوت دیں۔

ولایت وہ شے ہے جو ہر شعبہ حیات میں جاری و ساری ہے اور جس کے بغیر نظام حیات چل ہی نہیں سکتا۔ اسی لئے ولایت کے مختلف درجات ہیں اور جب تک ایک کی ولایت کو دوسرے کی ولایت سے تمیز کر کے نہ دیکھا جائے اور ان کے درمیان حد تمیز نہ کھینچی جائے اس وقت تک ولایت سمجھ میں آ ہی نہیں سکتی اور اس بارے میں جتنے شکوک و شبہات اور جتنی الجھنیں پیدا ہوتی ہیں ان کا سبب یہی عدم تمیز ہے۔ عام روش یہی ہے کہ ولایت اور مختلف خدائی عہدوں کو ایک دوسرے کا مترادف سمجھ لیا ہے حالانکہ ولایت ان چیزوں سے ماوراء ہے۔ یہ بات قطعی حتمی ہے کہ اللہ ایک ہی صفت کے ہوتے ہوئے کسی دوسری صفت کو اختیار نہیں کر سکتا۔ اللہ نے زندگی خود دی

کہا اور نہ امام کہا کیونکہ یہ دونوں عہدے ہیں جو اللہ خود اپنے بندوں کو عطا کرتا ہے۔ اس کے برخلاف اس نے خود کو ولی کہہ کر متعارف کرایا جس کا مطلب یہی ہے کہ ولایت کوئی عہدہ نہیں بلکہ ایک اعلیٰ ترین مقام کا نام ہے اور علم، قدرت، تصرف کلی کی علامت ہے۔ آپ اگر بنظر انصاف دیکھیں تو ہم اللہ کے بارے میں جتنی چیزیں جانتے ہیں وہ اس کی ولایت ہی کے حوالے سے جانتے ہیں خالقیت، رازقیت، رحمانیت، رحیمیت، غفاریت، مجیبیت، یہ سب اس کی صفات ہیں جن کے ذریعے سے ہم اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور اس کی عبادت کرتے ہیں۔ لیکن اللہ کی تمام صفات تحت ولایت ہیں کیونکہ اس کی ہر صفت کا تعلق اس کے علم، قدرت، تصرف سے ہے اور یہی ولایت ہے۔ لہٰذا جب تک ولایت خدا ہماری سمجھ میں نہیں آتی اس وقت تک ہم توحید سے بے بہرہ رہیں گے اور ہمارا ایمان باللہ کا دعویٰ بے حقیقت رہے گا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ پہلے ولایت خدا کو جانا جائے اور ولایت خدا اس وقت تک سمجھ میں نہیں آسکتی جب تک وہ ہمارے مشاہدے میں نہ آئے اور مشاہدے میں آنے کے لئے ایک ولی خدا کا وجود لازمی ہے جس سے ولایت خدا کا ظہور ملے۔ یہی ولی خدا کی معرفت توحید ہوتی ہے۔

درجات ولایت

اللہ نے اپنی ولایت کا تعارف کرانے کے لئے اور اسے مشاہدے میں لانے کے لئے

ہر شخص انسانی کو ولایت میں سے کچھ نہ کچھ حصہ ضرور عطا فرمایا ہے تاکہ انسان درجہ بہ درجہ ولایت کا مشاہدہ کر سکے اور مختلف ولایات میں تمیز قائم کر سکے ورنہ حضرت عبدی ولایت کو پہچان کر اس پر ایمان لا سکے۔ ہم اجمالی طور پر ان مختلف ولایات کا جائزہ لیتے ہیں تاکہ ولایت کے بارے میں آئندہ آنے والے حقائق میں کوئی اشتباہ پیدا نہ ہو لیکن یہ بہر حال واضح رہنا چاہئے کہ ولایت ہمیشہ وہبی ہوتی ہے ورثے سے نہیں مل سکتی جو لوگ تصوف و عرفان سے متعلق ہیں ان کا دعویٰ یہ ہے کہ ارتکاز توجہ و مراقبہ اعمال و افعال بجالا کر ولایت کسب کی جا سکتی ہے۔ لیکن یہ ایک غلط فہمی ہے جسے دور ہو جانا چاہئے کیونکہ یہ ولایت نہیں بلکہ کمال ہے جو مختلف جسمانی، ذہنی اور روحانی ریاضات سے حاصل ہو جاتا ہے اور کوئی بھی شخص بلا تفریق مذہب و ملت کچھ ریاضت و محنت کر کے یہ کمالات حاصل کر سکتا ہے چنانچہ ایسے صاحب کمال آپ کو تمام مذاہب میں مل جائیں گے۔ کوئی کتنی بھی عبادت و ریاضت کر لے لیکن پھر بھی حضرت حسن قادری کی برابری نہیں کر سکتا۔ ہمیں بتایا جائے کہ کیا حضرت حسن نے کبھی کوئی چلہ کاٹا تھا؟ یا کبھی انہیں کسی قسم کی عملیات و ریاضات میں مشغول پایا گیا تھا؟ یا کبھی وہ مراقبے میں بیٹھے ہوئے دکھائی دیے تھے؟۔

جو درجات ولایت بیان کئے جا رہے ہیں ان کا مطالعہ فرمانے سے قبل یہ بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ یہ کوئی کتابی چیز نہیں ہے بلکہ اس درجہ بندی کی بنیاد خالصتاً مشاہدے پر رکھی گئی ہے اور ان درجات کے نام بھی مشاہدے ہی کی مناسبت سے

تجویز کئے گئے ہیں۔ یہ ایک تجزیہ ہے جو قدرتی انتہا تک بلند تر ہے۔

ولایت فطری

ہر انسان اپنے اپنے مقام پر ولایت کا حامل ہے یہ کم سے کم ولایت جو ایک انسان کو حاصل ہوتی ہے وہ اپنے جسم اور اعضاء و جوارح پر اس کا تصرف ہے۔ لیکن یہ ولایت کبھی کبھی منقطع بھی ہو جاتی ہے۔ اگر انسان کا کوئی عضو بیکار ہو جائے مثلاً ہاتھ پاؤں مفلوج ہو جائیں یا آنکھیں ضائع ہو جائیں یا کان بہرے ہو جائیں تو پھر اس عضو پر انسان کا تصرف باقی نہیں رہتا۔

ولایت شرعی

یہ وہ ولایت ہے جو انسان از روئے شریعت حاصل کرتا ہے۔ مثلاً باپ بیٹی کا ولی ہوتا ہے یا باپ کی وفات کے بعد بیٹا ولی ہوتا ہے یا کوئی کسی یتیم بچے کو اپنی کفالت میں لے لے تو وہ اس کا ولی ہوتا ہے۔ یہ ولایت اگرچہ عام ہے لیکن عموماً صرف ان لوگوں کو حق ہے جو دین اسلام میں داخل ہوں اور شریعت محمدی کے دائرے میں آتے ہوں۔ یہ ولایت بھی مستقل نہیں ہوتی اور بعض حالات میں منقطع ہو جاتی ہے مثلاً جب بیٹی کی شادی ہو جائے تو اس پر سے باپ کی ولایت اٹھ جاتی ہے اور اگر بیٹا عاق ہو جائے تب بھی یہی صورت ہوتی ہے۔ اسی طرح جب یتیم بالغ ہو جائے اور اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے تو اس سے سرپرست کی ولایت ساقط ہو جاتی ہے۔

ولایت ظنی

ولایت کا تیسرا درجہ وہ ہے جو محبت سے حاصل ہوتا ہے۔ جب دل میں ولی خدا کی محبت رچ بس جاتی ہے تو انوارِ ولایت اسکے دل پر وارد ہونے لگتے ہیں اور تجلیات ولایت اسکے بندوں سے ظاہر ہونے لگتی ہیں اور یہ ولی خدا کا تصرف و عطا ہوتی ہے نہ کہ اپنی ذاتی کوشش۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں سورہ یونس ۶۲ میں ارشاد خداوندی ہوتا ہے: "الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیہم ولا ہم یحزنون" (جو کام ہو چکے کی پشیمانی ہو یا جو ہونے والے ہیں ان پر خوف ہوتا ہے اور حزن)۔

اس ولایت کے ظنی ہونے کی دلیل لفظ خوف اور حزن ہیں کیونکہ خوف جہل کی بنا پر پیدا ہوتا ہے اور ولایت خدا ہر قسم کے جہل سے منزہ ہوتی ہے۔ اور حزن پچھتاوے کو کہتے ہیں اور پچھتاوا ہمیشہ غلط کام پر ہوتا ہے اور ولایت خدا معصیت کی نفی ہے۔ ان میں مقدس حضرت سلمان فارسی، حضرت ابوذر، حضرت میثم تمار اور حضرت بلال وغیرہ شامل ہیں۔

یہ ولایت بھی منقطع ہو سکتی ہے مثلاً کسی کے دل میں لالچ یا خود پسندی پیدا ہو جائے یا پھر وہ اپنی ولایت کو حصول دنیا کے لئے استعمال کرنے لگے تو ایسی حالت میں ولایت سلب کر لی جاتی ہے اور اس سلسلے میں بلعم باعور کی مثال ہمارے سامنے ہے جس کو اللہ نے اسقدر کرم سے نوازا کہ اسے اسم اعظم عطا فرما دیا لیکن

جب کسی نے دنیاوی تاریخ میں آخر مقدس ذاتوں یعنی حضرت موسیٰ اور حضرت داؤد سے غداری کی تو اللہ نے اس سے یہ اسم اعظم سلب کر لیا۔

ولایت الٰہیہ صغریٰ

ولایت کا چوتھا درجہ توسلی و قربی ہے جو معصومین کی اولاد خیر اور امہات المعصومین کے لئے مخصوص ہے۔ یہ ولایت ائمہ کی ولایت سے متصل ہوتی ہے اور کبھی منقطع نہیں ہوتی۔ اس ولایت سے وابستہ ہونے والے ولایت معصومہ سے ملحق ہو جاتے ہیں اور درمیان میں کوئی تفریق حائل نہیں رہتی۔ ان ہستیوں میں جناب آمنہ، جناب خدیجۃ الطاہرہ، جناب فاطمہ بنت اسد، جناب شہر بانو اور دیگر امہات ائمہ، جناب زینب کبریٰ، حضرت عباس علمدار، حضرت علی اکبر، حضرت علی اصغر، حضرت قاسم اور حضرت سید محمد جیسی مقدس اور بلند پایہ ہستیاں شامل ہیں۔

ولایت الٰہیہ کبریٰ

ولایت کا پانچواں درجہ وہ ہے جو شرط نبوت و امامت و وصایت ہوتا ہے اور جو حدود نبوت و امامت و وصایت سے بلند ہوتا ہے یعنی اس درجے کا نبی، امام یا وصی ہوگا کہ درجہ کی ولایت اسے حاصل ہوگی۔ یہی حدود کی اپنی ذات سے شروع ہوتی ہے اور عالمین پر ختم ہو جاتی ہے۔ زیادہ واضح الفاظ میں اگر کہا جائے تو کہ ولایت کی بلند ترین حد مقام سدرۃ المنتہیٰ ہے جہاں حدود عالمین اور حدود امکان ختم ہوتی ہیں۔

ولایت الٰہیہ مطلقہ

ولایت کا چھٹا اور آخری درجہ خود اللہ کی ولایت ہے جو صرف ذات باری کے لئے ہے اور عاشقین کا ایک جزو ہے۔ الوہیت اور عالم امکان متصل نہیں ہیں کیونکہ اگر ان کا اتصال ممکن ہوتا تو وسیلہ کی ضرورت نہ رہتی جبکہ "وابتغوا الیہ الوسیلہ" کی آیت کی دلیل ہے کہ امکان و وجوب کے درمیان بہرحال کسی وسیلے کا وجود لازمی ہے۔ لہذا ماننا پڑے گا کہ الوہیت اور امکان کے درمیان لازما کوئی نہ کوئی وسیلہ، برزخ اور حجاب ضرور ہے جنکے ذریعے فیوض باری تعالی عاشقین تک پہنچتے ہیں اور یہی مقام ولایت خدا ہے اور یہی وسیلہ، برزخ اور حجاب کی معرفت اللہ کی معرفت کہلاتی ہے۔ رزق کے ایک دانے سے لیکر نبوت و امامت و ولایت تک ہر شے تک برزخ کبریٰ و حجاب اکبر سے جاری ہوتی ہے۔ اور ہم پورے یقین اور مکمل وثوق کے ساتھ کہتے ہیں کہ برزخ کبریٰ اور حجاب اکبر ہونے کا دعویٰ سوائے حضرت امیر المومنین کے کسی اور نے کیا ہی نہیں اور یہ ظاہر ہے کہ جس طرح دعویٰ بغیر دلیل کے بیکار ہوتا ہے اسی طرح دلیل بھی بغیر دعوے کے بیکار محض ہوتی ہے۔ اگر کوئی وکیل بغیر کوئی دعویٰ دائر کئے جج کے سامنے کھڑے ہو کر دلیل دینا شروع کردے تو جج سب سے پہلا سوال یہی کرے گا کہ وکیل صاحب آپ کا دعوی کہاں ہے جسکی دلیل آپ دے رہے ہیں؟ پس جب تک کسی کا دعویٰ موجود نہ ہو اس وقت تک

کوئی بھی دلیل فائدہ نہیں دے سکتی اور مقام برزخ جیسی حجاب ہے جس میں حضرت امیر مومنین کے ساتھ کسی کو شریک نہیں پایا جاتا یعنی آفتاب مظہر توحید ہیں اور آپ کی ذات مقدس میں شرک کی ذات خدا میں شرک کرنا ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ شرک ہمیشہ ولایت میں ہوتا ہے۔ ذات خدا میں نہیں۔

ولایت علی مشکل کیوں ہے؟

یہ ایک اصول ہے کہ جب کوئی لفظ بولا جائے تو اسکے اصلی معنی کی طرف ذہن سب سے پہلے متوجہ ہوتا ہے اس لفظ کے حقیقی معنی ہوتے ہیں اور اسکے علاوہ تمام معنی اضافی۔ تاویلی۔ تشبیہی۔ عرضی۔ مجازی اور وقتی ہوتے ہیں۔ اس اصول کے تحت کوئی بھی منصف مزاج شخص اس بات کا انکار نہیں کرسکتا کہ جب بھی لفظ "ولایت" یا "ولی" بولا جاتا ہے تو ہوشمند ذہن میں سب سے پہلے بلا فوراً آتی ہے وہ حضرت امیر مومنین علی ابن ابی طالب کی ذات گرامی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ لفظ ولی اپنے خاص ترین۔ کامل ترین اور مطلق معنوں میں علی کے لئے مخصوص ہے اور باقی تمام ولایات کا یہی ولایت کلیہ سرچشمہ ہے۔ یہی وہ مقام ہے جسے "ولایت مطلقہ" کہا جاتا ہے اور اس مقام پر ولایت خدا اور ولایت علی میں تفریق کرنا درحقیقت ولایت خدا کا انکار کرنا اور شرک کرنا ہے کیونکہ ولایت خدا کا ظہور اسی نقطہ وحدت سے ہوتا ہے اور اس کا انکار صرف ولایت اللہ کو بلکہ تمام عالم ہست و بود کو

کا عدم قرار دیتا ہے کیونکہ یہی نقطۂ اساس وجود ہے یعنی وجود ہے دلیل وجود ہے مبدء وجود ہے منتہا وجود اور ہر شے کو وجود بخشنے والا ہے۔

ہمارے یہاں مذہب کو جن خصوصی رنگ دیا گیا ہے اور جو جو عقائد بمقام خود تصنیف کر لئے گئے ہیں ان کا بنیادی سبب وہ حالات تھے جن میں شیعہ قوم زندہ رہی ہے۔ ان ادوار میں اپنی زندگی اور عزت آبرو بچا لینا ہی گویا ایک معرکہ سر کرنا تھا اور ان حالات میں تقیہ ناگزیر تھا۔ اس لئے ان لوگوں کو الزام دینا ناانصافی ہوگی۔ مگر بعد میں آنے والوں پر ضرور حیرت ہوتی ہے کہ وہ جنہوں کتابِ تاریخ کے اوراق نے سامنے تھے مگر کے وہ جو انہوں نے سنی تحقیق کرنا چاہی اور جو الزام دیا اور کسی پر کسی اور تے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ عبوری عقائد ایک نسل سے منتقل ہو کر دوسری نسل تک پہنچتے رہے اور تاریخی تسلسل اور عوام کی سادہ لوحی کی وجہ سے اتنے راسخ ہو گئے کہ اب ان سے باہر ہو کر تجاوز کرنا بھی ممکن نہ رہا۔ چنانچہ آج یہ حال ہے کہ علم کو بنیاد بنا کر ان کے بغیر ولایت علی بیان کرنا مشکل ہے اور ایسا کرنا اپنوں اور بیگانوں کو دشمن بنانے کے مترادف ہے۔

یہ معروضی حالات تھے جن کا تذکرہ کرنا ضروری تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ولایت علی خود اپنی ذات میں مشکل ہے جس کو سمجھنا اور قبول کرنا ہر انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ کس قدر اختلاف ولایت علی پر ہوئے اس ورثے پر

بکا عشر عشیر بھی نہ ہوا۔ مشرکوں اور مسلمانوں کے درمیان وجہ نزاع ولایت علی۔ شیعوں میں باعث اختلاف ولایت علی اور شیعوں کے آپس کے جھگڑوں کا سبب بھی یہی ولایت علی۔ آخر ولایت علی میں ایسی کونسی بات ہے جو لوگوں کے حلق سے نہیں اترتی؟ اس بات پر اگر آپ نے غور فرمایا تو انشاء اللہ آئندہ آنے والے مباحث پر آپ کو کوئی تعجب نہیں ہوگا۔

خطبہ نورانیہ میں حضرت امیر المومنین مولا علی آیت '' متعلق (مدد) چاہو صبر سے اور صلوۃ سے۔ لیکن وہ ایک نہایت بزرگ اور مشکل چیز ہے مگر خاشعین کے لئے نہیں '' کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔

''صبر سے مراد اس آیت میں صبر سے رسول خدا اور صلوۃ سے میری ولایت مراد ہے جس کی بابت خدائے علیم و حکیم نے کہا کہ وہ ایک نہایت مشکل کام ہے اور نہیں کہا کہ وہ دونوں مشکل ہیں۔ اس لئے کہ میری ولایت کا متحمل ہونا سخت کام ہے نہ کہ نبوت پیغمبر کا۔ مگر خاشعین کیلئے آسان ہے کہ خاشعین سے مراد ہمارے وہ شیعہ ہیں جو مستبصر ہیں''۔

اس فرمان ذیشان میں آنجناب نے واضح فرمایا کہ آپ کی ولایت کو خدا نے نہایت مشکل قرار دیا ہے۔ نبی کی نبوت کو ہر کوئی تسلیم کرلیتا ہے چاہے وہ متقی ہو یا عاصی ہو یا خارجی۔ لیکن علی کی ولایت کسی کے حلق سے نہیں اترتی سوائے ان شیعوں کے جو

مستنبط ہیں۔ اسکی تائید مزید تفسیر فرات کے صفحہ ۲۱۰ سے ہوتی ہے جہاں معصوم فرماتے ہیں۔ "علی سرق کافر کی زبان کو، اور منافق کی زبان کو بھاری لگتا ہے۔ مومنین کی زبان پر شیریں اور انکے دلوں پر خفیف لگتا ہے"۔ یہاں سے معلوم ہوا کہ جس پر ولایت علی گراں گزرے وہ معصوم کے فرمان کے مطابق یا تو کافر ہے یا پھر منافق ہے۔

تفسیر فرات صفحہ ۱۱۸ پر رسول اللہ فرماتے ہیں "یا علی اگر تم نہ ہوتے تو خدا کے گروہ کی پہچان نہ ہوتی۔ اگر تم نہ ہوتے تو دشمن خدا کی شناخت نہ ہوتی۔ جس کسی کے پاس تیری ولایت نہیں ہے تو اسکے پاس کچھ نہیں ہے۔ تمہارا اللہ کے ہاں مرتبہ بہت بلند ہے۔ خدا نے تمہارے بارے میں یہ آیت نازل کی ہے۔ "اے رسول وہ بات پہنچا دو جو تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل ہوئی ہے اور اگر تم نے یہ کام نہ کیا تو تم نے رسالت کا کوئی کام انجام نہ دیا"۔ اگر میں وہ بات نہ پہنچاتا جس کا مجھے حکم دیا تھا تو میرا عمل باطل ہو جاتا۔ وہ سب کچھ جو تیرے بارے میں ہے وہ میرے رب نے مجھ سے بیان کیا ہے"۔

گروہ خدا اور دشمن خدا کے درمیان خط امتیاز کھینچنا مشکل ترین کام ہے یعنی ایک شخص جو قرآن مجید کی تلاوت اور عبادت خدا میں مشغول ہے۔ ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ دشمن خدا ہے۔ لہٰذا گروہ خدا اور دشمن خدا میں تمیز کرنا اس اعتبار سے بھی تبدیلی

مشکل کام ہے کہ دشمن خدا کا خارج سے کوئی وجود ہے ہی نہیں۔ اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ ان دونوں میں تمیز و امتیاز صرف اور صرف ولایت علی کے ذریعے ہی ہوسکتا ہے لہٰذا ولایت علی کا مشکل ہونا ایک لازمی امر ہے۔ اسی لئے آنحضرت نے فرمایا کہ جس کے پاس ولایت علی نہیں ہے اسکے پاس کچھ بھی نہیں ہے کیونکہ ایسا شخص تا ابد حق و باطل میں فرق نہیں کرسکتا اور وہ ہمیشہ ہر پکارنے والے کے پیچھے بھاگتا پھرے گا اور حق سے محروم رہے گا۔

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

اس حدیث میں حضرت ختمی مرتبت نے یہ بھی جتلا دیا کہ میرا اعلان کرنے والے یعنی میرے امتی کا درجہ میرے مقابلے میں بہت پست ہے۔ جب مجھ جیسی ہستی کو اللہ تعالیٰ اپنا محبوب کہتا ہے۔ ولایت علی کے اعلان میں ذرا سی تاخیر کی وجہ سے کسی طرف سے دھمکی ملتی ہے اور نبی الانبیاء ہونے کے باوجود میری رسالت ختم ہونے کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے تو میرے امتی جنکا درجہ مجھ سے کہیں پست ہے اگر وہ ولایت علی طرف سے ذرا سی بھی غفلت برتیں تو ان کو سوچ لینا چاہئے کہ انکا حشر کیا ہوتا ہے؟۔ عجب نہیں کہ ایسے لوگوں سے شرف انسانیت ہی چھین لیا جائے اور وہ روز محشر کتوں۔ بندروں اور خنزیروں کی شکل میں محشور کئے جائیں!

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ولایت علی کا جھگڑا بعد وفات رسول شروع

ہو۔ لیکن یہ ایک شدید غلط فہمی اور قرآن و تاریخ سے لاعلمی کا نتیجہ ہے۔ دعوت ذوالعشیرہ سے لے کر میدان غدیر تک اگر آپ باریک بینی سے جائزہ لیں تو آپ کو ادراک ہو جائے گا کہ اصل نزاع ہمیشہ ولایت علیؑ پر ہی رہا ہے۔

سورۂ یونس ۱۵ میں ارشاد ہو رہا ہے۔ "وہ لوگ جو ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے کہتے ہیں کہ اس کے علاوہ کوئی اور قرآن لے آؤ یا اسے بدل دو۔ (اے رسولؐ) کہہ دو کہ مجھ سے تو نہیں ہو سکتا کہ اسے اپنی طرف سے بدل دوں۔ میں تو صرف اسی کا اتباع کرتا ہوں جو میری طرف وحی کی جاتی ہے۔ اور میں اپنے پروردگار کی نافرمانی کروں تو میں بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں"۔

تفسیر فرات صفحہ ۱۷ پر اس آیت کی تفسیر میں امامؑ فرماتے ہیں۔ "دشمنانِ خدا نے اللہ کے رسولؐ سے کہا کہ علیؑ کے علاوہ کسی اور کو امام بنائیے یا اسکو تبدیل کر دیجئے۔ خدا نے نبیؐ کی بات پر ہماری مدد کی کہ "ان سے کہہ دو کہ میں اسکو نہیں بدل سکتا جو میرے نفس کا قائم مقام ہے یعنی علیؑ۔ میں تو اسی کا اتباع کروں گا جسکی مجھے علیؑ کے بارے میں وحی ہوئی ہے"۔

سورۂ یونس مکی سورہ ہے اور مکے میں آنحضرتؐ کا واسطہ مشرکین سے تھا نہ کہ منافقین سے۔ لہٰذا اس آیت سے ثابت ہو رہا ہے کہ مشرکین مکہ سے بھی اصل نزاع ولایت علیؑ پر ہی تھا۔

اس آیت میں ملاقات رب کا بھی ذکر آیا ہے اور یہ بذات خود ایک علیحدہ موضوع ہے کہ

اس پر بہت کچھ کہا اور لکھا جا سکتا ہے لیکن ہم اس سے صرف نظر کرتے ہوئے حدیث کے آخری حصے پر اپنی مختصر گفتگو کرتے ہیں بلکہ صرف اشارہ کرتے ہیں جس سے نتائج اخذ کرنا خود آپ کا کام ہے۔

حدیث کا آخری حصہ یہ ہے کہ "میں تو اس کا اتباع کروں گا جو مجھے علی کے بارے میں وحی ہوتی ہے"۔ عربی میں دو الفاظ ہیں "اطاعت" اور "اتباع"۔

اطاعت قول کی جاتی ہے اور اتباع عمل کا کیا جاتا ہے۔ وحی قول ہوتی ہے جس کی اطاعت کی جانی تھی لیکن یہاں اطاعت نہیں بلکہ لفظ "اتباع" استعمال ہوا ہے جس کے سے کسی عمل کرنے والے کی وضاحت ہے۔ اس مقام پر رسول اتباع کر رہے ہیں نہ کہ اطاعت۔ اب یہ غور کرنا آپ کا کام ہے کہ وہ عمل کرنے والا کون ہے جس کا اتباع کیا جا رہا ہے؟

بہر حال گفتگو اس امر پر ہو رہی ہے کہ ولایت علی کی مشکل کیوں ہے۔ ہم نے مندرجہ بالا سطور میں کئی وجوہات کا جائزہ لیا ہے۔ لیکن حقیقی سبب کیا ہے اس پر ہم اب بات کرتے ہیں۔

جیسا کہ ہم عرض کر چکے کہ اللہ حسیات و عقول و اوہام سے ماورا ہے لہذا اس کی معرفت حاصل کرنا عملی اعتبار سے محال ہوتی ہے جبکہ حضرت امیر المومنین کا ارشاد ہے کہ "اوّل الدین معرفته" ۔ یعنی دین کی ابتدا یہ ہے کہ اللہ کی معرفت حاصل کی جائے۔ اور یہ بات معقول ہے کہ اللہ ہمیں اس شے کی تکلیف نہیں دے سکتا جس کی ہم

طاقت نہ رکھتے ہوں اور خود ان کا ارشاد ہے کہ "اللہ کسی نفس کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا"۔ اس صورت میں ہمارے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ اللہ کی معرفت کیسے حاصل کی جائے ورنہ اس کے بغیر پورا دین ہی ساقط ٹھہرے گا۔ اعمال و عبادت تو بعد کی بات ہے۔ ہم نے کشف الاعتقاد میں عرض کیا تھا کہ انسان کے لئے کسی کو جاننا اس وقت تک ممکن ہی نہیں جب تک کہ وہ اس کا مشاہدہ نہ کرے۔ اس سے خدا کی معرفت اور ایمان باللہ اسی وقت ممکن ہوگا جب اس کا مشاہدہ کیا جائے۔ اس پر قدرے تفصیلی گفتگو انشاء اللہ آئندہ اوراق میں ہوگی۔ یہاں صرف یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ چونکہ مخلوق اپنے خالق کو اس کی صفات کے ذریعے جانتی ہے اور اس کی تمام صفات اس کی ولایت کے تحت ہیں اس لئے عقلی طور پر واجب ہے کہ اللہ اپنے اس ولی کو ظاہر کرے جو اپنی ذات میں اس کی تمام صفات کا جامع ہو۔ لوگ اس کا مشاہدہ کریں اسے جانیں۔ پہچانیں۔ مانیں۔ سر تسلیم خم کریں اور اس کی عبادت کریں۔ اسی سے "وما خلقت الانس و الجن الا لیعبدون" کی تفسیر میں معصوم نے فرمایا ہے کہ یہاں "لیعبدون" سے مراد "لیعرفون" ہے۔

فزت برب الکعبہ

یہ وہ جملہ ہے جو میرے مولا کے لب ہائے مبارک پر اس وقت جاری ہوا جب عبدالرحمن ابن ملجم ملعون نے آپ کے سر اقدس پر تلوار کی ضرب لگائی۔ اس ایک جملے

میں میرے مولا نے حقائق کائنات، اپنی ولایت اور حقیقت توحید کو سمو دیا ہے۔ اور جس نے اس جملے کو سمجھ لیا وہ کبھی "نانی نانی" کا شور نہیں مچائے گا۔ اس جملے سے یہ بات بھی ظاہر ہو جائے گی کہ ولایت علی کو اللہ نے مشکل یوں قرار دیا ہے۔

تاریخ اسلام میں علی وہ پہلی اور واحد شخصیت ہیں جن کی زبان مبارک سے وقت احتضار یہ جملہ صادر ہوا ہے۔ غور طلب امر یہ ہے کہ مولا نے جو فرمایا ہے کہ "رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا" تو وہ کون سی کامیابی تھی جو اس وقت علی کو ملی تھی اور کیا اس سے قبل علی (معاذ اللہ) ناکام تھا؟ اختیار ہو جاتے ہیں کہ بار بار کیا لکھیں لیکن مجھے کہنا ہوتا ہے شیعہ ہونے کے دعویدار کئی ایسے افراد ہیں جو علی ولی کی شان میں تنقیص کرتے ہوئے بھی جھجکتے نہیں اور سادہ لوح عوام کو بھی بہکاتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ تمام مراتب کے باوجود حضرت امیر المومنین شہادت کی سعادت سے (معاذ اللہ) محروم تھے اس لئے حصول شہادت پر انہوں نے اپنی کامیابی کا اعلان کیا۔ اس لئے یہ بات شیعوں کی کی زبان سے نکل سکے۔ سب سے خاص بات تو یہ ہے کہ آپ سے پہلے جو لوگ شہید ہوئے مثلاً حضرت حمزہ، حضرت جعفر طیار، حضرت عمار یاسر، حضرت اویس قرنی وغیرہ تو کیا علی کی نظر میں شہادت کی کوئی قدر و قیمت و منزلت نہیں تھی؟ کیا انہوں نے یہ جملہ یوں نہ کہا؟ اور علی کے لئے شہادت ایک ایسی انوکھی سعادت تھی کہ اس عالم میں بھی جب انسان کے ہوش و حواس بحال نہیں ہوتے انہوں نے اس پر فخر کیا؟ غور ہے پڑھنے اور سمجھنے والوں پر!

دوسری بات یہ کہ شہادت تو وہ شے ہے جو علیؑ کی جوتیوں کا صدقہ ہے۔ یہاں تک کہ جو شخص آل کی محبت میں بستر پر بھی اپنی طبعی موت مرے تو بھی مرتبہ شہادت مل جاتا ہے جیسا کہ رسول اللہ نے فرمایا: "من مات علی حب آل محمد مات شہیدا" ایسی صورت میں علیؑ کے لئے شہادت کوئی خصوصی فضیلت کا باعث بن سکتی تھی؟۔

بات یہ ہے کہ اللہ نے علیؑ کے ذمے دو کام دیئے تھے اور وہ دونوں ایک دوسرے کی ضد تھے۔ اجتماع ضدین کو محال سمجھا جاتا ہے لیکن علیؑ نے اسے ممکن ثابت کر دکھایا۔ اور یہ علیؑ ہی کا کام تھا ورنہ اجتماع ضدین نقلی اور عملی دونوں اعتبارات سے محال ہے۔ علیؑ کا اولین فریضہ یہ تھا کہ وہ خدا اور توحید خدا کو عملی طور پر ثابت کرے تاکہ لوگ خدا پرستی اور عبادات خدائے واحد کی طرف متوجہ ہوں۔ اور یہ کام ممکن ہی نہ تھا جب تک لوگوں کو تمام صفات خدا کا مشاہدہ نہ کرا دیا جاتا اور مشاہدہ صرف اسی صورت میں ممکن تھا جب یہ تمام صفات خود علیؑ کی ذات اقدس سے ظہور کریں تاکہ لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر ان کی تصدیق کریں۔ لیکن اس صورت میں کوئی اس بات پر یقین کرنے کو تیار ہی نہ ہوتا کہ علیؑ کے علاوہ بھی کوئی اور خدا ہو سکتا ہے کیونکہ لوگوں کے ذہنوں میں اللہ کا جو تصور تھا اور وہ اللہ کو جن صفات سے متصف کرتے تھے اس سے کہیں زیادہ وہ علیؑ سے ظاہر ہوتا دیکھ رہے تھے اور اس سے علیؑ کا مقصد ہی

ناکام ہوتا نظر آ رہا تھا۔ لہٰذا اب علیؑ کو اپنی عبدیت ثابت کرنا تھی اور عبدیت اس وقت تک ثابت نہیں ہوتی جب تک اپنے عجز کا اظہار نہ کیا جائے۔ قدرت اور عجز ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اگر قدرت ثابت کی جائے تو عجز ثابت نہیں ہوتا اور اگر عجز ثابت کیا جائے تو قدرت ہاتھ سے جاتی ہے اور علیؑ کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔

یہی ۱۹ رمضان کو مسجد کوفہ میں رونما ہونے والے اس روح فرسا واقعے کو تاریخ نے ہمیشہ اپنے سینے میں قیامت تک کے لیے محفوظ کر لیا کہ جب علیؑ کے سر پر ضربت لگی تو وہ کس کو سجدہ کر رہا تھا۔ اور اب اس بات کا انکار کوئی نہیں کر سکتا۔ یہی علیؑ کی کامیابی تھی کہ اس نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا۔ یہاں اہل علم کے لیے ایک جملہ عرض کر دوں کہ یہی اصلی قدرت ہے۔ قدرت کا تعلق امکان سے ہے محالات سے نہیں۔ اس پر غور کرنا چاہیے کہ یہ کون قادر علی الاطلاق ہے جو محال کو ممکن میں تبدیل کر دیتا ہے؟

عجز معصومؑ

اس مقام پر ہمیں لازم ہے کہ اس عجز کو سمجھیں جو حضرات ائمہ معصومینؑ تحفظ توحید کے لیے ظاہر فرمایا کرتے تھے ورنہ ناپختہ ذہنوں میں شاید یہ خلش رہ جائے کہ ائمہ طاہرین کبھی قادر ہوتے تھے اور کبھی عاجز۔ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین رہنی چاہیے کہ چونکہ معصومینؑ مظہر توحید تھے اور ان کا منصب ہی توحید کو ثابت کرنا تھا اس لیے عقل

وجہ یہ ہے کہ وہ تمام صفات توحید کے جامع ہوں۔ چونکہ مقام محمود پر ہر فرد بشر
بھی نقص رہ گیا تو توحید ثابت ہوگی وہ ناقص توحید ہوگی جو ہرگز مطلوب و مقصود
خداوندی نہیں ہے لہٰذا اس بات پر یقین رکھنا ضروری ہے کہ یہ مقدس ہستیاں قادر علی
الاطلاق تھیں۔ ان کی قدرت وقتی یا عارضی نہیں تھی کہ کبھی یہ قادر ہوں اور کبھی نہ
ہوں۔ بلکہ ان کی قدرت ان کی وجہ سے تھی جو ان کی ذات کا جزو تھی اور جسکا ان سے جسم
زمین کے سے بھی جدا ہو جانا محال ابدی تھا۔ پس ان کا اظہار معجزہ ایک اختیاری فعل
تھا نہ کہ کوئی مجبوری۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ اگر کوئی بھڑ آپ کے بدن پر چل رہی ہو
تو آپ اسے جھٹک دیتے ہیں۔ مارتے نہیں۔ بعض اوقات وہ کاٹ بھی لیتی ہے جس
کی وجہ سے بدن پر ورم آجاتا ہے اور سوزش محسوس ہونے لگتی ہے۔ لیکن آپ کا اسے نہ مارنا
آپ کا عجز نہیں کہا جائے گا بلکہ رحم کہا جائے گا۔ اسی طرح جب معصومین کسی شے کو اپنے اوپر
توڑ دیتے ہیں تو یہ ان کا عجز نہیں ہوتا بلکہ ان کی رحمت ہوتی ہے۔ اس کی بہت سی مثالیں
تاریخ میں مل جائیں گی۔ فاتح بدر و احد و خیبر و حنین حضرت امیر المومنین جو اکیلے
پورے شہر پر بھاری ہوتے تھے۔ کیا یہ بات ممکن تھی کہ محض چند آدمی ان کے گلے میں
رسی باندھ کر انہیں گھسیٹتے ہوئے لے جائیں؟ لیکن تاریخ شاہد ہے کہ یہ ہوا ہے۔ پھر
یہ بھی ہوا کہ جب لوگ سیاسی ہنگامہ آرائی سے فارغ ہو کر واپس آئے تو رسول اللہ کو
دفن کیا جا چکا تھا۔ اس پر وہ مشتعل ہو گئے اور اس بات پر مصر ہوئے کہ قبر رسول کو کھود

کہ جسدِ رسولؐ کو باہر نکالا جائے اور ان پر نماز جنازہ پڑھی جائے۔ اس وقت لوگوں کا ایک جم غفیر موجود تھا اور روایت عرب کے مطابق سب کے سب مسلح تھے۔ دوسری طرف حضرت امیر المومنین تنہا تھے۔ آپ قبر رسولؐ پر بیٹھ گئے اور اپنی تلوار سے زمین پر ایک لکیر کھینچی اور فرمایا "جس نے اس خط سے بال برابر بھی قدم بڑھایا وہ میری تلوار سے بچ نہیں سکے گا۔" یہ مشکل تھا ورنہ پورا لشکر یکبارگی ٹوٹ پڑتا مگر وہ آج کل کے مولوی حضرات تو تھے نہیں اس لئے چپ چاپ واپس لوٹ گئے۔ سوال یہ ہے کہ اس وقت علیؑ میں یہ قدرت کہاں سے آ گئی اور بعد میں یہ قدرت کہاں تھی؟ افعال معصوم میں یہ تضاد خود بتا رہا ہے کہ عجز معصوم کا تعلق حکمت سے ہوتا ہے نہ کہ عجز و بے بسی سے۔ یہی وہ عجز تھا جس کا وہ اظہار فرمایا کرتے تھے تا کہ ناسمجھوں کو دھوکا نہ ہو اور وہ لوگ جو ظاہری اسباب سے چیزوں کو پرکھ رہے تھے اور بت پرستی ان کی رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی اسلام لانے کے بعد پھر سے پاؤں نہ پکڑ جائیں اور بتوں کی جگہ ان معصوم ہستیوں کی پرستش نہ کرنے لگیں۔ اسی مقصد کے تحت ان مقدس نفوس نے بڑی تکالیف اٹھائیں۔ لاکھوں ظلم سہے۔ یہاں تک کہ قتل ہوئے اور یہی مقصد ہے۔ ایک الٰہی حکمت تھی جس کا تذکرہ قرآن مجید میں ہے۔

ہم نے جو اجتماع ضدین کا لفظ استعمال کیا ہے اس کا مقصد یہی ہے کہ قادر ہوتے ہوئے عاجزوں کے ہاتھوں ظلم سہنا اور قتل ہو جانا صرف انہی ہستیوں کا

کام تھا ورنہ طاقت بشری تو اس کا تصور بھی نہیں رکھتی۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ یہ اتنا متضاد ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت امیر المومنین مظہر تمام ذات خدا ہیں جیسا کہ حضرت امام حسینؑ اپنے ایک خطبے میں ارشاد فرماتے ہیں:۔

''اس (علیؑ) کے علاوہ کسی کیلئے بھی دو متضاد صفات ایک وقت میں جمع نہیں ہو سکتیں''۔ (صحیفۃ الحسین صفحہ ۲۱۹)

بیت الکعبہ

اس امر میں بھی لوگ بہت سر کھپاتے ہیں کہ آخر حضرت علیؑ نے خاص طور پر بیت کعبہ کی تخصیص کیوں؟ کہانیاں بنیں، ان میں سے ابھی کوئی قابل قبول توجیہ سامنے نہیں آ سکی نہ پڑھی۔ حقیقت یہ ہے کہ علیؑ کا کعبے کے اندر ایک خاص اہتمام کے ساتھ ظہور فرمانا کائنات کی تاریخ کا ایک انوکھا اور نادر واقعہ تھا۔ جو تاریخ سے شغف رکھتے ہیں وہ اچھی طرح اس بات سے واقف ہیں کہ قبل اسلام کعبے پر ہمیشہ مشرکین کا قبضہ رہا ہے اور بعد اسلام بھی منافقین کی شکل میں کعبے پر قابض رہے اور آج بھی دشمنان اسلام اس پر مسلط ہیں۔ ان تمام ادوار میں یہ بات بہت آسان تھی کہ کعبے کے اندر کوئی بچہ پیدا نہ ہونے دیا جاتا لیکن یہ مشیت ہے کہ یہاں دوسرے کی ولادت کی ایک بھی نہ ہوئی اور انشاء اللہ قیامت تک کوئی یہ سعادت نہ پا سکے گا۔ یہ واقعہ ہمیشہ سے لوگوں

جیسے باعث تعجب بنا رہا ہے اور نتیجے کے اعتبار سے اسے اور بھی اہمیت حاصل ہوئی اور بت پرستوں کے ذہنوں میں یہ بات راسخ ہو جاتی کہ یہ دراصل میں کہ چونکہ کعبہ اللہ کا گھر ہے اس لئے اس میں صرف اللہ ہی آ سکتا ہے۔ اس لئے علی یقیناً اللہ ہے یا کم از کم اللہ کا بیٹا تو ضرور ہے کیونکہ بیٹا ہمیشہ اپنے باپ کے گھر میں پیدا ہوتا ہے۔ جب علی کو کعبے میں ظاہر کرنے میں اللہ کی کوئی حکمت کارفرما تھی یہ تو وہی جانتا ہے لیکن اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے کہ کعبہ اللہ کا گھر نہیں بلکہ علی کا گھر ہے اور یہ کہ اللہ کا مشاہدہ سوائے علی کے اور کسی ذریعے سے ہو ہی نہیں سکتا ورنہ اللہ بجائے علی کے اس کعبے میں پیدا ہوتا۔ جیسا کہ کوکب دری جلد اول صفحہ ۲۹۰ پر خود حضرت امیر المومنین ارشاد فرماتے ہیں: جس وقت میری ماں فاطمہ بنت اسد کے وضع حمل کا وقت قریب آیا تو وہ حرم میں تھیں۔ جب دیوار کعبہ شق ہوئی اور وہ اسی شگاف کے راستے کعبے کے اندر داخل ہوئیں۔ جب وہ خانہ کعبہ میں داخل ہو گئیں اور بیت اللہ کے وسط میں میں تولد ہوا۔ پس یہ فضیلت مجھ سے قبل اور میرے بعد سوائے میرے کسی کے لئے نہیں۔

یہی علی تھا جو انبیاء کے روپ میں جلوہ گر ہوتا رہا اور یہی اپنے بعد والوں کی صورتوں میں منتقل ہوتا رہا کیونکہ مقصد سب کا یہی تھا کہ اللہ کا مشاہدہ کرایا جائے تاکہ لوگ اس پر ایمان لائیں اور اسکی عبادت کریں۔

اس سے اور بھی زیادہ واضح ہو جاتا ہے کہ علی کا کعبے میں ظاہر ہونا کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا بلکہ اس میں لوگوں کے لئے ایک عظیم امتحان مضمر تھا۔ اس سے میرے مولا

نے اپنی کامیابی کا اعلان کرتے وقت عبد کا حوالہ دیا تاکہ لوگوں کے ذہن سے یہ غلط فہمی دور ہو جائے اور وہ سمجھ لیں کہ عبد میں ظاہر ہونے کے باوجود علی ایک عبد ہے اور حالت عبدیت میں ہی جان دے رہا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ اب آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ ولایت علی مشکل کیوں ہے۔ سبب یہی ہے کہ جیسے ہی ولایت کا پردہ اٹھتا ہے تو نور ایسے آنکھوں میں چکاچوند پیدا ہو جاتی ہے اور گمان ہوتا ہے کہ یہی خدا ہے۔ اس وقت بجز دو ہی صورتیں ممکن رہ جاتی ہیں کہ یا تو اسکو خدا مان لو یا پھر آنکھوں سے دیکھی کا انکار کر دو تاکہ توحید ہاتھ سے نہ جائے۔ یہ شان صرف مومن کی ہے کہ وہ اس سب سے زیادہ باریک فرق کو محسوس کر لیتا ہے جو عبد و معبود میں تمیز کرتا ہے۔

ولایت مطلقہ مخصوص ہے حق تعالیٰ سے

ہم نے درجات ولایت بیان کرتے ہوئے ان تمام ولایات کا ذکر کیا ہے جو منجانب اللہ عطا ہوئی ہوں اور ایک ایسی ولایت کا بھی ذکر کیا ہے جو عطا نہیں ہوئی بلکہ خود ہوئی ہے اور وہ ہے خود اللہ کی ولایت۔ اللہ کی ذات کا تعارف اس ولایت سے ہوتا ہے اور چونکہ وہ ذات واحد ہے اس لئے وہاں دوئی کا گمان تک نہیں پہنچ سکتا۔ نہ جو کچھ بھی اس ذات واحد سے صادر ہوگا وہ تجلی اعتبار سے واحد ہی ہوگا۔ وحدت سے کثرت کا صادر ہو جانا محالات عقلیہ سے ہے۔ کثرت تو صادروں کی مخلوق کے طور

پر موجود میں آئی ہے۔ اس لئے ہم کہتے ہیں کہ خدا کی ولایت مخصوص ہے علی ابن ابی طالب سے اور اس لئے علی کے علم، علی کی قدرت اور علی کے تصرفات میں نقص تلاش کرنا حقیقتاً خدا کو ناقص و عاجز سمجھنا ہے۔

کہف ۴۴: ''ہنالک الولایۃ للہ الحق''

ترجمہ: ''اس جگہ تو ولایت خدائے برحق ہی کی ہوگی''۔

اس آیت کی تفسیر میں امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں: ''اس سے مراد ولایت امیر المومنینؑ ہے''۔

۲۔ حق الیقین (اردو) ج ۲ صفحہ ۵۵۔ رسول اللہؐ سے لوگوں نے پوچھا کہ ولی اللہ کون ہے؟ حضرتؐ نے فرمایا: ''اس زمانے میں تمہارے ولی علیؑ ہیں اور ان کے بعد ان کے وصی (یعنی بارہ امامؑ)''۔

۳۔ عمدۃ المطالب ج ۱ صفحہ ۳۳۴۔ رسول اللہؐ نے فرمایا: ''اللہ عزوجل نے مجھے نبوت سے اور میرے اہلبیتؑ کو ولایت کے ساتھ مخصوص کیا ہے''۔

۴۔ کنز العمال جلد ۱ صفحہ ۳۹۔ ''نبوت مختص رسول اللہؐ سے اور ولایت مختص علیؑ سے مخصوص ہیں''۔

۵۔ معانی الاخبار (اردو) صفحہ ۱۰۵ حدیث ۴۔

حضرت ختمی مرتبتؐ نے فرمایا: ''علی میرا ولی ہے اور ان لوگوں کے لئے ولی ہے کہ جن کا

میں اور ہوں اور کوئی امارت حکومت ان کے ساتھ کسی اور کو حاصل نہیں ہے"۔

ولایت زندگی ہے

مومن کی ہر شے زندہ رہنا چاہتی ہے۔ حیات ہی مقصود مطلوب کائنات ہے۔ حیات ہی روح موجودات ہے۔ معصوم نے صاحب عقل کو زندہ اور بے عقل کو مردہ کہا ہے۔ اللہ نے مومن کو زندہ اور کافر کو مردہ کہا ہے جیسا کہ سورہ آل عمران کی آیت ۲۷ میں ارشاد ہوتا ہے۔ "وہ مردہ سے زندہ کو نکالتا ہے اور زندہ سے مردہ کو نکالتا ہے"۔ معصوم اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں "یعنی اللہ صلب کافر سے مومن کو نکالتا ہے اور صلب مومن سے کافر کو نکالتا ہے"۔ سوال یہ ہے کہ اللہ نے مومن کو زندہ کیوں کہا ہے؟ صرف اس لئے کہ اس کے اندر ایمان ہے لہٰذا ایمان زندگی ہے۔ چونکہ ولایت ایمان ہے وہی حقیقی حیات ہے اور جن کے پاس اس کی ولایت نہیں وہ مردہ ہے۔

۱۔ انفال ۲۴ "اے ایمان والو! جب اللہ اور اس کا رسول تمہیں زندگی عطا کرنے کے لئے بلائیں تو فوراً لبیک کہو"۔

حقائق قرآن صفحہ ۵۳ پر ابن مردویہ سے روایت ہے کہ "یہ آیت ولایت علی کے سلسلے میں نازل ہوئی ہے۔ یعنی جب اللہ اور اس کا رسول تمہیں ولایت علی کی طرف دعوت دیں تو لبیک کہو"۔

۲۔ بحار الانوار جلد صفحہ ۱۳۲۔ جناب امیر المومنین نے فرمایا۔ "اللہ نے اپنے نبی کو ہر

کوثر عطا فرمائی اور مجھے آب حیات عطا فرمایا"۔

پس جو ہمیشہ زندہ رہنا چاہتا ہے (یعنی ہمیشہ مومن رہنا چاہتا ہے) تو اسے لازم ہے کہ علی کے دامن کو مضبوطی سے تھامے رکھے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ہم نے تحفۃ العقائد میں صحیفہ کاملہ سے امام زین العابدینؑ کی دعا کا ایک جملہ نقل کیا تھا جس میں آپ فرماتے ہیں۔ "بسم اللہ خیر الاسماء بسم اللہ رب الارض والسماء"۔ (پروردگار کا بہترین نام "بسم اللہ" کا ہے بسم اللہ جو زمین و آسمان کا رب ہے)۔ ہم نے عرض کیا تھا کہ بسم اللہ حضرت امیر المومنینؑ کا نام مبارک ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس کی تھوڑی سی وضاحت اور کر دیں۔ اسکے بعد "بسم اللہ رب الارض والسماء" پر کچھ گفتگو کریں گے۔

سورہ بنی اسرائیل ۴۶ میں "اور جب تو نے قرآن میں اپنے پروردگار کی توحید کا ذکر کیا تو وہ نفرت کے ساتھ اپنی پیٹھیں پھیر کر پلٹ گئے"۔

تفسیر صافی میں بحوالہ کافی امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ "جب آنحضرتؐ اپنے مکان میں داخل ہونے لگتے اور قریش کا جب مجمع آپ کو گھیرے ہوئے ہوتا تھا تو آپؐ بلند آواز سے فرماتے۔ "بسم اللہ الرحمن الرحیم" تو قریش منہ موڑ کر بھاگ جاتے"۔

ہر سمجھدار انسان اس بات کو جانتا ہے کہ "بسم اللہ الرحمن الرحیم" میں ایسی کوئی بات ہے جس کو سن کر دشمن بھاگ جائے؟ اور تاریخ کے اعتبار سے بھی دیکھا جائے تو اس جملے میں خدا کی صفت رحم کا ذکر ہے۔ صفت قہر کا تو نہیں کہ اس سے ڈر کر کوئی بھاگ کھڑا ہو۔ یہاں یہ بھی ثابت ہے اللہ نے اپنے رسولؐ کے لئے سلطانا نصیرا قرار دیا تھا اور قریش اسی سے ڈر کر بھاگا کرتے تھے۔

۲۔ آپ سب اس بات سے واقف ہیں کہ نقطے کے ساتھ ان کی نسبتیں معصوم سے منسوب ہیں۔ خاص کر ان حضرت امیر المومنین سے منسوب اور انہی کے لئے مخصوص ہے۔ یہاں ہم مفاتیح الجنان صفحہ ۴ سے "نور کی دعا" کا ایک جملہ پیش کر رہے ہیں۔ یہ جملہ آپ کو نقطے کی کسی اور دعا میں نہیں ملے گا۔

"بسم اللہ جسکے فضل و کرم کا امیدوار ہوں اور اسکے عدل سے ہی ڈرتا ہوں اور اسکے قول پر بھروسہ کرتا ہوں اور اسی کی رسی پکڑے ہوئے ہوں"۔

۳۔ مفاتیح الجنان صفحہ ۲۳۱۔ (دعائے نور صغیر)۔ "بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ بسم اللہ جو نور ہے۔ بسم اللہ جو نور کا نور ہے۔ بسم اللہ جو نور پر نور ہے۔ بسم اللہ جو مدبر امور ہے۔ بسم اللہ جس نے نور کو نور سے پیدا کیا"۔ (ہم نے صرف متن نقل کیا ہے اور اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا تاکہ نقطہ پرستوں کی پیشانی پر پسینہ نہ آئے لیکن یہ سوال کو ذہن میں رکھنا پڑے گا کہ بسم اللہ کون ہے!)

۴۔ توحید صفحہ ۱۹۔ حدیث ۱۔ امام علی رضاؑ نے فرمایا "بسم اللہ کہنے والے کے قول کا

مطلب یہ ہے کہ میں اللہ کی علامتوں اور نشانیوں میں سے ایک علامت اور نشانی اپنے نفس پر لگاتا ہوں جو عبادت ہے۔"

۵۔ مفتاح الجنان صفحہ ۱۲۱۔ (دعائے مشلول)۔ "اے خدا میں سوال کرتا ہوں تیرے اسم "بسم اللہ الرحمن الرحیم" کے واسطے سے اے جلالت و بزرگی والے اسی کا واسطہ، ی کا واسطہ، ی کا واسطہ، ی کا واسطہ، ی کا واسطہ، ی کا واسطہ، ی کا واسطہ۔"

۶۔ تفسیر سورہ حمد صفحہ ۳ امام خمینی لکھتے ہیں: "ظہر الوجود ببسم اللہ الرحمن الرحیم" یعنی وجود بسم اللہ الرحمن الرحیم سے ظاہر ہوا۔ وہ یہی کہنا چاہتے ہیں کہ علی اصل وجود، عین وجود، کل وجود اور مظہر وجود ہے۔ وجود بھی مرتبہ علی ہی سے ملتا ہے۔ یہاں تک کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم میں بائے بسم اللہ کو بھی علی ہی سے وجود ملتا ہے یعنی وہ نقطہ تحت الباء ہے اور بغیر نقطے کے "ب" وجود میں ہی نہیں آتا جب کہ خود نقطہ اپنے وجود میں سوائے اللہ کے کسی کا محتاج نہیں ہے۔ سمجھنے والوں کے لئے اتنا ہی بہت ہے۔

۷۔ اسی کتاب کے صفحہ ۱۴ پر خمینی صاحب فرماتے ہیں: "سورہ مبارکہ حمد میں موجود "بسم اللہ" سے جامع تر اور وسیع تر کوئی اسم نہیں"۔

ربّ الارض والسماء

"رب" ایک ایسا لفظ ہے جسے نہ تو کبھی سمجھا گیا اور نہ سمجھنے کی کوشش کی گئی۔ جہالت نے سونے پر سہاگے کا کام کیا اور غیر اللہ کے بندوں نے دلوں پر اپنی دہشت بٹھائی کہ لوگوں نے عقل کو ایک کونے میں رکھا قرآن و فرمائشات معصومین سے آنکھیں پھیر لیں اور ہر اس بندۂ مومن پر شرک و کفر کے فتوے لگانا شروع کر دیے جو ان کے مفروضے کے خلاف حقیقت بیان کرتا ہو۔ ہم نے چونکہ ان لوگوں کی باتوں کو نہ تو کبھی اہمیت دی ہے اور نہ کبھی ان سے خوف کھایا ہے۔ ہم آل پاک ہستیوں کے غلام ہیں انہی کے ارشادات کو بیان کریں گے اور بیان کرتے رہیں گے۔ مولا علیؑ کو "رب الارض والسماء" ہمارے مولا صاحب الجماعت امام نے ہی کہا ہے۔

"رب" کے معنی ہیں پالنے والا، پرورش کرنے والا، تربیت کرنے والا اور ان سب کا مفہوم ایک ہی ہے یعنی ناقص کو کامل بنانے والا۔ یہ لفظ اتنا عام ہے کہ ہر شخص کے منہ سے بولا جا سکتا ہے اور بولا جاتا ہے۔ رب کی جمع ہے ارباب۔ یہ لفظ ہماری روزمرہ کی بات چیت میں بے تکلف استعمال ہوتا ہے۔ آپ میں سے کون ہے جس نے "ارباب اقتدار، ارباب حکومت اور ارباب دانش" قسم کے الفاظ نہ سنے ہوں۔ لیکن میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ یہ اور ان جیسے دوسرے الفاظ استعمال کرنے والوں پر شرک و کفر کا فتویٰ لگایا ہو۔ لیکن جیسے ہی کسی نے علی اور اولادِ علی کے لئے یہ لفظ

استعمال کیا۔ گویا ایک بھونچال آجاتا ہے، مرغے تو رہے ایک طرف، خود آپ بھی دبے گھٹتے ہیں اور چاروں طرف سے فتووں کا پتھراؤ شروع ہو جاتا ہے کیونکہ مذہبی وڈیروں کا مطلب یہ ہے کہ دین کو بس اتنا ہی جانو اور مانو جتنا وہ بتا دیں۔ اس سے آگے اگر سوچا یا کہا تو دین سے خارج ہو جانا لازمی ہے۔ حالانکہ اگر ذرا سا بھی تدبر کیا جائے تو اس مسئلے کو سمجھنا بہت آسان ہے۔ ہم اپنے طور سے نہیں بلکہ خود قرآن سے ثابت کریں گے کہ اللہ نے یہ لفظ کس کس کے لئے استعمال فرمایا ہے۔

۱۔ بنی اسرائیل ۲۳۔۲۴ میں جہاں حقوق والدین کے احکام بیان کئے گئے ہیں وہاں ارشاد ہوتا ہے۔ ''اور ان دونوں (باپ اور ماں) کے لئے رحمت سے عاجزی کا بازو جھکا دے اور دعا کر کہ اے میرے رب ان دونوں پر رحم فرما جیسا کہ انہوں نے بچپن میں میری ربوبیت کی تھی''۔

یہاں والدین کو رب کہا گیا ہے بلکہ انہیں رب بننے کا حکم دیا گیا ہے۔

۲۔ یوسف ۲۳۔ جب زلیخا نے حضرت یوسف کو گناہ پر مجبور کیا تو انہوں نے فرمایا۔ ''خدا کی پناہ! وہ (عزیز مصر) میرا رب ہے۔ اس نے مجھے اچھی طرح رکھا ہے''۔

یہاں اللہ کا نبی ایک کافر کو اپنا رب کہہ رہا ہے۔

۳۔ یوسف ۴۱۔ ''اے میرے قید خانے کے ساتھیو! تم دونوں میں سے ایک اپنے

وہ اپنے رب کو شراب پلائے گا"۔

۴۔ یوسف ۴۲ "اور اس (یوسف) نے ان دونوں میں سے جس شخص کے متعلق یہ یقین تھا کہ وہ نجات پانے والا ہے کہا کہ اپنے رب سے میرا ذکر کیجیو"۔

۵۔ یوسف ۵۰ "اور بادشاہ (عزیز مصر) نے کہا کہ اس (یوسف) کو میرے پاس لاؤ پس جب انکے پاس قاصد پہنچا تو اس نے کہا کہ اپنے رب کے پاس واپس جاؤ پھر اس سے پوچھو کہ کیا حال ہے ان عورتوں کا جنہوں نے (مجھے دیکھ کر) اپنے اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے تھے"۔

ان تینوں آیتوں میں بھی زبان یوسف سے ایک کافر کو رب کہا گیا ہے۔

حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ ایک کافر کو رب کہتے ہوئے لوگوں کو کوئی پریشانی نہیں ہوتی لیکن اگر مقدسہ کے اس ولی کو جنکے پاس وہی ولایت ہے جو مقدسہ کے پاس ہے رب کہا جائے تو انہیں فوراً شرک یاد آجاتا ہے۔ حالانکہ وہ شخص جو شیعہ ہونے کا محض دعویٰ ہی نہیں کرتا بلکہ حقیقتاً شیعہ ہے اس کا عقیدہ یقیناً یہی ہونا چاہئے کہ امام زمانہ صرف رب الارض بلکہ رب الکائنات ہوتا ہے کیونکہ وہ اللہ کا ہاتھ ہے جسکے ذریعے سے پوری کائنات کو رزق عطا کیا جاتا ہے اور جو تمام عالم کی تربیت و پرورش یعنی ربوبیت کرتا ہے۔

فجر ۲۲ "اور تیرا رب آئے گا اور فرشتے صف در صف موجود ہونگے"۔

یہاں ہمارے امام زمانہ کو رب کہا گیا ہے اور بالاتفاق یہ آیت ظہورِ امام سے متعلق ہے۔ اللہ کے لئے "آنا" اور "جانا" جیسے الفاظ کا استعمال جائز نہیں اور نہ اللہ فرشتوں سے مدد لیتا ہے۔

۲۔ بنی اسرائیل ۲۰: "(اے رسول) تیرے رب کی عطا سے ہم ہر ایک کی مدد کرتے ہیں۔ ان کی بھی اور ان کی بھی اور تیرے رب کی عطا روکی ہوئی نہیں ہے"۔

یہ آیت صاف بتا رہی ہے کہ یہاں رب کوئی اور ہے اور جو مدد کرتا ہے وہ کوئی اور ہے۔

ایک اور مغالطہ

ہم نے یہ سوال بہت سے مولویوں سے کیا ہے کہ قرآن مجید میں کہیں تو اللہ نے اپنے لئے صیغہ واحد متکلم یعنی "میں" استعمال فرمایا ہے مثلاً "انی جاعل فی الارض خلیفہ" یا "انی انا اللہ" وغیرہ اور کہیں اپنے لئے صیغہ جمع متکلم یعنی "ہم" استعمال کیا ہے مثلاً گزشتہ آیت میں یا جیسے سورہ حجر کی آیت ۹ میں ارشاد فرمایا "انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون"۔ (بیشک ہم نے ہی ذکر کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں) تو یہ تضاد کیا ہے؟ یہ سوال سن کر پہلے تو ہر مولوی کھنکارتا ہے اور پھر سامنے والے کو جاہل سمجھ کر یہ جواب دیتا ہے کہ "جہاں کہیں اللہ نے اپنے لئے صیغہ جمع متکلم استعمال کیا ہے اس کا مقصد اپنی تعظیم کو ظاہر کرنا ہے

جیسے بعض لوگ "میں" اپنے آپ کو "ہم" کہتے ہیں۔

میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اگر دنیا میں بیوقوفوں کی اکثریت نہ ہوتی تو مولوی کی روٹی پانی کہاں سے چلتی؟ اول تو عربی میں نہ ایسا کوئی قاعدہ موجود ہے اور نہ عرب معاشرے میں ایسا کوئی رواج ہے جس کے بموجب "میں" کو "ہم" بولا جائے اور اگر بفرضِ محال ایسا ہے بھی تو کچھ بلند مقام پر بیٹھ کر اپنے لئے "ہم" کی استعمال کرتا ہے کیونکہ تعظیم تو کسی بلند مقام پر ہے۔ اس کا کیا مطلب ہوا کہ "میں" وہ اپنی تعظیم کرتا ہے اور "میں" نہیں کرتا؟

آخرکار ہم نے قرآن میں ڈھونڈنا شروع کیا تو سورۃ المعارج کی آیت ۴۰ ہمیں نظر آئی جو ہم آپ کی خدمت میں ہدیہ کرتے ہیں۔ اسے پڑھئے اور ہمیں بتائیے کہ اس آیت میں "میں" کون ہے اور "ہم" کون ہے؟ بلکہ اس آیت میں ایک تیسرا فریق بھی ہے وہ کون ہے؟

"میں قسم کھاتا ہوں مشرقوں اور مغربوں کے رب کی کہ ہم قدرت رکھنے والے ہیں"۔

اب مولوی مجھے بتائے کہ اس آیت میں۔

۱۔ "میں" کون ہے جو قسم کھا رہا ہے؟

۲۔ "ہم" کون ہے جو قدرت رکھنے والا ہے؟

۳۔ یہ "رب المشارق والمغارب" کون ہے جس کی قسم کھائی گئی ہے؟

یہ تو ظاہر ہے کہ قرآن کا متکلم چونکہ اللہ ہے اس لئے "میں" سے مراد تو اللہ ہی ہوسکتا ہے ورنہ پھر قرآن کو کسی اور کی طرف منسوب کرنا پڑے گا۔ اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ "رب المشارق والمغارب" کوئی اور ہے جو پورے کارخانہ حیات کی ربوبیت کررہا ہے اور وہ کوئی نہیں ہوسکتا سوائے اسکے جو اللہ کا ہاتھ ہے۔ اور "ہم" ایک جماعت ہے جو "علی کل شئی قدیر" ہے۔

ان صاحبان قدرت کو جاننے کے لئے خود قدرت کا جاننا ضروری ہے تاکہ اسے کوئی معمولی لفظ سمجھ کر نظر انداز نہ کیا جاسکے۔ اس لئے چند احادیث پیش خدمت ہیں جن سے اندازہ ہوجائے گا کہ قدرت کیا ہے۔

۱۔ توحید صفحہ ۳۲۶۔ حدیث ۴۔ حضرت امیر المومنین نے فرمایا۔ "اس نے اپنی قدرت کی مضبوطی سے تمام مخلوق شدہ اشیاء کو پیدا کیا"۔

۲۔ نہج البلاغہ کے پہلے خطبے میں آپ فرماتے ہیں۔ "انشاء الخلق بقدرتہ"۔ اس نے خلق کو اپنی قدرت سے پیدا کیا۔

۳۔ توحید صفحہ   حدیث ۲۔ امام موسیٰ کاظم نے فرمایا۔ "اس نے جو چاہا اپنی مشیت وقدرت سے پیدا کیا"۔

ان احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ حقیقتاً قدرت ہی خلاق کون و مکاں ہے اور مخلوق کی ربوبیت کرنا خلاق ہی کی ذمہ داری ہوتی ہے۔

۴۔ توحید صفحہ ۹۸۔ حدیث ۳۔ امام علی رضا نے فرمایا۔ "اللہ کا ہاتھ اپنی قدرت پر ہے"۔

چونکہ اللہ کا ہاتھ قدرت پر ہے اس لئے قدرت میں کسی قسم کا نقص یا عجز موجود ہونا ناممکنات میں سے ہے کیونکہ اسکی ذمہ داری براہ راست اللہ پر پڑتی ہے نیز اللہ کی قدرت سے کسی شے کا غائب یا پوشیدہ رہنا اسکے ضعف پر دلیل ہوگی اس لئے کوئی غیب اسکے لئے غیب نہ رہا کیونکہ غیب بھی مخلوق ہے اور اسکی خالق قدرت ہے اور مخلوق کا اپنے خالق سے محجوب ہو جانا ممکن نہیں ہوتا۔

۵۔ توحید صفحہ ۷۵۔ حدیث ۳۱۔ امام جعفر صادق نے فرمایا۔ "جس نے کسی قدرت کا انکار کیا وہ کافر ہے"۔

جب جو کوئی بھی ان "اہم" میں سے کسی ایک کا انکار کرے یا کلی قدرت کو ناقص سمجھے یا کلی شان میں تقصیر کرے یا خود کو یا کسی اور کو کلی بندگی پر لائے وہ پہلے اپنے ایمان کی خبر لے۔

ربِ ابراہیم

حضرت ابراہیم اور نمرود کے درمیان ایک مباحثہ ہوا جسے قرآن نے سورہ بقرہ کی آیت ۲۵۸ میں بیان فرمایا ہے۔ "ابراہیم نے کہا کہ بیشک میرا رب سورج کو مشرق سے نکالتا ہے پس (اگر تو رب ہے تو) اسے مغرب کی طرف سے نکال لا"۔

صاف ظاہر ہے کہ ان دونوں کے درمیان "رب" پر بحث ہو رہی تھی نمرود کہتا تھا کہ میں رب ہوں اور ابراہیم کہتے تھے کہ تو رب نہیں ہے بلکہ رب وہ ہے جسے میں رب مانتا ہوں۔ اب فیصلہ طلب یہ ہو کہ کون سچا ہے؟ ابراہیم اپنے رب کی ایک نشانی بتاتے ہیں اور نمرود کو چیلنج کرتے ہیں کہ وہ ایسا کر دکھائے تو ابراہیم اسے رب تسلیم کرلیں گے۔ معلوم ہوا کہ ابراہیم جو دلیل دے رہے تھے وہ اپنے رب کے حق میں دے رہے تھے اور اگر کوئی ایسا کر دکھائے جیسی ابراہیم نے شرط رکھی ہے تو یقیناً وہی ابراہیم کا رب ہے۔ ابراہیم وہ بندہ پاک ہیں جنھیں اللہ نے "صدیق نبی" کہا ہے یعنی ابراہیم سے جھوٹ کا صادر ہونا محال ہے۔ لیکن جب ہم تاریخ کے اوراق پلٹتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے ابراہیم کی شرط کبھی پوری کی ہی نہیں بلکہ یہ شرط تو اللہ کے ایک بندے نے پوری کی ہے اور وہ بھی ایک مرتبہ نہیں بلکہ ۱۵ مرتبہ۔

میرا سوال یہ ہے کہ اگر نمرود حضرت امیر المومنین کے زمانے میں زندہ ہوتا تو حضرت ابراہیم کے بارے میں کیا سوچتا؟ کیا وہ یہ خیال نہ کرتا کہ (معاذ اللہ) ابراہیم مجھے بے وقوف بنا گئے؟ لہٰذا یہ ماننا کہ حضرت ابراہیم نے یہ دلیل اللہ کے حق میں دی تھی اس مقدس ہستی پر بہتانِ عظیم لگانا ہے اور کذب کو انکی طرف منسوب کرنا ہے۔ پس ماننا پڑے گا کہ ابراہیم نے یہ دلیل علی ہی کے حق میں دی تھی اور انھیں ہی اپنا رب کہا

تھے اور وہ علی ہی کو اپنا رب جانتے اور مانتے تھے۔

رب موسیٰ

سورۃ اعراف ۱۴۳ "اور جب ہمارے مقررہ وقت پر موسیٰ آیا اور اُسکے رب نے اُس سے کلام کیا، موسیٰ نے کہا (رب ارنی انظر الیک) اے میرے رب تو مجھے دکھا کہ میں تجھے دیکھ لوں۔ (قال لن ترانی) فرمایا تو مجھے ہرگز نہ دیکھ سکے گا لیکن تو پہاڑ کی طرف نظر کر، پس اگر یہ اپنی جگہ پر ٹھہرا رہا تو تو مجھے عنقریب دیکھ لے گا، پس جب اُسکے رب نے پہاڑ پر اپنے نور کا چمکارا ڈالا (تجلی کی) تو اسے ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ بیہوش ہو کر گر پڑا"۔

پہلی بات تو خود اِس آیت کے پہلے ٹکڑے پر غور کرنا ہے "اور جب ہمارے مقررہ وقت پر موسیٰ آیا"۔ اِس جملے میں متکلم کون ہے؟ پھر "اُسکے رب نے اُس سے کلام کیا"۔ اِس جملے میں "اُسکا رب" کون ہے؟ یہ سوچنے کی بات ہے لیکن جملے کا قرینہ بتا رہا ہے کہ یہ دونوں الگ الگ شخصیات ہیں ورنہ یہ جملہ یوں ہونا چاہیئے تھا کہ "اور جب ہمارے مقررہ وقت پر موسیٰ آیا اور ہم نے اُس سے کلام کیا"۔ یا پھر یوں ہوتا کہ "اور جب اپنے رب کے مقررہ وقت پر موسیٰ آیا اور اُسکے رب نے اُس سے کلام کیا"۔ دوسری بات یہ کہ اِس سے ثابت ہو رہا ہے کہ موسیٰ اپنے رب سے کلام کیا کرتے تھے۔ اُسی کی بات سنا کرتے تھے اور اُسی کو جواب دیا کرتے تھے۔

کلام اور قول میں فرق

کلام اس معنی کو کہتے ہیں جو متکلم کے ذہن میں ہوتا ہے جو دوسروں تک پہنچتا ہے اور قول ان الفاظ اور آواز کو جن کے ذریعے سے کلام کو سامع تک پہنچایا جاتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ قول کے لئے الفاظ کی ضرورت ہے۔ زبان کی ضرورت ہے اور آواز کی ضرورت ہے۔ جس کا کلام ہوتا ہے اسے متکلم کہتے ہیں اور جس کا قول ہوتا ہے اسے قائل کہتے ہیں۔ مخلوق کی صورت میں عام طور پر متکلم اور قائل ایک ہی شخص ہوتا ہے لیکن خالق کی صورت میں کلام تو ہمیشہ خالق کا ہوتا ہے لیکن قول کو خالق سے براہ راست منسوب نہیں کیا جا سکتا کیونکہ وہ اعضاء و جوارح سے منزہ و مبرا ہے۔ اسی لیے اس نے علی کو اپنی زبان قرار دیا تاکہ وہ کلام قول کی صورت اختیار کر سکے۔ لہٰذا جب بھی علی بولے گا تو کلام اللہ کا ہوگا اور قول علی کا۔ اور اسی سے سمجھئے کہ قرآن مجید میں جہاں جہاں بھی اللہ کی طرف کسی قول کو منسوب کیا گیا ہے وہ حقیقتاً علی ہی کا قول ہے۔ مثلاً "واذقال ربك للملئكة انى جاعل فى الارض خليفه"۔ یا "قال انى جاعلك للناس اماما"۔ حضرت موسیٰ بھی باقاعدہ آواز سنتے تھے اور ان کا جواب دیتے تھے۔ چونکہ آواز اللہ کی نہیں ہو سکتی بلکہ یہ اس لسان کی آواز تھی۔ وہ مقامات ہیں جہاں موسیٰ نے اپنے رب سے بات کی ہے۔ ایک تو وہ شجر جس سے آواز آرہی تھی اسے "شجرۃ اللہ" کہتے ہیں اور زیارت امیر المومنین میں ہے

جملہ موجود ہے۔ "انا الامام طیب یا شجرۃ الحمد"۔ دوسرے ایک آگ تھی جہاں سے حضرت موسیٰ کو آواز آیا کرتی تھی۔ کا ذکر سورہ نمل کی آٹھویں آیت میں ہوا ہے۔ "پس جب وہ اس کے پاس آیا آواز دی گئی کہ جو آگ میں ہے وہ اور جو اس کے ارد گرد ہے برکت دیا گیا ہے"۔ یہ آیت بتاتی ہے کہ آگ سے باقاعدہ آواز آتی تھی اور اس آگ میں کوئی تھا اور اس آگ کے ارد گرد بھی چند ہستیاں موجود تھیں۔ اس آیت میں لفظ "بورک" استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی ہیں "اسے برکت دی گئی"۔ ثابت ہوا کہ جو برکت دیا گیا ہے وہ اور ہے اور برکت دینے والا کوئی اور ہے۔ چونکہ برکت دینے والا اللہ تعالیٰ ہے اس لئے جو آگ میں تھا اور موسیٰ سے کلام کر رہا تھا وہ اللہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ لامحالہ وہ کوئی اور ہے جس کو اللہ نے برکت دی اور وہ اللہ کی برکت کا مخزن تھا۔ یہ کون ہو سکتا ہے سوائے اس کے جو یہ دعویٰ کرے کہ "انا صاحب الطور" "انا ذلک النور الظاہر"۔ (میں ہی صاحب طور ہوں اور میں ہی وہ نور ہوں جو ظاہر ہوا تھا)۔ وہ جو یہ کہے کہ "انا ذلک النور الذی اقتبس موسیٰ منہ الہدیٰ" (میں ہی وہ نور ہوں جس سے موسیٰ ہدایت حاصل کیا کرتے تھے۔) (خطبہ افتخار) پس شجر ہو یا آگ دونوں صورتوں میں حضرت امیر المومنین ہی تھے جو موسیٰ سے کلام کیا کرتے تھے اور یہیں سے "ان کے رب نے ان سے کلام کیا" کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے جیسا کہ سورہ طٰہٰ کی آیت ۱۱ میں ارشاد ہوا "پس جب وہ اس آگ کے پاس آیا تو اسے آواز دی گئی کہ اے موسیٰ یقیناً میں تمہارا رب ہوں"۔

یہ ایک جملہ معترضہ تھا جو کلام اور قول کے ضمن میں عرض کیا گیا لیکن ہمیں یقین ہے کہ جو لوگ حقائق دین کی جستجو میں لگے رہتے ہیں وہ اس کتاب پر ہی اکتفا نہیں کریں گے بلکہ قرآن میں وہ مقامات تلاش کریں گے جہاں اللہ نے اپنے لئے لفظ ''قول'' استعمال فرمایا ہے اور اس طرح مقامات پر المؤمنین کی سیر کریں گے۔ ہم نے اپنے ان درمیانی بیانات کی الجھن کے لئے جو وہم کے سمندروں میں اترنے سے خوف کھاتے ہیں انتہائی اختصار سے کام لیا ہے اور اشارات پر اکتفا کیا ہے۔ بہت سی باتیں ہیں جو ہم نے چھپائی ہیں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ قول کی بات تو اپنے مقام پر صحیح ہے لیکن جہاں تک خود کلام کا تعلق ہے تو کلام بذات خود تحت مشیت ہوا کرتا ہے اور مشیت خدا کون ہے یہ آپ سب جانتے ہیں۔

بہر حال گفتگو سورہ اعراف کی آیت پر تھی اور عرض یہ کرنا ہے کہ موسیٰ کوئی معمولی ہستی نہیں تھے۔ وہ نبی تھے۔ رسول تھے۔ صاحب کتاب تھے۔ صاحب شریعت تھے۔ صاحب کلمہ تھے۔ امام تھے۔ کلیم اللہ تھے۔ ان کے بارے میں یہ گمان کرنا کہ وہ اللہ کو دیکھنے کی تمنا کریں گے انتہائی نادانی اور ذات پاک کی توہین کے مترادف ہے۔ انھوں نے کہا تھا۔ ''رب ارنی'' (اے میرے رب مجھے نظر آ جا)۔ اگر یہ ''رب'' بذات خود قابل رویت ہوتا تو جواب یہ آنا چاہئے تھا کہ ''میں ہرگز نظر نہیں آسکتا''۔ لیکن جواب جو آیا وہ موسیٰ کی نسبت سے آیا۔ یعنی ''تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتے''۔ مراد یہ ہے کہ تم میں وہ استعداد نظری نہیں جو میرے دیدار کو برداشت

رکھے۔ اس کے بعد ارشاد ہوا "فلما تجلی ربہ" ہم نے اس کا ترجمہ قرآن
مجید سے نقل کیا ہے۔ مترجمین اکثر کرتے ہیں اور ہر آیت لگا کر مفہوم کچھ کا کچھ کر دیتے ہیں
اور اس کا حقیقی ترجمہ یہ ہے کہ "پس جب اس کے رب نے تجلی کی"۔ یعنی جب اس کے رب
نے اپنا جلوہ دکھایا۔ جب اس کے رب نے اپنی شان دکھائی۔ جلوہ اور شان چہرے سے
ظاہر ہوتی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کوئی اور نہیں بلکہ خود رب تھا جس نے اپنے
چہرے کی ایک جھلک کی تجلی دکھائی اور موسیٰ کے ناطے سے باریک تر سوراخ سے اس کے
جلوے کی چھوٹ پہاڑ پر پڑی۔ یعنی اتنا سا بھی دیدار کر لینا موسیٰ کے بس کی بات
نہیں تھی اس لئے یہ چھوٹ موسیٰ پر نہیں بلکہ پہاڑ پر ڈالی گئی جو خود بھی اس کی تاب نہ لا سکا
اور ریزہ ریزہ ہو گیا اور حضرت موسیٰ کا خدشہ فدیہ بن گیا۔ پھر ذرا اس کی بعدی عظمت کا
تصور کیجئے جس کے لئے ارشاد ہوا "نظر اس کی زیادہ بھی ہوئی اور نہ حد سے نکل گئی (بے
خود ہو گیا)۔ یقیناً اس نے اپنے پروردگار کی آیات میں سے بہت بڑی کو
دیکھی"۔ (نجم ۸)۔

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک ہی جواب

جب ہم کہتے ہیں کہ ہم نے فلاں شخص کو دیکھا تو یقیناً مطلب یہی ہوتا ہے کہ ہم نے
اس کا چہرہ دیکھا کیونکہ ہر کسی کی پہچان اس کا چہرہ ہی ہوتا ہے اور اس کا تمام جلال و جمال
چہرے سے ہی ظاہر ہوتا ہے۔ یہاں ہم عمدۃ المطالب جلد ا، صفحہ ۳۳۲ سے ایک

اقتباس پیش کرتے ہیں جو ہمارے قارئین کے لئے دعوتِ فکر ہے۔

''ابو زبیر سے ایک روایت ہے کہ میں رسول اللہ کے دراز گوش (گدھے) کے پیچھے جاتا تھا (چل رہا تھا)۔ آپ دراز گوش سے باتیں کرتے تھے اور دراز گوش آنحضرت سے باتیں کر رہا تھا۔ آپ کا ارادہ غیط میں جانے کا ارادہ تھا۔ جب دونوں (مقامات) کے درمیان پہنچ گئے تو فرمایا ''اے معبود! مجھے وہ شخص دکھا دے'' یہ تین مرتبہ فرمایا چوتھی مرتبہ فرمایا ''اے میرے معبود! مجھے پناہ جو دکھا دے'' فوراً ہی حضرت امیر المومنین کھجوروں کے درمیان سے نکلے اور آنحضرت کو گلے لگا لیا اور رسول اللہ نے علی کو گلے لگایا اور دوست سے لپٹے ہوئے من کر رہے''۔

ہم نے صرف روایت نقل کر دی۔ اس پر غور کرنا آپ کا کام ہے کہ کیا رسول اللہ کو کوئی بے قراری کیوں تھی جبکہ حضرت امیر المومنین ہر وقت آپ کے ساتھ ہی رہتے تھے؟۔ اور ''میرے معبود مجھے پناہ جو دکھا دے'' کا مطلب کیا ہے؟۔ اس کے بعد دیکھئے کہ مومنین خود اپنے لئے کیا مانگتے ہیں۔

مفاتیح الجنان صفحہ ۲۵۴۔ ''اے معبود! مجھے ان لوگوں میں قرار دے جنکو تو نے اپنے چہرے کا نظارہ کرنے کا شرف بخشا''۔

ملاقاتِ رب

ملاقات رب کے بارے میں قرآن مجید میں لاتعداد آیات موجود ہیں جنکو نقل کرنا

ہمارے لئے ممکن نہیں اور نہ ہی اس کا کوئی فائدہ ہے۔ اس لئے اس مقام پر ہم صرف ایک آیت پر اکتفا کرتے ہیں کیونکہ ہمارے مطلب کے لئے یہی آیت کافی ہے۔

۳۰:۸۔ "آدمیوں میں سے اکثر اپنے رب کی ملاقات کے منکر ہیں"۔

اس آیت سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ رب سے ملاقات ضرور ہونی ہے لیکن اس ملاقات کا یقین بہت ہی کم لوگوں کو ہے جبکہ اکثریت اس ملاقات کی منکر ہے۔ جو لوگ اس ملاقات کے منکر ہیں ان سے ہمیں کوئی مطلب نہیں۔ البتہ جن لوگوں کو اس کا یقین ہے ان سے ہم ضرور بات کریں گے اور ان سے پوچھیں گے کہ رب سے ملاقات کا وہ کیا مطلب لیتے ہیں؟۔ اگر وہ "ملاقات" کو مجازی لیتا ہے اور اس صورت میں تو وہ بھی منکر ملاقات ہی ہوگا۔

سب سے پہلے ہم دیکھتے ہیں کہ لفظ "ملاقات" کے معنی کیا ہیں۔ لغت میں اس کے معنی ہیں "استقبال کرنا۔ پانا۔ دیکھنا۔ آمنے سامنے آنا اور ملنا"۔ ان سب سے جو خلاصہ نکلتا ہے وہ ہے "جسم و جسمانیات کے ساتھ آمنے سامنے ہو کر دیکھتے ہوئے ملنا"۔ اس معنی کی روشنی میں اگر "ملاقات رب" کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تو پہلی نظر میں ہی یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ یہاں رب سے مراد اللہ تبارک و تعالیٰ ہرگز نہیں ہو سکتا کیونکہ اللہ سے اس قسم کی ملاقات کے بارے میں سوچنا بھی شرک و کفر کے زمرے میں آتا ہے۔ لہٰذا تلاش کرنا پڑے گا کہ یہ رب کون ہے؟۔

سورۂ دہر آیت ۲۱۔ "وسقٰھم ربّھم شراباً طھوراً" ۔ترجمہ۔ "اور انہیں ان کا
رب پاکیزہ شراب پلائے گا"۔

اس آیت کی تفسیر میں موصوف فرماتے ہیں۔ "لوگوں کے سردار علی ابن ابی طالب ہیں اور وہی انہیں شراب طہور پلائیں گے"۔ (عمدۃ المطالب جلد ۱ صفحہ ۳۱)۔

پس معلوم ہو جانا چاہئے اور تسلیم ہو جانا چاہئے اور یقین آ جانا چاہئے کہ جس رب سے ہمیں ملاقات کرنا ہے وہ حضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالب کے سوا کوئی نہیں جن کے ہاتھوں سے ہم شراب طہور پئیں گے اور جنکے قربت و دیدار کے ہم پیاسے ہیں۔

یہ بات ہم نے اتنی آسانی سے بہ دلی اسے کہتے ہوئے مفسرین و محدثین ہمیشہ شرماتے ہیں۔ اور وہ کیوں نہ شرمائیں جبکہ ان کے دل میں چور ہے۔ سورہ قیامت کی آیت ۲۲ کے سلسلے میں بھی عجب مضحکہ خیز رویے دیکھنے میں آتے ہیں ان پر ہنسی بھی آتی ہے اور رونا بھی۔ اس آیت میں ارشاد ہوتا ہے۔ "بہت سے چہرے اس دن ترو تازہ ہوں گے۔ وہ اپنے رب کو دیکھنے والے ہوں گے"۔ اس آیت میں کئی شیعہ دوستوں نے رب سے مراد اللہ تعالیٰ کو لیا ہے۔ لیکن غیر شیعہ حضرات تو مزے میں رہتے ہیں کہ وہ تو پہلے ہی رویت باری تعالیٰ کے قائل ہیں اس لئے آرام سے بیٹھے ہوئے اللہ تعالیٰ کے دیدار کا انتظار کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ہم جو دنیا میں اسے نہیں دیکھ پاتے تو اس کا سبب مادیت کے وہ کثیف پردے ہیں جن میں ہم بحیثیت انسان لپٹے ہوئے ہیں لیکن قیامت میں جب یہ کثافتیں ختم ہو جائیں گی تو ہم اللہ کو ضرور دیکھیں

گے۔ مگر اصل مصیبت شیعوں کے لئے یہ ہے کہ ان کے عقیدے کے مطابق اللہ تعالیٰ بلند ذات ناقابل رویت ہے چاہے آنکھیں ہوں یا نہ ہوں اور نقلی دلیل سورۂ انعام کی آیت ۱۰۳ ہے جس میں اللہ فرماتا ہے: ''اسے (یعنی اللہ کو) آنکھیں نہیں پا سکتیں اور وہ آنکھوں کو پا لیتا ہے''۔ یہاں لفظ ''ابصار'' میں وہم و گمان و خیال بھی آ جاتے ہیں۔ اللہ جو وہم و گمان میں بھی نہ آ سکے وہ بینائی کی گرفت میں کیسے آ سکتا ہے؟ سورۂ قیامت کی آیت میں ''رب'' سے مراد ''اللہ'' لے کر شیعہ بڑی مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔ انہیں اول تو اپنے اس عقیدے کا دفاع کرنا پڑ رہا ہے کہ اللہ قابل رویت نہیں ہے اور دوسری طرف حضرت امیر المومنین کو بھی راستے سے ہٹانا پڑ رہا ہے اور ان کا حساب غیر کا وہ خوف ہے جو شیعوں کے دلوں پر بری طرح بیٹھا ہوا ہے اور جس کی بنا پر کئی عقائد شیعہ کو ملیامیٹ کرنا پڑا ہے۔ چنانچہ اب اس آیت کی بھی طرح طرح کی تاویلیں شروع ہوئیں اور ارشادات معصومین کو پس پشت ڈال کر قیاس کی جوڑ توڑ کا سہارا لیا گیا۔ مقصد صرف یہ تھا کہ غیروں کے نشانے سے بچا جائے۔ اس مقصد کے لئے اول تو اس آیت کا ترجمہ ہی غلط کیا گیا ہے اور ''رب کو دیکھنے والے'' کی جگہ ''رب کی نعمتوں کو دیکھنے والے'' کر دیا گیا حالانکہ نعمتوں کا آیت میں نہ ذکر ہے اور نہ قرینہ۔ اس سے بھی کام نہ بنا تو یہ کہا جانے لگا کہ اس آیت میں لفظ ''رویت'' نہیں ہے بلکہ ''ناظر'' ہے جس کے معنی ہیں ''نظر کرنے والا''۔ مثلاً ہم کسی سے پوچھیں کہ ''کیا کر رہے ہو؟'' وہ کہے کہ ''چاند دیکھ رہا ہوں''۔ اس سے پوچھیں کہ ''چاند نظر آیا؟'' اور

وہ ہے کہ "نہیں"۔ مطلب یہ کہ یہاں دیکھنے سے مراد رویت نہیں بلکہ ڈھونڈنا ہے۔
یہ تاویل کر کے انھوں نے اس بات کا اعتراف کر لیا کہ جو ترجمہ انھوں نے کیا تھا
وہ غلط تھا۔ اس تضاد سے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کی نیت صاف نہیں ہے اور وہ محض
اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں تاکہ فرار کی راہیں رہیں۔ حالانکہ آپ آیت
کو دیکھیں تو اس قسم کا کوئی قرینہ اس میں نہ ملے گا بلکہ پورے قرآن میں جہاں جہاں
"ناظر" یا "نظر" اور اس قسم کے دیگر الفاظ استعمال ہوئے ہیں وہ دیکھنے
ہی کے معنوں میں استعمال ہوئے ہیں۔ پھر پورے قرآن سے ہٹ کر اس آیت میں یہ
تخصیص کیسے ہو جائے گی؟ علاوہ ازیں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ انسان جب کسی شے
کو ڈھونڈتا ہے تو اس کے چہرے پر تفکر کے آثار ہوتے ہیں بلکہ اگر کافی دیر تک وہ
مطلوبہ شے نظر نہ آئے تو چہرے پر جھنجلاہٹ کے آثار پیدا ہونے لگتے ہیں جبکہ
آیت مذکورہ میں صاف کہا گیا ہے کہ "اس دن چہرے تروتازہ ہوں گے"۔ یہ بات بھی
سوچنے کی ہے کہ "ناظر" "فاعل" کے وزن پر ہے جس کے معنی ہیں "مستقل دیکھنے
والا"۔ جب کوئی شخص کسی شے کو تلاش نہ کر سکے تو پھر وہ تلاش کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ ایسی
صورت میں "ناظر" نہیں رہتا جبکہ قرآن ان لوگوں کو ناظر کہہ رہا ہے۔ پھر یہ بھی کہ
اگر مومنین کا دنیا میں ہمیشہ یہی عقیدہ رہا ہو کہ اللہ نظر نہیں آسکتا تو کیا قیامت میں
ان کا عقیدہ بدل جائے گا؟ اگر نہیں تو پھر وہ اللہ کو دیکھنے کی کوشش کیوں کریں

گے؟ اس تمام گفتگو سے یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ مومنین جنت میں اپنے رب کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہے ہوں گے اور مسرور و شاد ہو رہے ہوں گے یوں ان کی ساری زندگی کی تمنا اس روز پوری ہو رہی ہوگی اور اسی لئے ان کے چہرے ترو تازہ ہوں گے۔

ہم سے پوچھو اے جان جاں کیا ہے ملنے کی عید
عمر بھر تکتے رہے ہیں تب نظر آیا ہے چاند

ان علمی و منطقی مباحث سے قطع نظر اور ارشادات معصومین پر نگاہ کی جائے تو یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جائے گی کہ اس آیت میں "نظر" سے مراد "رویت" ہی ہے اس کی بہت سی مثالیں ہمارے پاس موجود ہیں لیکن خوف طوالت سے یہاں صرف تین مقامات کی نشاندہی کی جا رہی ہے جو سمجھنے والوں کے لئے کافی و شافی ہیں۔ یہ تینوں حوالے مفاتیح الجنان سے پیش کئے جا رہے ہیں۔

۱۔ صفحہ ۲۵۳۔ (مناجات مریدین)۔ "پروردگار تیری رضا میرا مقصود ہے اور تیری رویت ہی میری ضرورت ہے اور تیرا قرب میری انتہائی خواہش ہے"۔

۲۔ صفحہ ۲۶۲۔ (مناجات زاہدین)۔ "پروردگار اپنی ملاقات کے دن اپنی رویت سے ہماری آنکھیں ٹھنڈی فرما"۔

۳۔ صفحہ ۲۵۴۔ (مناجات محبین)۔ "میرے معبود! مجھے ان لوگوں میں قرار دے جنکو تو نے اپنے مشاہدے کے لئے چن لیا ہے"۔

چنانچہ شیخ صدوق اپنی کتاب "معانی الاخبار" کے صفحہ ۱۱۲ پر لکھتے ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا۔ "تم لوگ اپنے رب کو اس طرح دیکھو گے جس طرح تم چودھویں رات کے چاند کو دیکھتے ہو اور اسکو دیکھنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی"۔

اس نکتے پر ہم مزید گفتگو کی ضرورت نہیں سمجھتے کیونکہ ائمہ معصومین کا رب ہونا تو اثرات شیعہ سے ہے اور اسی لئے نفح الاسرار جلد ۱ صفحہ ۷۷ پر حضرت امیر المومنین حصول علم کے بارے میں فرماتے ہیں۔ "علم حاصل نہیں کرنا چاہئے مگر اپنے رب (آلِ محمدؐ) سے"۔

<u>شہادت ولایت علیؑ</u>

یہ صرف چند جملوں کی زحمت ہے کیونکہ ہم اس بات کو اپنی شرعی اور ایمانی ذمہ داری سمجھتے ہیں کہ اس نکتے کی طرف مومنین کی توجہ مبذول کراتے رہیں اور آپ کو ہماری ہر کتاب میں یہ موضوع ضرور ملے گا۔

بات یہ ہے کہ ولایت امیر المومنین اصل اصول دین تو ہے ہی لیکن یہ سمجھنا انتہائی ضروری ہے کہ <u>ولایت علیؑ پر ایمان رکھنا اور انکی شہادت دینا دو الگ الگ چیزیں ہیں اور ان میں سے کوئی ایک دوسری کی نیابت نہیں کر سکتی</u>۔ پھر شہادت بھی دو قسم پر مشتمل ہے۔ ایک قولی شہادت اور دوسری عملی شہادت۔ قولی شہادت یہ ہے کہ جب بھی توحید و رسالت کی شہادت دی جائے تو فوراً ولایت کی شہادت بھی دی جائے

اور اس شہادت کو ہم کشف المسائل میں اچھی طرح ثابت کرتے ہیں۔ عملی شہادت یہ ہے کہ انسان کے افعال و اعمال سے ولایت علی ظاہر ہوتی ہو اور اس کی آخری حد انسان کا وہ عمل ہے جب وہ اس ولایت پر قائم رہتے ہوئے اپنی جان تک قربان کرنے سے دریغ نہ کرے۔ جہاد فی سبیل اللہ اسی کا نام ہے اور شہید فی سبیل اللہ اسی کو کہتے ہیں کیونکہ جو امر ثابت ہے کہ سبیل اللہ سے مراد حضرت امیر المومنین علی کی ذات ہی ہے اور شہید فی سبیل اللہ وہ ہے جو علی محبت و ولایت کی راہ میں جان دے دے۔

ہم نے کشف الاعتقاد میں ثابت کیا تھا اور اب پھر عرض کرتے ہیں کہ اس تمام سلسلۂ نبوت سے مقصد خداوندی صرف ولایت کا تعارف کرانا تھا۔ جس اس شہادت کو چھپانا اور اصل مقصد خداوندی کو ناکام بنانے کی ناپاک کوشش ہے۔ اس ولایت کے تعارف کے لئے انبیاء کرام نے جو درد ناک تکالیف اٹھائی ہوں۔ جتنی خطرات جو نبیوں کی مرتکب قتل ہوئے ہوں اور جنکے ادوار میں معمولی سی تاخیر کی وجہ سے محبوب کبریا حضرت محمد مصطفیٰ کو اللہ کی طرف سے دھمکی ملتی ہو۔ اس شہادت کو چھپانے والے کا ٹھکانا کہاں ہوگا یہ بات خود اسے ہی سوچنا چاہئے۔ چنانچہ بقرہ ۱۴۰ میں ارشاد ہوتا ہے۔ "اور اس سے زیادہ ظالم کون ہوگا جس کے پاس اللہ کی طرف سے ایک گواہی ہو اور وہ اسے چھپائے"۔

کبھی کبھی قرآن مجید میں غور و تدبر کرلینے سے صحت اعراب نہیں ہو جاتی۔ اس بات کا

میں یقین رکھتا ہوں۔ یہ پیچیدہ معاملات ہیں اس لئے ان سے سرسری طور پر نہیں گزرنا چاہئے اور سوچنا چاہئے کہ اللہ کی طرف سے وہ کونسی گواہی لوگوں کے پاس ہے جسے وہ چھپاتے ہیں؟ کیا وہ توحید کی گواہی ہے؟ کیا وہ رسالت کی گواہی ہے؟ ہر عقل یہ گواہی دے گی کہ یہ گواہیاں پوشیدہ نہیں ہیں جنکو لوگ چھپاتے ہیں بلکہ یہ تو وہ گواہیاں ہیں جو ہر مسلمان خواہ وہ خارجی یا ناصبی ہی کیوں نہ ہو ظاہر کرتا ہے اور خوشی خوشی دیتا ہے یہاں تک کہ لشکر یزید بھی یہ گواہیاں دیا کرتا تھا۔ چنانچہ وہ شہادت کونسی ہے جسکو لوگ چھپاتے ہیں اور جسکی طرف خداوند علیم و حکیم اشارہ فرما رہا ہے اور صرف متوجہ کرنے پر ہی اکتفا کیا جائے تو مسلمہ خود گواہی دے گا کہ وہ گواہی ہے جسے پہلے سب چھپانے کے درپے ہیں وہ صرف شہادت ولایت علیؑ ہے اور یہ شہادت اتنی غیر ضروری نہیں جتنا کہ لوگ سمجھتے ہیں یا جیسا کہ شیطان ذہن میں ڈالتا ہے تو پھر اللہ کو کیا پڑی تھی کہ ہر ہر مرحلے پر اپنے بندوں سے یہ گواہی لیتا۔ حضرت ختمی مرتبت کو متعدد بار معراج ہوئی ہے اور ہر بار یہی گواہی دلوائی گئی ہے۔ میں تفصیل میں نہیں جانا چاہتا صرف ایک حدیث نقل کر رہا ہوں جو تفسیر فرات صفحہ ۵ سے اخذ کی گئی ہے۔

''جناب سیدہ کونینؑ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا۔ ''معراج کی رات میں جب سدرۃ المنتہیٰ کے مقام پر پہنچا تو میں نے اذان دو دو دفعہ اور اقامت کی فصل کو ایک ایک مرتبہ سنا۔ میں نے ایک آواز دینے والے کی آواز کو سنا۔ ''اے میرے فرشتو!

میرے آسمانوں اور میری زمین میں رہنے والو اور میرے عرش کو اٹھانے والو گواہی دو کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں۔ میں اکیلا ہوں میرا کوئی شریک نہیں"۔ انھوں نے کہا کہ ہم گواہی دیتے ہیں اور اقرار کرتے ہیں۔ فرمایا "میرے فرشتو! میرے آسمانوں اور زمین میں رہنے والو اور میرے عرش کو اٹھانے والو گواہی دو کہ محمد میرے بندے اور رسول ہیں"۔ انھوں نے کہا کہ ہم گواہی دیتے ہیں اور اقرار کرتے ہیں۔ فرمایا "میرے فرشتو! میرے آسمانوں اور زمین میں رہنے والو اور میرے عرش کو اٹھانے والو گواہی دو کہ علی میرے اور میرے رسول کا اور مومنین کا میرے بعد ولی ہے"۔ انھوں نے کہا کہ ہم گواہی دیتے ہیں اور اقرار کرتے ہیں"۔

اس حدیث سے یہ بات واضح ہوئی کہ اقرار اور چیز ہے اور گواہی دوسری چیز۔ یہ ایک دوسرے کا بدل نہیں ہو سکتیں اور مومن کہلانے کے لئے دونوں ضروری ہیں۔ پس اگر کوئی شخص اقرار ولایت کرے لیکن شہادت ولایت کو چھپائے تو یہ شخص یقیناً ظالم ہے بلکہ ظلم کے زمرے میں آئے گا۔ علی ذکر اللہ ہیں اور ذکر اللہ کو چھوڑ کر جتنی بھی عبادتیں کی جائیں گی وہ سب کی سب عبادت شیطان کہلائیں گی اور ان کے بارے میں اللہ نے سوال کیا ہے کہ "اے بنی آدم! کیا میں نے تم سے عہد نہیں لیا تھا کہ شیطان کی عبادت نہ کرنا؟"۔

ذکر

ذکر پر ہم نے گفتگو کر لی ہے یعنی اس سے نکلنے والے نتائج سے ہمیں کئی نقوش میں مدد لینا ہے۔

قرآن مجید میں لفظ ذکر دو طریقوں پر استعمال ہوا ہے۔ کہیں یہ مفرد آیا ہے اور کہیں مرکب۔ یعنی کہیں صرف "ذکر" آیا ہے اور کہیں "ذکر اللہ، ذکر الرحمٰن اور ذکر ربہ" استعمال ہوا ہے۔ جہاں یہ مفرد طریقے پر آیا ہے یعنی صرف "ذکر" وہاں اس کے دو معنی نکلتے ہیں۔ ایک "قرآن" اور دوسرے "رسول"۔ مثلاً سورہ حجر کی آیت ۹ میں ارشاد ہوا: "انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون" یعنی ہم نے ہی ذکر کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

یہاں ذکر سے مراد قرآن مجید ہے۔ اسی طرح سورہ طلاق آیات ۱۰ اور ۱۱ میں ارشاد ہوتا ہے: "یقیناً اللہ تعالیٰ نے تمہاری طرف ذکر کو نازل کیا ہے جو رسول ہے۔ وہ تم پر اللہ تعالیٰ کی واضح آیات پڑھتا ہے الخ"۔

یہاں ذکر سے مراد ذات ختمی مرتبت ہے۔ لیکن جہاں جہاں اللہ نے ذکر کو اپنی طرف منسوب کیا ہے جیسے "ذکر اللہ"، "ذکر الرحمٰن"، "ذکر ربہ" یا "ذکری" وغیرہ تو وہاں مراد حضرت امیرالمومنین ہیں۔ ایسی مثالیں ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں۔

طٰہٰ ۱۲۴: "اور جو کوئی میرے ذکر سے روگردانی کرے گا تو یقیناً اس کی زندگی تنگی میں

بسر ہوگی وہ قیامت کے دن اندھا محشور کیا جائے گا"۔

تفسیر فرات صفحہ ۳۷۱ پر امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں: "اور علیؑ کی ولایت چھوڑ دی تو خدا تعالیٰ اس کو اندھا اور نہ سننے والا بہرا بنائے گا۔ ذکری (میرا ذکر) رسول اللہ کی زبان پر علیؑ ابن ابی طالبؑ مراد ہیں"۔

تفسیر صافی صفحہ ۳۲۴ پر بحوالہ کافی اللہ تعالیٰ کے اس قول کی تفسیر میں معصوم فرماتے ہیں: "ذکری سے مراد ولایت علی ابن ابی طالبؑ ہے اور اندھے سے مراد آخرت میں آنکھوں کا اندھا ہونا نہیں ولایت امیر المومنین کی طرف سے دل کا اندھا پن ہے"۔

۲۔ عنکبوت ۴۵ میں "یقیناً نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے اور ضرور اللہ تعالیٰ کا ذکر اکبر (سب سے بڑی چیز) ہے"۔

معصوم اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: "نحن ذکر اللہ ونحن اکبر"۔ یعنی ہم ہی اللہ کا ذکر ہیں اور ہم ہی اکبر ہیں۔ (اثبات ولایت علی صفحہ ۸۰ بحوالہ مرآۃ الانوار، تفسیر برہان، کتاب المجدین)۔

۳۔ جمعہ ۹۔ "اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو جب جمعے کے دن نماز کے لئے ندا دی جائے تو تم اللہ تعالیٰ کے ذکر کی طرف دوڑ پڑو الخ"۔

امام محمد باقرؑ اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں: "ذکر اللہ امیر المومنین ہیں"۔ (اثبات ولایت علی صفحہ ۸۰ بحوالہ اختصاص)۔

۴۔ طٰہٰ۔ "جو شخص اپنے رب کے ذکر سے منہ پھیرے گا اسے تنگ ترین عذاب

بھگتنا پڑے گا"۔

ابن عباس سے روایت ہے کہ "اس آیت میں "ذکر رب" سے مراد ولایت علی ابن ابی طالب ہے"۔ (دلائل الدین ولایت امیر المومنین صفحہ ۳۴۴)

ہم نے یہاں صرف چار مقامات کا ذکر کیا جو سمجھنے والوں کے لئے کافی ہے اور اب اس بات پر مزید بحث کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی کہ "ذکر اللہ" حضرت امیر المومنین ہیں۔ اور اب اس "ذکر اللہ" کے بارے میں چند آیات اور روایت آپ کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہیں تا کہ آپ کے دلوں کو سکون پہنچے۔

۱۔ زخرف ۳۶: "اور جو شخص رحمن کے ذکر سے اندھا ہو جاتا ہے ہم اس کے لئے ایک شیطان مقرر کر دیتے ہیں۔ جو اس کا ہم نشین ہوتا ہے"۔

پس جو شخص بھی علی کے ذکر سے غافل نظر آئے۔ تو سمجھ لیں کہ اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی شیطان ضرور لگا ہوا ہے اور اگر آپ تھوڑی سی جستجو کریں گے تو انشاء اللہ وہ شیطان نظر بھی آ جائے گا جس کی وضاحت اگلی آیت سے ہو رہی ہے۔

۲۔ زمر ۴۵: "اور جس وقت خدائے واحد کا ذکر کیا گیا تو جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہیں ان کے دل نفرت کرنے لگے اور جب اس کا ذکر کیا گیا جو اس کے سوا ہیں تو وہ خوش ہو جاتے ہیں"۔

اس بارے میں ہم کچھ بتانے سے قاصر ہیں۔ جو شے آپ کو اس آیت کا مفہوم بتائے گی وہ صرف اور صرف آپ کا مشاہدہ ہے۔

۳۔ منافقون ۹۔ "اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو تمہیں تمہارے مال اور تمہاری اولاد اللہ کے ذکر سے غافل نہ کریں اور جو ایسا کرے گا وہی نقصان اٹھانے والے ہیں"۔
اس آیت سے آپ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ ذکر سے ایک لمحے کے لئے بھی غافل نہیں رہا جا سکتا کیونکہ یہ وہ ذکر ہے جو ہر حال میں جاری رہتا ہے اور انسان چاہے کوئی کام بھی کر رہا ہو مگر دھیان ذکر کی طرف رہنا چاہئے۔
۴۔ رعد ۲۸۔ "جو لوگ ایمان لائے ان کے دل اللہ کے ذکر سے مطمئن ہوتے ہیں۔" کا مطلب ہے کہ دل اللہ کے ذکر سے اطمینان پاتے ہیں"۔
تفسیر قمی میں ہے کہ اس آیت میں "الذین آمنوا" سے مراد شیعہ ہیں اور ذکر اللہ امیر المومنین اور ائمہ معصومین ہیں۔
اس آیت پر اگر میں چاہوں تو بہت کچھ لکھ سکتا ہوں مگر شاید اس سے میرا اصل مقصد نظر انداز کر دیا جائے۔ لیکن مختصراً یہ عرض کروں کہ قرب الی اللہ کے کئی مراحل ہیں۔ اوّل ایمان اور ایمان کے بہت سے درجات ہیں مثلاً ایمان بالغیب۔ ایمان بالتصدیق اور ایمان بالمعرفت۔ ان تمام مراحل سے گزرے تو انسان مومن ممتحن کہلاتا ہے۔ دوم یقین اور اس کے بھی تین درجات ہیں۔ علم الیقین۔ عین الیقین اور حق الیقین۔ اور یقین کے بارے میں فرمان معصوم یہ ہے کہ اللہ نے اپنی مخلوق میں جو شے سب سے کم تقسیم کی ہے وہ یقین ہے۔ اس یقین کے بعد اطمینان ہے۔ اس اطمینان کے بھی درجات ہیں۔ مثلاً اطمینان قلب اور اطمینان نفس۔ اس آیت میں اطمینان

قلب کی بات کرتی ہے۔ یہ وہی اطمینان ہے جو حضرت ابراہیم نے اپنے رب سے مانگا تھا۔ لیکن مومن ہے کہ انھیں بھی یہی جواب ملا تھا کہ "الا بذکر اللہ تطمئن القلوب"۔ اب آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ اطمینان کتنا ارفع و اعلیٰ مقام ہے۔ اللہ نے حضرت ابراہیم کو عالم ملکوت کی سیر کرائی تھی اور علی کی ولایت کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر لینے کے بعد ہی انھیں اطمینان قلب عطا ہوا تھا اور یہی وہ وقت تھا جب انھوں نے دعا کی تھی کہ "پروردگار مجھے علی کے شیعوں میں قرار دے"۔ جس کی سند انھیں عرش سے ملی تھی کہ "وان من شیعتہ لابراہیم"۔ مومن بھی اپنے ظرف اور استطاعت کے مطابق مقامات ولایت کی سیر کرتا ہے اور اس بات کا یقین کر لیتا ہے کہ کائنات حقیقت ہے تو وہ ذکر کے بجائے "علی۔ علی۔ علی" کی صدا دیتا ہے۔ جس شخص پر یہ کیفیت طاری ہے وہ میری تصدیق کرے گا۔ باقی لوگ تو شاید صرف مسکرا کر رہ جائیں۔ لیکن وہ لوگ بھی اس بات کو آزمائیں اور پھر یقین کریں کہ کسی کی پریشانی اور کسی کی تکلیف کیوں نہ ہو۔ ایک بار سب کچھ بھول کر پوری توجہ سے "یا علی" ہو جائے، پھر دیکھو کہ پریشانیاں اور تکالیف کیسے بھاگتی ہیں۔ اور کیوں نہ ہو جبکہ خود اللہ نے یہ گارنٹی دے دی ہو کہ "الا بذکر اللہ تطمئن القلوب"۔

۵۔ مفتاح الجنان صفحہ ۱۱۱ "وہ جس کا ہم وطن ہے وہ جس کا وزیر تھا"۔

ہم اپنی گفتگو ہم انشاءاللہ آئندہ اوراق میں کریں گے لیکن یہ سمجھئے کہ وہ ہم ہر مرض کی

وہ جو چاہتا ہے وہ مرض جسمانی ہو نفسانی ہو یا روحانی۔ اور کمال کی بات یہ ہے کہ وہ جنتی ہوتی ہے اور شفا بھی ہوتی۔ یعنی علی اللہ سے مانگنا ہوتا ہے اور علی کا ملنا جانا شفا ہے۔

۶۔ مفاتیح الجنان صفحہ ۱۴۸۔ "اے اللہ میں تیرے ذکر کے ذریعے تیرا قرب چاہتا ہوں اور تیرے نفس کو تیرے حضور اپنا سفارشی بناتا ہوں"۔

ہماری تمام عبادت کی نیت "قربۃ الی اللہ" ہوتی ہے اور اس دعا سے ثابت ہوتا ہے کہ قرب خدا صرف علی ہی کے ذریعے حاصل ہوتا ہے یعنی ذکر اللہ کی ذات قدس ہے بندہ اگر صرف زبانی کلامی "قربۃ الی اللہ" کہتا ہو تو کیا بات لگ ہے لیکن اگر کوئی حقیقی خواہش دل سے قرب خدا چاہتا ہے تو اسے یہ سب وقت ذہن میں علی کا تصور رکھنا ضروری ہے کیونکہ بغیر علی کے تصور کے "قربۃ الی اللہ" کہنا تو خدا جانے کس کی قربت مل جائے اور انسان یہی سمجھتا رہے کہ اسے قربت خدا ملی ہے۔ اس دعا میں اللہ کے حضور سفارش کے لئے بھی خود اللہ کے نفس کا انتخاب کیا گیا ہے۔ کیا دنیا میں کوئی ایک بھی ایسا شخص موجود ہے جو یہ بتا سکے کہ "نفس اللہ" علی کے علاوہ کوئی اور بھی ہے؟ پس یہ یقین کر لینا چاہئے کہ علی سے فرار ہونا ممکن نہیں ہے۔

۷۔ مفاتیح الجنان صفحہ ۲۰۱۔ "اے وہ جو ذکر کرنے والوں کے لئے معروف ہے"۔

کاش کہ ذکر والوں کو ذکر اُن نظام کو ہوتا ہے جو ہم ہر جگہ ذکر علی کرتے ہیں۔ وہ

دیکھیں کہ انکو جو عزت و شرف مل رہا ہے وہ کس کی وجہ سے مل رہا ہے اور لوگ جو کھنچ کھنچ کر انکی طرف آ رہے ہیں تو کس کی وجہ سے؟ لیکن مومن یہ بات یاد رکھے کہ ذکر کرنے کے لئے منبر پر بیٹھنا ضروری نہیں ہوتا۔ انسان اپنے بستر پر لیٹ کر بھی ذکر علی کرتا ہے اور یہ ذکر بہت خالص ہوا کرتا ہے۔

۸۔ زخرف ۴۳: ''(اے رسول) تم مضبوطی سے تھامے رکھو اس سے جو تیری طرف وحی کی گئی ہے۔ بیشک تو صراط مستقیم پر ہے''۔

عمدة المطالب جلد ۱ صفحہ ۵۰۹ پر اس آیت کی تفسیر میں مصنف فرماتے ہیں۔ ''بیشک علی تیرے لئے اور تیری قوم کے لئے ذکر ہیں۔ عنقریب تم لوگوں سے علی کی محبت کے متعلق سوال کیا جائے گا''۔

اس بات پر غور کرنا چاہئے کہ جب محبوب خدا حضرت ختمی مرتبت تک سے علی کی محبت کے بارے میں سوال کیا جاتا ہے تو ایک عام آدمی اس سے کیونکر مستثنیٰ ہوسکتا ہے؟ لیکن علی کی محبت اسی وقت لائق ہے جب غیر اللہ کی محبت کو دل سے نکال دیا جائے۔

حقیقت نماز

جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں کہ اس موضوع پر گفتگو کرنا ہم اپنا اہم ترین فریضہ سمجھتے ہیں کیونکہ یہی وہ شے ہے جس سے غفلت برتی جارہی ہے اور مومنین سب سے

زیادہ تر کی کے در پے ہے اور اسی لئے ہم نے "ذکر اللہ" پر بات کی ہے تاکہ اس موضوع کو سمجھنا آسان ہو جائے اور قرآن و حدیث سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہو سکے اور ہم سمجھ سکیں کہ نماز کا اصل مقصد کیا ہے اور مسلمان قوم کس طرح بے جا باتوں میں ساری زندگی گزارنے کے بجائے ہم وہ کریں جو مقصود خداوندی ہے کیونکہ مقصد حیات یہ ظاہری حرکات و کلمات کرنا نہیں بلکہ اطاعت خدا کرنا ہے اور اس کے لئے سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ ان احکام سے خداوندی منشا کیا مراد لیا ہے اور سوچا جائے کہ یہ کیا غضب ہے کہ جن کے لئے نماز قائم کی جا رہی ہے خود انہی کو نماز سے نکال دیا جائے اور خداوندی اطاعت کے بجائے ملا کی اطاعت کو اپنی زندگی کا منشور بنا لیا جائے۔

سب سے پہلے تو یہ دیکھا جائے گا کہ نماز پڑھی کس کے لئے جاتی ہے؟ لیکن یہ بات ذہن میں محفوظ رکھنی چاہیے کہ ذکر اللہ حضرت امیر المومنین ہیں۔

۱۔ طٰہٰ ۱۴: "یقیناً میں ہی اللہ ہوں میرے سوا کوئی معبود نہیں۔ پس تم میری ہی عبادت کرو اور میرے ذکر کے لئے نماز پڑھو"۔

اس آیت سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ عبادت خدا کا مطلب ہی یہ ہے کہ ذکر اللہ کے لئے نماز پڑھی جائے اور جس نماز میں یہ ذکر اللہ مفقود ہو وہ اللہ کی عبادت نہیں بلکہ شیطان کی عبادت ہے۔

۲۔ قص ۵: "اور اپنے رب کے اسم کا ذکر کرتا رہا اور نماز پڑھتا رہا"۔

اس آیت میں اسم رب کے ذکر کو نماز کے لئے لازم قرار دیا گیا ہے۔ اندازہ ورق

میں یہ ثابت کیا جائے گا کہ اسم اللہ سے مراد حضرت امیر المومنین ہیں۔ مقصد ظاہر ہو کہ نماز ذکر علی کے علاوہ کوئی شے ہے ہی نہیں۔ اسی لئے معصوم نے ارشاد فرمایا ہے۔ "نحن صلوٰۃ المومنین" یعنی ہم ہیں مومنین کی نماز۔

۳۔ مائدہ ۹۱ "ماسوا اس کے نہیں کہ شیطان شراب اور جوئے کے ذریعے تمہارے درمیان دشمنی اور بغض ڈالنا چاہتا ہے اور تمہیں اللہ کے ذکر اور نماز سے روکتا ہے"۔

اس آیت سے جہاں ذکر اللہ اور نماز کی وحدت کا ذکر کیا گیا ہے وہیں یہ بات بھی سمجھائی گئی ہے کہ مختلف گناہوں سے بچنے کی جو تاکید کی گئی ہے اس کا اصل مقصد یہ ہے کہ انسان ذکر اللہ سے غافل نہ ہونے پائے۔

۴۔ اعلیٰ ۱۴۔۱۵۔ "یقیناً اس نے فلاح پائی جو پاک رہا اور اپنے رب کے نام کا ذکر کیا پھر نماز پڑھی"۔

۵۔ نور ۳۶۔ "یہ گھروں میں جہاں اللہ نے ان کو بلند اپنے نام کا ذکر کرنے اور اس کی تسبیح و تقدیس کی صبح و شام اجازت دے رکھی ہے"۔

حقائق قرآن صفحہ ۲۹۔ رسول اللہ نے فرمایا "یہ گھر انبیاء کے گھر ہیں اور علی و فاطمہ کا گھر نہ صرف انہی گھروں میں سے ہے بلکہ ان تمام گھروں سے افضل ترین گھر ہے۔ (یعنی اس گھر میں اللہ کا اسم بذات خود موجود ہے)"۔

اس سے معلوم ہوا کہ "علی" "ولی اللہ" پڑھنا اور جھنڈا چڑھانا سنت انبیاء ہے۔ اس حدیث میں صرف انبیاء کے گھروں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ مساجد کے بارے میں اللہ کا حکم کیا ہے۔

۱۔ حج ۴۰: "اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے دفع نہ کرتا رہتا تو عیسائی راہبوں کے تکیے اور گرجے اور یہودیوں کے عبادت خانے اور مسجدیں جن میں اللہ کے نام کا بہت ذکر کیا جاتا ہے ضرور ڈھا دیئے جاتے"۔

اس آیت میں مسجدوں کا صرف یہ بتایا گیا ہے کہ ان میں اللہ کے نام کا ذکر کثرت سے کیا جاتا ہے۔ اور ایسی مسجدیں جہاں اللہ کے ذکر سے روکا جائے مسجد ضرار کے مثل ہیں۔ اس آیت سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ عیسائی اور یہودی بھی اپنے اپنے عبادت خانوں میں درحقیقت اللہ کے نام کا ہی ذکر کرتے ہیں چاہے کسی بھی نام سے کریں کیونکہ نام بدلنے سے حقیقت نہیں بدلتی۔

۲۔ بقرہ ۱۱۴: "اس سے بڑھ کر ظالم (اظلم) کون ہوگا جس نے اللہ کی مسجدوں میں اسکے نام کے ذکر کیے جانے کو روکا"۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بظاہر وہ کونسی مسجد ہے جہاں اللہ کا ذکر نہ ہوتا ہو؟ معلوم ہوا کہ مطلوب و مقصود خداوندی اپنے نام کے ذکر کو بلند کرنا ہے اور اس طرح اگر کوئی زندگی بھر مسجد میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرتا رہے لیکن ذکر علی نہ کرنے دے اور اسکے بجائے دوسری کہانیاں بیان کرتا رہے تو وہ اللہ کی نظر میں نہ صرف ظالم بلکہ اظلم ہے اور اگر کوئی شخص چاہتا ہے

کہ خود کو خاطئین میں شامل ہونے سے بچائے تو اسلام کی مسجدوں میں جانے سے احتراز کرنا چاہئے۔

عہد

میرے ایک بزرگ نے مجھ سے سوال کیا ہے کہ اس جملے کا مطلب کیا ہے کہ "محمدؐ آپ محمدؐ حقیقت نما رہیں"۔ اس کا جواب مختصراً دیا جا رہا ہے تاکہ دیگر مومنین بھی مستفید ہو سکیں۔

بات یہ ہے کہ ہمیں یوں ہی کسی معروف مقصد کی طرح اس دنیا میں نہیں چھوڑ دیا گیا بلکہ ہمیں خلق کرنے اور دنیا میں بھیجنے کا ایک مقصد ہے اور وہ ایک عہد ہے جو ہم سے عالم ذر میں لیا گیا ہے اور ہمیں دنیا میں بھیجنے کا مقصد یہی ظاہر کرنا ہے کہ کون اس عہد کو پورا کرتا ہے اور کون اس سے روگردانی کرتا ہے۔ پہلے ہم اس عہد کے بارے میں جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے بعد اس سوال کا جواب خود بخود سمجھ میں آ جائے گا۔

رعد ۲۰۔ "جو اللہ کے عہد کو پورا کرتے ہیں اور میثاق کو نہیں توڑتے"۔

تفسیر صافی بحوالہ تفسیر قمی امام موسیٰ کاظمؑ سے منقول ہے کہ "یہ آیت آل محمدؐ کے بارے میں اور اس عہد کے متعلق جو اللہ نے ان کے بارے میں لیا اور عالم ذر میں جو عہد و پیمان جناب امیر المومنینؑ اور دیگر ائمہ معصومینؑ کی ولایت قبول کرنے کے متعلق لیا گیا تھا اس کے بارے میں نازل ہوئی ہے"۔

۲۔ وہ جو "عہد کو پورا کرتے ہیں اور اس دن سے ڈرتے ہیں جس کی سختی پھیلی ہوئی ہے"۔

اس آیت کی تفسیر میں امام رضا نے فرمایا۔ "مراد یہ ہے کہ ان سے ہماری ولایت کا عہد لیا گیا"۔ (اصول کافی۔ کتاب الحجت۔ باب [illegible] الحدیث ۵)

۳۔ بقرہ ۴۰۔ "اے بنی اسرائیل میری اس نعمت کو یاد کرو جس سے میں نے تمہیں سرفراز کیا اور تم میرے عہد کو پورا کرو تو میں بھی اپنا عہد پورا کروں گا"۔

تفسیر صافی اور تفسیر عیاشی میں ہے کہ امام جعفر صادق نے فرمایا: " کا مطلب یہ ہے کہ تم علی کی ولایت جو خدا کی طرف سے فرض ہے تسلیم کرو میں تم کو جنت دوں گا"۔

اس آیت سے ثابت ہو گیا کہ دنیا میں بھیجنے سے پہلے اللہ نے تم سے ولایت علی کا عہد لیا اور جنت میں تب ہی داخل کیا جائے گا کہ تم نے اپنی زندگی میں یہ عہد پورا کیا ہے یا نہیں۔ چنانچہ سورہ المعارج آیات ۳۲ تا ۳۵ میں جہاں نماز اور نمازیوں کا ذکر ہو رہا ہے وہاں بھی اسی عہد کا ذکر ہے۔ "اور جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کی رعایت کرنے والے ہیں۔ اور جو لوگ اپنی شہادات پر قائم رہنے والے ہیں اور جو لوگ اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہی لوگ جنتوں میں عزت پانے والے ہوں گے"۔

اللہ نے ان لوگوں کی تعریف کی ہے جو اس عہد کو پورا کرتے ہیں اور ان لوگوں کی مذمت کی ہے جو اس عہد سے روگردانی کرتے ہیں جیسا کہ حسب ذیل آیت سے ظاہر

ہے۔

۴۔ رعد ۲۰ تا ۲۲۔ "جو اللہ کے عہد کو پورا کرتے ہیں اور میثاق کو نہیں توڑتے اور جو اس تعلق کو ملائے رکھتے ہیں جنہیں ملائے جانے کا حکم اللہ نے دیا ہے۔۔۔ انہی کے لئے عاقبت کا گھر ہے"۔ (اس آیت کی تفسیر اوپر پڑھ چکے)۔

۵۔ رعد ۲۵۔ "اور جو لوگ اللہ کے عہد کو پختہ ہونے کے بعد توڑتے ہیں اور جسکو ملائے جانے کا اللہ نے حکم دیا ہے اسے قطع کرتے ہیں اور زمین میں فساد کرتے ہیں۔ یہی ہیں جن کے لئے لعنت ہے اور ان کے لئے آخرت کی خرابی ہے"۔

اس سے زیادہ وضاحت کرنا نہ تو میرے بس کی بات ہے اور نہ میں اسکی ضرورت سمجھتا ہوں۔ ہر چند کہ عہد کر لینے کے بعد یہ ذمہ داری عہد کرنے والے پر ہوتی ہے کہ چلتے ہوئے عہد کو یاد رکھے اور اسے پورا کرے۔ لیکن یہ تجربے سے ثابت ہے اور مشاہدات اور روایت ہے کہ اللہ نے انسانوں کو یہ عہد یاد دلانے کے لئے یکے بعد دیگرے مسلسل اپنے انبیاء کو بھیجا جو اس عہد کی یاددہانی کرتے رہے۔ خود حضرت محمد ﷺ تمام زندگی اس عہد کا ذکر کرتے رہے۔ چونکہ "الانسان مرکب من الخطاء و النسیان" کے پیش نظر اللہ نے یہ انتظام کر دیا کہ انسان اس عہد کو کبھی بھول ہی نہ سکے۔ جس طرح اگر آپ کو صبح سویرے اٹھنا ہوتا ہے تو آپ الارم لگا دیتے ہیں جو مقررہ وقت آپ کو جگا دیتا ہے۔ اسی طرح اللہ نے بھی آپ کے لئے چند الارم

گا۔ یہ ہیں تاکہ آپ اس سے کئے ہوئے عہد کو کسی صورت میں بھی بھول نہ پائیں۔ اگر آپ غور کریں تو اللہ نے نماز کے اوقات جو ایسے رکھے ہیں جن میں انسان کے غافل ہو جانے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ صبح جب انسان اٹھتا ہے تو طبیعت بھاری ہوتی ہے اور انسان کروٹیں بدل بدل کر دوبارہ سونے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسے میں اذان اس کو جگاتا ہے اور اس کے کانوں میں اذان کی آواز آتی ہے تو وہ جان لیتا ہے کہ تجدید عہد کا وقت آ گیا۔ دوپہر کو جب انسان کام کاج میں مشغول ہوتا ہے تو یہ امکان پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے عہد سے غافل ہو جائے گا کہ اتنے میں کچھ اور وجہ ہے اور وہ پھر سے مستعد ہو جاتا ہے۔ شام کو وہ تھکا ہارا گھر واپس آتا ہے تو تھکن کی وجہ سے طبیعت میں سستی پیدا ہو جاتی ہے اور پھر اسے کوئی نہیں جگاتا۔ پھر ایک اور وجہ ہے اور وہ ہوشیار ہو جاتا ہے۔

نماز کیا ہے؟ صرف یہ کہ بندہ اپنے معبود کے سامنے اقرار کرتا ہے کہ پروردگار! گواہ رہنا کہ میں اپنے عہد پر قائم ہوں اور غافل نہیں ہوں۔ یہی سبب ہے کہ جب وہ نماز کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اپنے عہد کی تجدید کرتا ہے اور جب عہد کی تجدید کر لی تو گویا اس نے مقصد نماز کو پورا کر دیا۔ اس لئے نماز شروع کرنے سے قبل ہی وہ اعلان کر دیتا ہے "قد قامت الصلوٰۃ" یعنی یقیناً نماز قائم ہو چکی۔ حالانکہ ابھی اس نے ایک بھی رکن نماز ادا نہیں کیا ہوتا۔ یہاں تک کہ نیت نماز بھی نہیں کی ہوتی۔ تجدید عہد کے بعد نماز میں کی جانے والی حرکات و سکنات صرف تعمیل حکم اور اپنی بندگی کا اظہار

ہوتا ہے۔ قمی نے مفاتیح الجنان صفحہ ۸۲ پر دعا کا یہ جملہ موجود ہے۔ "اے معبود میری مہار تیرے ہاتھ میں ہے اور میں اپنی طاقت کے مطابق تیرے عہد و پیمان پر قائم رہا ہوں"۔ پس یہ عہد ہی حقیقت نماز اور روح نماز ہے اور یہی مطلب ہے اس قول کا کہ "محمد و آل محمد حقیقت نماز ہیں"۔

خدا نے ہم پر "صلوٰۃ" فرض کی ہے لیکن یہ ہمارے مقتدر افراد کی کارگزاری ہے کہ انھوں نے اپنی مصلحتوں اور اپنے مفادات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایک فارسی لفظ "نماز" کو عربی لفظ "صلوٰۃ" کا متبادل قرار دے دیا ہے اور اب حالت یہ ہے کہ نماز لوگوں کے ذہنوں پر اس حد تک مسلط ہو گئی ہے کہ صلوٰۃ کی طرف کا دھیان جاتا ہی نہیں۔ یہ صلوٰۃ ہی ہے جس کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے اور محمدؐ و آل محمدؐ پر صلوٰۃ بھیجنے کا مطلب کیا ہے یہ ہم شیخ صدوقؒ کی کتاب "معانی الاخبار" صفحہ ۱۵ حدیث ۲ سے بیان کرتے ہیں۔

"صادق جعفر بن محمد نے فرمایا: "جو شخص نبیؐ پر صلوٰۃ بھیجتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ گویا میں اس میثاق و وفا پر قائم ہوں کہ جس کو میں نے عالم ارواح اور اصلاب اجداد میں پروردگار سے قول "الست بربکم" پر قبول کیا تھا"۔

ایک علامہ صاحب نے جو شیعوں میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں اپنی ایک تقریر کے دوران یہ قیمتی جملے ارشاد فرمائے۔

''ہم نماز میں شہادت ولایت نہیں دیتے لیکن نماز تو پڑھتے ہیں۔ لیکن جو لوگ ولایت علی کا شور مچاتے ہیں وہ تو سرے سے نماز ہی نہیں پڑھتے۔ بتایئے کون پیچھے رہا؟''۔

ہم علامہ صاحب کو ضرور بتائیں گے کہ کون پیچھا رہا لیکن سب سے پہلے انہیں چاہئے کہ وہ اس تہمت کی توجیہ فرمائیں جو انہوں نے قائلین علی ولی اللہ پر لگائی ہے اور بتائیں کہ انہوں نے کس سے تحقیق کی ہے کہ کون نماز پڑھتا ہے اور کون نہیں؟ ایسی بچکانہ باتیں علامہ صاحب کو زیب نہیں دیتیں اور انکا فرض ہے کہ اپنے منصب کا خیال رکھیں اور علماء والا رویہ اختیار کریں۔

یہ ساری غلط فہمی اس تصور کا شاخسانہ ہے جو علامہ صاحب اور ان کے دیگر ہم مشربوں نے عوام میں پھیلایا ہوا ہے اور لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات پختہ کر دی گئی ہے کہ ''نماز نہ پڑھنے سے نماز پڑھنا بہتر ہے'' اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب عام لوگ دشمنان رسولؐ کو نماز میں مشغول دیکھتے ہیں اور انہیں تعریفی نگاہوں سے دیکھتے ہیں بلکہ مثالیں دیتے ہیں کہ ''دیکھو ان لوگوں کی مسجدیں نمازیوں سے کس طرح بھری ہوتی ہیں؟''۔ یہ لوگ اگر کربلا میں ہوتے تو یقیناً لشکر یزید کی بھی ضرور تعریف کرتے اور انکو بھی مثال بناتے۔ یہ سب کچھ حقیقت نماز سے غفلت کا نتیجہ ہے اور حقیقتاً یہ عقیدہ شیطانی ہے۔ ہم علامہ صاحب کو خبردار کرتے ہیں کہ ان جیسے لوگوں کے سے نماز

پڑھنے سے زیادہ نماز نہ پڑھنا بہتر ہے۔ یعنی بغیر ولایت علی جتنی نمازیں وہ پڑھتے جائیں گے اتنی ہی عذاب بالائے عذاب میں گرفتار ہوتے جائیں گے۔ نماز نہیں پڑھیں گے تو کم از کم عذاب میں تو تخفیف ہو جائے گی یعنی جنھوں نے نماز پڑھنے کا حکم دیا اب انھوں نے ہی یہ بھی فرمایا ہے جو ہم ذیل میں درج کر رہے ہیں۔ اسے غور سے پڑھئے اور اپنے روحانی حیات کی صحیح سمت متعین کیجئے۔

ثواب الاعمال و عقاب الاعمال صفحہ ۲۴ سے ۱۰ احادیث پیش کی جا رہی ہیں جو علامہ صاحب کی تسکین قلب دینے کے لئے کافی ہیں۔

۱۔ حدیث ۷۔ امام محمد باقرؑ نے فرمایا: ''جو شخص اس امر یعنی ولایت علیؑ کی مخالفت کرتا ہے اس کے لئے برابر ہے کہ نماز پڑھے یا زنا کرے''۔

۲۔ حدیث ۸۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: ''ہم اہل بیت کا دشمن پرواہ نہیں کرتا کہ روزہ رکھے یا نماز پڑھے۔ زنا کرے یا چوری کرے۔ بیشک وہ (جہنم کی) آگ میں ہے۔ بیشک وہ (جہنم کی) آگ میں ہے''۔

لہٰذا جو شخص ولایت علیؑ کی مخالفت کرے اور پھر نماز پڑھے تو سب سے پہلے تو اس پر حد شرعی جاری ہونا چاہئے۔ تعریف تو بعد میں ہوگی۔

توہین رسولؐ

حضرت ختمی مرتبت کا ارشاد ہے: ''یا علی! تجھے مجھ سے وہی منزلت حاصل ہے جیسے

سر کو میرے بدن سے"۔

اگر کوئی کسی کا سر کاٹ دے تو وہ اس کا قاتل کہلاتا ہے۔ پس شہادت رسالت سے شہادت ولایت کو جدا کرنے والا قاتل رسول قرار پائے گا۔ اسی لئے امام جعفر صادقؑ نے فرمایا تھا کہ "تم میں سے کوئی بھی جب بھی اور جہاں بھی جب لا الہ الا اللہ محمدٌ رسول اللہ کہے تو فوراً کہے "علی امیر المومنین ولی اللہ"۔

فوراً کی شرط معصوم نے اسی لئے لگائی ہے تا کہ دونوں شہادتوں کے درمیان کوئی فصل و فرق حد نہ رہ سکے جیسے سر اور بدن ایک دوسرے سے متصل ہوتے ہیں اور ان کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہوتا۔ یہاں تو فاصلہ پیدا کرنے کی ممانعت اور دوری ہے چاہیے کہ سر رسول کو بدن رسولؐ سے بالکل جدا کر دیا جائے کیا کہنا ہے ایسی نماز کا کہ جس کو پڑھ کر انسان قاتل رسولؐ ہو جائے! ایسی نماز ملا صاحب کو ہی مبارک ہو۔

اسم اور معنی

اس موضوع پر ہم مختلف مسائل میں گفتگو کر چکے ہیں جو اگرچہ انتہائی مختصر تھی لیکن فکر انگیز ضرور تھی۔ اس نے قارئین کے ذوق تجسس کو انگیخت کیا اور میرے احباب میں سے ایک شیخ محترم نے مجھ سے فرمائش کی کہ اس موضوع کی تفصیلات کو سامنے لایا جائے۔ یہ موضوع نہایت حساس اور نازک ہے کیونکہ اس کا بیان کرنا، لکھنے سے زیادہ مشکل ہے کیونکہ دنیا میں ناسمجھوں کی کوئی کمی نہیں اور اس بات کا اندیشہ ہر وقت میں موجود رہتا ہے کہ کسی بھی جملے کو اس کے سیاق و سباق سے کاٹ کر کوئی مسئلہ کھڑا کر دیا جائے اور سب مقصد بحث کے بجائے مقصد دور ہو کے حوالے کیے جائیں۔ ایسے لوگ مزاج لوگوں کی بھی ایک شیخ تعداد موجود رہتی ہے جو بغیر تصدیق کے محض سن کر ہی ان ناسمجھوں کے ہم خیال بن جاتے ہیں کیونکہ لفظ "کفر" جاہلوں کا ایک من پسند موضوع ہے۔ یہ لفظ بولنے میں جتنا آسان ہے کہ تو اتنے ہی نتائج بھی اس کے برے معانی و رکھتے ہیں۔ شیطان نے یہ لفظ اپنے مریدوں کے منہ میں ایسے ٹھونسا ہے کہ اب یہ ایک علم بن گیا ہے جو ختم ہونے میں ہی نہیں آتا۔ لیکن اس موضوع کی اہمیت کے پیش نظر یہ ضروری تھا کہ یہ قبول کیا جائے اور ان احباب کے شدید اصرار نے دل پر مہمیز کا کام کیا۔ لہذا ہم اس وادی میں قدم رکھتے ہیں اللہ ہی پر بھروسہ اور توکل کرتے اور اسی سے طلب استعانت کرتے ہیں کہ حق کی وکالت کرنا ہمارا مقصد نہایت

ہے۔

توحید اسلام کا بنیادی رکن ہے جو سمجھے بغیر دین سمجھ میں آ ہی نہیں سکتا۔ بغیر سمجھے بوجھے کوئی عقیدہ رکھنا یا کوئی عمل کرنا تو یا اندھیرے میں تیر چلانا ہے اور اس کا نتیجہ ہمیشہ گمراہی پر ہوتا ہے۔ چھوٹی سی لے پڑتی ہے فرقے اسی سے بنتے ہیں اور دینی جھگڑے اسی لئے ہوتے ہیں کہ عقیدوں اور اعمال کی بنیاد جہالت کو بنا دیا جاتا ہے اور جہالت کو ہی جاننا تصور کر لیا جاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ آج تک توحید نہ خواص کی سمجھ میں آئی اور نہ عوام کی اور توحید کو شرک بنا دیا اور شرک کو توحید سمجھنے کا طریقہ بنا لیا ہے۔ پیشہ ور مذہبی رہبروں کے سامنے توحید بیان کرنا تو شیر کے منہ سے کم نہیں۔ اور یہی بات ہے جس نے ہمیں تحریک دلائی کہ ہم اس مقصد پر لکھیں تاکہ یہ بات کم از کم ان تک تو پہنچ جائے جو سمجھ سکتے ہیں۔ نادانوں کی مدد ان بیچاروں کو بس ہے۔

توحید کی اہمیت کا اندازہ اگر آپ کو ہو گیا ہے تو اس بات کو بھی سمجھ لیجئے کہ توحید کی کلید "اسم و مسمّیٰ" کی حقیقت کو جاننا ہے اور اسم و مسمّیٰ میں فرق جان لینا ہی حقیقت توحید کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ اس کے بغیر توحید کا کوئی تصور ہی نہیں ہو سکتا کیونکہ مسمّیٰ کو جاننا، اس کی صفات کا ادراک کرنا اور اس پر ایمان لانا جو مشاہدے سے بالاتر ہو فقط محال ہے اور تو اسم پرستی کے زمرے میں آتا ہے۔ چنانچہ مغرب والوں کے جدید ترین اخبارات میں آیا کہ "ہم نے سب سے پہلا کام یہ کیا ہے کہ (معاذ

اللہ) خدا کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے سمندر میں پھینک دیا ہے"۔ اور جب روس کا پہلا خلائی راکٹ چاند پر جا کر واپس آیا تو یہ بیان دیکھنے میں آیا کہ "ہم تمام راستے خدا کو ڈھونڈتے ہوئے گئے مگر وہ ہمیں کہیں بھی نظر نہ آیا"۔ ان بیانات کا سبب خود اہل توحید کا تصورِ توحید ہے جو وہ آج تک مخالفین کے حلق سے نہ اتار سکے اور وہ یہ کیونکر کرتے جب کہ آج تک توحید خود ان کے حلق سے بھی نہیں اتر پائی۔

اسم و معنی میں اتحاد

جو دوسری شے کا تعارف کرائے اس کا نام اسم ہے اور اسم وہ ذریعہ وسیلہ ہے جس کے ذریعے معنی کا ادراک کیا جاتا ہے۔ اسم کی تین اقسام ہیں۔ ملفوظی، مکتوبی، ذہنی و حقیقی۔ جو اسم بولا جائے وہ ملفوظی ہے۔ جو لکھا جائے وہ مکتوبی ہے۔ جس کا تصور کیا جائے وہ ذہنی ہے اور جس کو پایا جائے وہ حقیقی ہے۔ مثلاً پانچ حروف ہیں جو کاغذ پر لکھے ہوئے ہیں۔ "ا ل ل ہ"۔ اگر ان حروف کا مجموعہ یہ دعویٰ کرے کہ "میں اللہ ہوں" تو کیا پوری دنیا میں ایک بھی آدمی ایسا ہوتا ہے جو اس کے دعوے کو تسلیم کرے؟۔ کیونکہ ان حروف کا مجموعہ یقیناً "اللہ" ہی بنتا ہے۔ تو کیا یہ شرک ہو گیا؟۔ ہرگز نہیں۔ اور جو حقیقی ایک شخص بھی اس سے شرک میں پڑتا ہے اور نہ سمجھتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ یہ معنی نہیں بلکہ اسم ہے اور اسم و معنی دونوں ایک ہی نام سے پکارے جاتے ہیں۔ اس کے باوجود نہ معنی اسم بنتا ہے اور نہ اسم معنی بن جاتا ہے۔ حقیقی انسان

بات ہے جسے لوگ نہیں سمجھتے اور لفظوں کے ہیر پھیر میں پڑے رہتے ہیں۔ یہ جان لینا چاہیے کہ اسم حقیقی کوئی موہوم شے نہیں ہوتی بلکہ وہ ایک وجودِ خارجی رکھتا ہے۔ اور نفسی و متوالی اعتبار سے متحد ہونے کے باوجود اپنے معنی کا غیر ہوتا ہے۔ کتاب توحید صفحہ ۵۸ حدیث ۱۶ میں امام جعفر صادقؑ ارشاد فرماتے ہیں: "اللہ اپنے اسماء کا غیر ہے۔ جتنے نام ہیں وہ اسی کی طرف مضاف ہیں اور اسی کی توحید خاص ہے"۔

ہر معنی کے لئے اسم کا وجود لازمی ہے اور بغیر اسم کے معنی کا کوئی تصور نہیں۔ اسم و معنی میں ایک گہرا اتحاد ہوتا ہے اور ہونا بھی چاہئے کیونکہ معنی کا مکمل تعارف اسم ہی کے ذریعے ہوتا ہے لہٰذا جو نوعیت معنی کی ہوگی وہی اسم کی بھی ہوگی۔ معنی اگر حادث ہے تو اسم بھی حادث ہوگا اور معنی اگر قدیم ہے تو اسم بھی قدیم ہوگا۔ اسی لئے کوئی مختصر سے مختصر وقفہ بھی ایسا تصور نہیں کیا جا سکتا جب معنی موجود ہو اور اسم موجود نہ ہو۔ خود انسان ہی کی مثال لے لیں۔ انسان کا نفس اس کا معنی اور اس کا جسم اس کا اسم ہوتا ہے اور یہ دونوں متحد ہوتے ہیں۔ چنانچہ انسان جب دنیا میں آتا ہے تو اپنا اسم اپنے ساتھ لے کر آتا ہے۔ بچپن میں جب اس کا معنی یعنی نفس ضعیف ہوتا ہے تو اس کا اسم یعنی جسم بھی ضعیف ہوتا ہے۔ جوانی میں جب اس کا معنی قوی ہو جاتا ہے تو اس کا جسم بھی قوی ہو جاتا ہے۔ بڑھاپے میں جب اس کا معنی مضمحل ہو جاتا ہے تو اس کا جسم بھی مضمحل ہو جاتا ہے۔ جب وہ مرتا ہے تو جسم بھی اپنا وجود کھو بیٹھتا ہے۔ اس صورت

میں چونکہ معنی حادث و فانی تھا اس لئے اسکی صفات اسکے اسم کی بھی تھیں۔ اس سے سمجھے کہ جو معنی قدیم ہو وہ لافانی ہو اسکا اسم بھی قدیم اور لافانی ہوگا۔ آپ اسکی بشری حیثیت پر قیاس نہ کریں یہ تو بشریت اسکے لئے مثل لباس ہوتی ہے جسے وہ جب چاہے پہن سکتا ہے اور جب چاہے اتار سکتا ہے بلکہ اسکی حقیقت ازلی و ابدی ہوتی ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ کبھی وہ قوی ہو جائے اور کبھی ضعیف۔ کبھی وہ عالم ہو جائے اور کبھی جاہل۔ کبھی وہ قادر ہو جائے اور کبھی عاجز۔ اس صورت میں وہ اس معنی کا اسم نہ رہے گا جو اس صورت سے منزہ و مبرا ہے۔

انسان کے معنی یعنی نفس کے تمام حالات کا ظہور اسکے اسم یعنی جسم سے ہوتا ہے۔ اگر جسم نہ ہو تو حالات نفسانی کا ظہور ہو ہی نہیں سکتا۔ درحقیقت یہ ہے کہ جب ہم کسی کی شجاعت، سخاوت، حسن اور دیگر صفات کی تعریف کرتے ہیں تو اسکی صورت یہ ہوتی ہے کہ اسکے نفس کا تصور ہمارے ذہن کے کسی گوشے میں بھی نہیں ہوتا بلکہ ہم اسکے جسم سے ہی مخاطب ہوتے ہیں اور اسی کی تعریف کرتے ہیں۔ یہ امر ثابت ہے کہ اسم کی تعریف حقیقتاً معنی ہی کی تعریف متصور ہوتی ہے۔ پس اسم و معنی کے درمیان دوئی نہ دیکھو سمجھے کہ یہاں اسم و معنی کی تمیز باقی نہیں رہتی اور ایک کی تعریف بعینہ دوسرے پر بھی صادق آتی ہے۔ لہذا جب ہم علی سے مانگتے ہیں تو ہمارا مقصود اللہ ہوتا ہے اور جب ہم اللہ سے مانگتے ہیں تو ہمارا مقصود علی ہوتا ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ علی

اللہ کا ہاتھ ہے اور جس کسی کو بھی جو کچھ بھی ملے گا وہ ہاتھ ہی سے ملے گا۔ لہٰذا اسم و معنی میں فرق نہیں کیا جا سکتا بشرطیکہ انسان کو اس بات کا ادراک حاصل ہو کہ دونوں میں اسم کون ہے اور معنی کون ہے۔ اسم و معنی کو خلط ملط کرنا ہی شرک کو جنم دیتا ہے۔ لہٰذا جہاں ہم اسم کے خصائص بیان کریں گے تو وہاں مزید کہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ یہ ثابت کیا جا چکا کہ اسم کی تعریف درحقیقت معنی ہی کی تعریف ہوتی ہے۔

دلیل کی اتوحید

جو کچھ بیان کیا جا چکا اس کی روشنی میں یہ جان لینا چاہئے کہ خدا کی وحدت کی دلیل کا اسم ہے اور جو شخص اس کے اسم سے واقف نہیں یا اس کی معرفت نہیں رکھتا اس کے لئے توحید کو سمجھنا ممکن ہی نہیں۔ اس پر ایمان لانا تو بہت دور کی بات ہے۔ کسی نے حضرت امیر مومنین کا ارشاد ہے: "اللہ وہ ہے کہ جس کے متعلق انبیاء سے سوال کیا گیا تو انہوں نے بھی اس کی اسمائی حد و اور حصار نہیں بیان کئے بلکہ اس کے افعال بیان کئے اور اسی نشانیوں سے اس پر دلیل پیش کی"۔ (التوحید صفحہ ۶۹ حدیث ۱)۔

یہاں سب سے پہلے "فعل" کو جاننے کی ضرورت ہے۔ فعل کا مطلب ہے "ایک حالت سے دوسری حالت میں آنا"۔ لہٰذا فعلیت کا اطلاق ذات خداوند قدوس پر نہیں کیا جا سکتا بلکہ جس طرح کسی انسان کی تمام قوتوں اور کمالات کا ظہور جسم سے ہوتا

ہے اسی طرح اللہ کے تمام افعال کا ظہور ائمہ سے ہوتا ہے جسے اس نے اپنے افعال کا عین بنایا ہے۔ لہٰذا جس جس فعل کو اللہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے ان تمام افعال کا فاعل حقیقی امام ہوتا ہے اور اللہ کی ذات کی طرف ان افعال کی نسبت مجازی دی جاتی ہے۔ لہٰذا خالق حقیقی۔ رازق حقیقی۔ قہار حقیقی۔ غفور حقیقی اور منتقم حقیقی اللہ کا امام ہے نہ کہ اللہ کی ذات۔ یہ وہ بات ہے کہ ان تمام افعال کی نسبت اسکی ذات کی طرف دی جاتی ہے۔ اس بات کو حضرت امیر المومنین اس طرح بیان فرماتے ہیں۔ ''میں اللہ کا ہاتھ ہوں، وہ جو کچھ کرتا ہے مجھ سے کرتا ہے۔ جو کچھ اس سے صادر ہوتا ہے میرے ذریعے ہوتا ہے۔ لہٰذا میں ہوں کہا جا سکتا ہے''۔
ذات کی طرف نسبت دینے کا واحد مقصد اس پر ایمان لانا۔ اسکی معرفت حاصل کرنا اور اسکی عبادت کرنا ہوتا ہے کیونکہ جب تک ہم اسے کسی نام سے یاد نہ کریں اس وقت تک نہ اس پر ایمان لایا جا سکتا ہے اور نہ اسکی عبادت کی جا سکتی ہے۔ اسی لئے امام جعفر صادق نے فرمایا۔ ''اگر اللہ نہ ہوتا تو ہم پہچانے نہ جاتے اور اگر ہم نہ ہوتے تو اللہ نہ پہچانا جاتا''۔ (توحید صفحہ ۲۳۳)

امام کو مختلف الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً آیات (نشانیاں)۔ وسیلہ اور حجاب وغیرہ وغیرہ ان پر ہم اپنے اپنے مقام پر گفتگو کریں گے لیکن یہاں یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ اگر وسیلہ کو درمیان سے ہٹایا جائے تو خدائی خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا چونکہ

ذات خداوندی کی دلیل اس کا اسم ہے لہٰذا اسکے اسم کو رد کرنے کا مطلب ذات خدا کو رد کرنا ہوگا۔ سورہ یوسف ۱۰۶ میں ارشاد رب العزت ہو رہا ہے۔ "اور ان میں سے اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے مگر وہ مشرک ہیں"۔

اسکی تفسیر میں امام جعفر صادق فرماتے ہیں۔ "یہی وہ لوگ ہیں جو اسکے اسماء میں بغیر علم کے دخل دیتے ہیں؟ الحاد کرتے ہیں اور ان اسماء کو ان کے مقامات کے خلاف استعمال کرتے ہیں"۔ یعنی جب بھی اسم کو معنی سے الگ کرکے اسے جداگانہ طور پر سوچا جائے گا تو معنی کا وجود کھو جائے گا اور معنی کا نام شرک ہوگا۔ پس معلوم ہو گیا کہ شرک ہوتا ہی نہیں اللہ کی ذات میں نہیں ہوتا بلکہ اسکے اسماء میں ہوتا ہے۔ اسی مطلب کو اللہ نے سورہ اعراف ۱۸۰ میں یوں بیان فرمایا ہے۔ "اور اللہ تعالیٰ کے اچھے اچھے نام ہیں جن سے اس کو پکارو اور ان لوگوں کو چھوڑ دو جو اسکے ناموں میں الحاد کرتے ہیں"۔

یعنی جو اسم کو چھوڑ کر براہ راست اللہ کو پکارتا ہے یا اسکے حقیقی اسماء کو چھوڑ کر اپنے خود ساختہ اسماء کے ذریعے سے پکارتا ہے وہ ملحد ہے۔ الحاد اسکے سوا کوئی چیز نہیں۔

اس آیت میں اللہ نے اپنے اسماء کا ذکر کیا ہے اور اسماء اسکی صفت کے نام ہیں۔ لیکن ایک اسم ہمیں ایسا نظر آیا جو اشرف ہے اور جسکو اللہ نے اپنا نفس قرار دیا ہے۔ کوکب دری صفحہ ۱۳ پر رسول اللہ کی دعا کا ایک جملہ درج ہے۔

"پروردگارا مجھے اس اسم کے حق سے جو تیرے اس اسم کا حق ہے جسے تو نے اپنے نفس کو مخصوص کیا ہے اور کسی مخلوق کے لئے اسکو نہیں رکھا"۔

یہاں ہم نے صرف اس اسم کا ذکر کیا ہے لیکن ان شاء اللہ ہم بہت جلد یہ بھی ڈھونڈ نکالیں گے کہ وہ اسم کون ہے جو شمس اللہ بھی ہے اور اشرف بھی۔ یہ بات بہر حال ذہن میں رہنا چاہئے کہ اللہ نے مختلف مقامات پر اپنے نام کا ذکر کیا ہے لیکن جہاں اس نے صیغہ واحد استعمال کیا ہے وہاں اسم تو اس سے مراد یہی اسم ہے چونکہ اللہ واحد اور جمع میں فرق کو جانتا ہے اس لئے کوئی تاویل اس مقام پر کام نہیں آسکتی ہے۔

اس سے یہ بات بھی ثابت ہو رہی ہے کہ وہ اسم خود رسول اللہ بھی نہیں ہیں چونکہ منتخب اس اسم کا ذکر کرتے ہیں۔

اسم مکنون

اللہ کا وہ اسم چونکہ اس کا نفس ہے۔ اسکی توحید ہے۔ اسکی ہونیت ہے۔ اسکی معبودیت ہے۔ اسکی محبوبیت ہے اور اسکی تمام صفات و افعال کا جامع ہے اس لئے اسکے سوا اللہ کی قبول و دوام سے عاری ہونا بھی لازمی ہے۔ وہ ہر چند معرفت توحید کرانے کے لئے مختلف صورتوں میں جلوہ گر رہتا ہے۔ کبھی آدم کی صورت میں۔ کبھی نوح کی صورت میں۔ کبھی ابراہیم کی صورت میں۔ کبھی موسیٰ و عیسیٰ کی صورت میں۔ کبھی نور محمدیؐ کی صورت میں اور کبھی ائمہ طاہرین کی صورت میں لیکن اسکے باوجود اسکی حقیقت اصلیہ ہمیشہ الوہیت کے سرپردوں میں پوشیدہ رہتی ہے جسکا ادراک کرنا

کی طرح محال رہتا ہے جیسے خود حضرت باری تعالیٰ کا ادراک کرنا۔ اس نے وہ خود
ارشاد فرماتا ہے۔ ''میں ہی ظاہر ہوں اور میں ہی باطن ہوں''۔ یہی اللہ کا وہ اسم مکنون
ہے جس کو اللہ نے ہمیشہ پوشیدہ رکھا اور یہی وہ اسم مکنون ہے جس نے فرمایا
تھا۔ ''کنت کنزاً مخفیا''۔ اور اس بات کا کوئی بھی عقل انکار نہیں کر سکتی کہ اللہ
ظاہر ہے مگر نظر نہیں آسکتا لہذا پوشیدہ ہو گیا اور اللہ نظر نہیں ہوسکتا لہذا یہ وہی اسم
مکنون ہے جو ظاہر ہو کر بھی باطن رہتا ہے اور باطن ہو کر بھی ظاہر رہتا ہے۔

مفاتیح الجنان صفحہ ۹۵ پر جو دعا درج ہے اس کا ایک جملہ یہ ہے۔ ''پروردگارا میں تیرے
اس اسم کے واسطے سے سوال کرتا ہوں جسے تو نے اپنے غیب میں پوشیدہ رکھا اور وہ
تیرے پاس محفوظ ہے۔ وہ تیرے سوا کسی کی طرف اپنا رخ نہیں کرتا۔ (کیونکہ وہ
مظہر اللہ ہے)''۔ اسی لئے میرے مولا نے ایک موقع پر حضرت سلمان سے فرمایا
تھا۔ ''میرا ظاہر امامت ہے اور میرا باطن غیب ہے''۔

[illegible] جلد ۲ صفحہ ۲۲۱ پر حضرت امیر المومنین اور ابلیس ملعون کا ایک
مکالمہ درج ہے جو اسی اسم مکنون سے تعلق رکھتا ہے اس لئے ہم آپ کی خدمت میں
ہدیہ کرتے ہیں۔

''مروی ہے کہ ایک روز حضرت امیر المومنین نے ابلیس سے پوچھا کہ ''اے بد
حارث! قیامت کے روز کے لئے تو نے کیا زاد آخرت جمع کیا ہے؟''۔ ابلیس نے
کہا۔ ''آپ کی محبت ۔ جب قیامت کا دن آئے گا تو آپ کے ان ناموں کو جنکا

وصف کرنے سے جو وصف عاجز و مجبور ہے اور نقص میں سے ذخیرہ کیا ہے تاکہ وہ
گا۔ آپ کا وہ نام انسانوں سے مخفی ہے اور مجھ پر ظاہر ہے۔ خدا نے اس کا ذکر اپنی کتاب
میں کیا ہے کہ اسکو سوائے خدا کے اور ان کے جو علم میں راسخ ہیں کوئی نہیں جانتا۔ خداوند
عالم جب کسی بندے کو پسند فرماتا ہے تو اپنی جہت سے پردوں کو ہٹا دیتا ہے اور اسکو
اس علم کی تعلیم دیتا ہے اور وہ بندہ اس راز کے ذریعے امت کی حقیقی نگہبانی جانتا ہے۔
یہ وہی اسم ہے جنکے ذریعے زمین و آسمان قائم ہوئے اور یہی اسم جیسا چاہے تصرف
کرتا ہے"۔

بات کو مکمل کرتے ہوئے ہم سورہ واقعہ کی آیات ۷۷ سے ۸۰ پیش کرتے ہیں جس میں
اس کتاب مکنون کا ذکر ہے۔ "یقیناً وہ عزت والا قرآن ہے جو کتاب مکنون میں ہے"۔
ہم نے کشف العقائد میں سورہ بقرہ کی آیت "ذالك الكتب لاريب فيه" پر
ایک مختصر گفتگو کی تھی اور حضرت امیر المومنین کا یہ فرمان پیش کیا تھا کہ "انا ذلك
الكتب لاريب فيه" (میں ہوں وہ کتاب جس میں کوئی ریب نہیں)۔
سورہ واقعہ کی آیات میں اس کتاب کو کتاب مکنون کہا گیا ہے کہ قرآن جس کا جزو ہے اور
اسی سے قرآن ناطق کہتے ہیں۔

حجب

یہی وہ اسم ہے جو علم کا باب ہے۔ باب وسیلے کو کہتے ہیں اور یہی اسم وہ وسیلہ ہے

جن سے تمام فیوضِ باری تعالیٰ اس کی مخلوق تک پہنچتے ہیں خواہ وہ فیوض تکوینی ہوں یا فیوضِ تشریعی ہوں یا فیوضِ تنزیلی۔ اللہ نے جتنے انبیاء نازل فرمائے وہ ان کے وسیلے سے۔ جیسا کہ آنجناب نے خود ارشاد فرمایا۔ "میں نے تمام انبیاء کو مبعوث کیا"۔ اور ان انبیاء پر جتنی کتابیں اور صحیفے نازل ہوئے وہ بھی ان کے وسیلے سے۔ جس جس نبی نے اللہ سے کلام کیا تو ان کے وسیلے سے خواہ وہ وحی کی شکل میں ہو یا الہام کی صورت میں ہو یا کسی اور کے ذریعے۔ مفاتیح الجنان صفحہ ۱۳۳ پر "قید سے رہائی کی دعا" درج ہے جو جناب سیدہ کونین کی تعلیم کی ہوئی ہے۔ اس دعا کا ایک جملہ یہ ہے۔

"پروردگارا! مجھے واسطہ ہے وحی کا، اور اس کا جس نے وحی کی۔ اور واسطہ ہے نبی کا اور اس کا جس نے اسے نبی بنایا"۔

صحیفہ زہرا کے صفحہ ۳۰ پر بھی دعا اس طرح منقول ہے۔

"پروردگارا! مجھے واسطہ ہے عرش کا اور اس کو بلند کرنے والے کا۔ مجھے واسطہ ہے وحی کا اور وحی کے نازل کرنے والے کا۔ مجھے واسطہ ہے نبی کا اور اسے نبوت دینے والے کا۔ مجھے واسطہ ہے بیت اللہ کا اور اس کی بنیاد رکھنے والے کا"۔

اسی طرح پروردگارِ عالم سورہ شوریٰ کی آیت ۵۱ میں ارشاد فرماتا ہے۔ "اور کسی بشر کے لیے یہ نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ اس سے کلام کرے سوائے وحی کے یا حجاب کے پیچھے سے یا کوئی رسول بھیجتا ہے پس وہ اس کی اجازت سے جو چاہتا ہے وحی کرتا ہے۔ یقیناً وہ

علی حکیم ہے"۔ اور اس بات کا اظہار آیا یاں وسیلے سے چشم پوشی کی تو پورا دین ہی منہدم ہو جائے گا کیونکہ دین کچھ ہے ہی نہیں سوائے وسیلے کے۔ اور اس وسیلے کو درمیان سے ہٹا دیا جائے تو توحید، عدل، نبوت، امامت، قیامت۔ کچھ بھی ثابت نہیں ہوتا۔ امام علی رضاؑ فرماتے ہیں: "جو اللہ کو اپنے وہم میں لایا تو وہم میں آنے والی شے سے مراد اللہ نہیں ہے۔ اللہ نے مخلوق کو حدوث سے خلق کیا کیونکہ اس کے درمیان اور مخلوق کے درمیان حجاب رہا"۔ (التوحید صفحہ ۳۲۔۳ حدیث ۲)۔

اس حدیث سے اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے کہ اللہ کبھی بے حجاب رہا ہی نہیں اور روز ازل سے خالق و مخلوق کے درمیان یہ حجاب موجود رہا ہے۔ لہٰذا جو کچھ ہو وہ اس حجاب کی وساطت سے ہو۔ اس پر آپ جتنا بھی غور فرمائیں گے اتنا ہی حقیقت سے قریب تر ہوتے جائیں گے۔ ہمارا عرض ہے کہ خلق کی ابتدا ایک نور سے ہوئی۔ مندرجہ بالا حدیث کی روشنی میں یہ بات تحقیقی ہے کہ جب یہ نور خلق ہو رہا تھا تو حجاب اس وقت بھی موجود تھا۔ پھر جیسے جیسے خلق کا عمل آگے بڑھتا گیا یہ حجاب حائل رہا۔ مخلوق کو جو جو نعمت و فضائل و مناصب و عطائیں ملتے رہے تو اسی باب کے توسط سے۔ ہمارا کام صرف اشارت دینا ہے۔ غور و تدبر کرنا خود آپ کا کام ہے ورنہ مقصد مطالعہ ہی فوت ہو جاتا ہے۔ آپ ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں تو جو شے انسان کو تلاش حقائق سے روکتی ہے وہ اس میں ضد، ہٹ دھرمی، انا کو پروان چڑھاتی ہے اور معاشرے کا خوف۔

اکثریت کی محبت اور وہ نظریات و عقائد ہوتے ہیں جو نسل در نسل منتقل ہوتے ہوئے لوگوں تک پہنچتے ہیں اور ذہن پر اس طرح مسلط ہو جاتے ہیں جیسے پتھر پر لکیر اور ان نظریات و عقائد سے انحراف کو انسان اپنی اور اپنے آباؤ اجداد کی شکست سمجھتا ہے۔

جہاں بھی عقل و تدبر کی کونپلیں پھوٹیں
وہیں عقیدوں نے ذہنوں کو یرغمال کیا

مگر جب بات شرف انسانیت کی نہیں بلکہ انانیت کی ہو جاتی ہے۔ حقیقت تک انسان اس وقت پہنچ سکتا ہے جب وہ ان تمام دیواروں کو گرا دے اور پھر اس طرف دیکھے جہاں سے حقیقتیں تقسیم ہوتی ہیں۔ اور جب وہ دیکھ لے تو حقیقتیں خود چل کر اس کے پاس آتی ہیں۔ اس کتاب میں بہت سی باتیں ایسی آئیں گی جو آبائی عقائد و روایات اور انانیت کے خلاف ہوں گی لیکن کسی بھی شے کو اگر ذہنی تحفظات (pre-determined ideas) کے ساتھ پڑھا یا سنا جائے تو وہ شے کبھی سمجھ میں نہیں آسکتی۔ آپ اور ہم جس دین پر ہیں اور جو مذہب ہم نے اختیار کر رکھا ہے وہ ہم نے اپنے حسب منشا خود نہیں بنایا۔ بلکہ ہمارا مذہب وہی ہے جو قرآن و حدیث سے ثابت ہوتا ہو۔ پس جو شے قرآن و حدیث سے ثابت ہو جائے اس پر آنکھیں نہیں چرایا کرتے بلکہ شرف انسانیت اس میں ہے کہ کسی تحفظ کے بغیر اس حقیقت کو تسلیم کیا جائے چاہے آبائی عقائد پر ضرب ہی کیوں نہ پڑتی ہو اور

چاہے چوری، یا خیانت پکڑی جائے یا نہ، مگر آپ کے یہاں مخلوق کے خوف کی وجہ سے خالق کے ساتھ خیانت نہیں کی جاتی۔

توحید صفحہ ۴۴ حدیث ۳۔ حضرت امیر المومنین نے فرمایا "وہ اپنی قدرت کی وجہ سے اشیاء سے جداگانہ ہے۔ اسکے غیب مکنون کے آگے غیب کے حجابات حائل ہیں۔ بلند پایہ عقول اور لطیفہ میں سے قریب ترین اوہام میں سرگشتہ ہیں"۔

اس حدیث میں سب سے پہلے جو بات نظر میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ اپنی مخلوق سے جدا ہے۔ جیسا کہ اصول کافی میں امام فرماتے ہیں "وہ شئے ہے مگر اشیاء سے جدا"۔ لیکن یہ بات ثابت کیسے ہو کہ وہ اشیاء سے جدا ہے۔ آپ اس سے قبل پڑھ چکے کہ "قدرت خدا" سے مراد حضرت امیر المومنین ہیں اور اس حدیث میں کہا گیا ہے کہ اللہ اپنی قدرت کی وجہ سے اشیاء سے جداگانہ ہے۔ یعنی قدرت وہ شئے ہے جو اللہ کو اپنی مخلوق سے جدا کرکے ممتاز کرتی ہے۔ پس اگر اللہ کو "شئے" مانا جائے تو علی وہ حد وسیلہ ہے جس کے ذریعے اللہ کو "شئے" کہا جاتا ہے اور اگر علی کو درمیان سے ہٹا دیا جائے تو پھر وہ عام اشیاء جیسا ہو جائے گا (یعنی وہ خیالی خدا ہوگا حقیقی نہیں) یا پھر (معاذ اللہ) "لاشئے" ہو جائے گا۔ پس توحید علی ہی کا دوسرا نام ہے کہ علی کو وسیلہ مان کر ہی انسان موحد بن سکتا ہے۔

آگے ارشاد ہوتا ہے "اسکے غیب مکنون (یعنی ذات امیر المومنین) کے آگے غیب کے حجابات حائل ہیں"۔ یعنی علی تک پہنچنے کے لئے پہلے ان حجابات سے گزرنا پڑتا

ہے۔ میرا بھی جی چاہتا ہے کہ میں ان حجابات کا ایک اجمالی تعارف آپ سے کراؤں۔ آپ خود پوچھئے کہ یہ حجابات کون ہیں۔

۱۔ آپ احادیث میں تواتر کے ساتھ یہ بات آئی ہے کہ جب حضرت ختمی مرتبتؐ معراج پر تشریف لے گئے اور سدرۃ المنتہیٰ سے نکل کر روشنی کے حجابوں میں داخل ہوئے تو انہیں آخری حجاب (اسم مکنون۔ غیب مکنون) تک پہنچنے سے پہلے ستر ہزار حجابات سے گزرنا پڑا۔

۲۔ مدینۃ المعاجز جلد ۲ صفحہ ۲۰۹ اور ۲۱۰ "عیون المجالس" میں انس بن مالک سے مروی ہے کہ (مدینہ سے رخصت ہوتے وقت) میں امام حسینؑ کے ساتھ چلا۔ دیکھا آپ جناب خدیجہؑ کی قبر پر تشریف لائے اور رو پڑے۔ مجھے فرمایا کہ تم چلے جاؤ۔ میں جا کر چھپ گیا۔ آپ نے نماز پڑھنے میں طول دیا اور میں نے آپ کو فرماتے ہوئے سنا۔ "اے بلندیوں والے! تجھ پر میرا اعتماد ہے۔ اس کے لئے خوشخبری ہے جس کا تو مولا ہے۔ جب وہ اپنے دکھ درد اور تکلیف کی شکایت کرتا ہے تو پھر تجھ ہی سے طلب کرتا ہے اور بھیک مانگتا ہے"۔ جب امام مظلومؑ نے یہ کلمات کہے تو آواز آئی۔ "میں حاضر ہوں۔ میں حاضر ہوں۔ تم میرے سامنے ہی ہو۔ جو بات تم نے کی میں سب جانتا ہوں۔ تیری آواز کے میرے فرشتے مشتاق ہیں۔ بس تیری آواز کافی ہے۔ ہم نے سن لیا ہے۔ تیری دعا میرے نزدیک حجابات میں گردش کر رہی ہے۔ پس مجھے

وہ حجاب کافی ہے جسے میں نے ڈال دیا ہے۔ (اس سے مراد ہمارے علم زدہ ہیں)۔ جب تیری محبت کی ہوا اس کے پہلو میں چلتی ہے تو وہ غش سے بیدار ہوتا ہے۔"

مجھے یقین ہے کہ ایک بھی مومن ایسا نہ ہوگا جس نے ان حجابات کو پہچان نہ لیا ہو۔ ہمارا سارا معاملہ ان سب پر ہے۔

اب ہم حدیث کے آخری کلمے کی طرف آتے ہیں۔ مولا فرماتے ہیں کہ یہ موقع حجابات کی معرفت نہایت باریک و دقیق ہیں اور عقولِ انسانی کی انتہا یہ ہے کہ وہ نزدیک ترین مقامات کو تلاش کرے۔ اور ان حجابات کا وہ درجہ جو بلند پایہ عقول سے نزدیک ترین ہے وہ ان کی ذات بشریت ہے۔ انسانی عقل ابھی تک ان کی بشریت کو سمجھنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہی ہے لیکن ہزار کوشش کے باوجود ان کی حقیقت تک نہیں پہنچ پائی۔ جب اپنی تمام تر صلاحیتوں اور توانائیوں کے باوجود ابھی تک انسان کو "انا بشر مثلکم" کی حقیقت سمجھ میں نہ آئی تو پھر "میرا ظاہر امامت ہے" تک وہ کیسے پہنچے گی۔ اور اس سے بڑھ کر "میرا باطن غیب ہے" کا تصور کیسے کر سکتی ہے؟ اور عقل کی اس بے مائیگی اور بے چارگی کے باوجود کوئی ان حجابات کے مقابلے میں آتا ہے اور ان کی برابری کا دعویٰ کرتا ہے تو یقیناً وہ عقل سے محروم اور مقام انسانیت سے جاہل ہے۔

توحید صفحہ ۳ حدیث ۵ میں حضرت امیر المومنین فرماتے ہیں۔ "وہ اپنے نور کی وجہ سے حجاب میں رہا"۔

یہ ایک عجیب و غریب جملہ ہے اور صرف لسان اللہ سے ہی صادر ہو سکتا ہے۔ نور مقام ظہور ہے جو مخفی یعنی پوشیدہ رہنے کی ضد ہے۔ جب چھپے گا تو ظاہر نہ رہے گا اور جب ظاہر ہو گا تو پوشیدگی ختم ہو جائے گی لیکن اللہ کی ذات وہ ہے جو اپنی پوشیدگی کو اپنے ظہور کے ذریعے ثابت کرتا ہے کیونکہ اگر پوشیدہ رہے تو کوئی اس کا اقرار نہ کر سکے گا اور اگر ظاہر ہو جائے تو پھر وہ، وہ نہ رہے گا۔ پس اس نے اپنے حجاب کو ظاہر کیا۔ اسکے ظہور کی وجہ سے وہ پوشیدہ رہتے ہوئے بھی چھپا رہا اور مخلوق تک بھی کہ ع

کوئی معشوق ہے اس پردہ زنگاری میں

اور اسی ظہور سے اسکی پوشیدگی بھی ثابت ہوتی اور دنیا نے جان لیا کہ آنکھیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں اور وہ آنکھوں کا ادراک کرتا ہے جیسا کہ آنے والی حدیث میں بیان کیا گیا ہے۔

توحید صفحہ ۴۱ حدیث ۱۳۔ جناب امیر المومنین نے فرمایا۔ "نگاہیں اسکے جبروت کی بزرگی کو نہیں پا سکتیں اس لئے کہ اس نے ان نگاہوں کو جبروت میں چھپا دیا ہے جو جبروت کی کثافت کی روانی اور سختی سے نہیں گزر سکتیں اور اسکے جبروت کی خصیتوں کی مضبوطی کو صاحب عرش کی طرف جانے کے لئے پھاڑ نہیں سکتیں۔ للہ وہ ذات ہے کہ جس کی مشیت سے امور صادر ہوتے ہیں"۔

اس حدیث کا مطلب ہی یہ ہے کہ انسان میں یہ طاقت ہے ہی نہیں کہ ان حجابات سے گزر کے پردے کے اندر جھانک کر دیکھ سکے۔ جو لوگ اشیاء عالم کو دیکھ کر اللہ کا ادراک کرنا چاہتے ہیں وہ اپنی حماقت میں گرفتار ہیں۔ چونکہ یہ تمام امور یعنی خلقت کون و مکاں خدا سے نہیں بلکہ اللہ کی مشیت سے صادر ہوئے ہیں اور انسانی عقل کی انتہا یہ ہے کہ وہ اس مشیت خدا کا تصور کرے۔ یہی وہ ہی خالق کل ہے۔ اسی لئے غالب نے فرمایا ہے۔

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے

پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے

<u>ذوالجلال والاکرام</u>

رحمٰن ۲۷۔ "ویبقی وجہ ربک ذو الجلال والاکرام"۔

رحمٰن ۷۸۔ "تبرک اسم ربک ذی الجلال والاکرام"۔

ان آیات کا ترجمہ ہم نے دانستہ طور پر نقل نہیں کیا کیونکہ مترجمین اول تو صاحب معرفت نہیں ہوتے۔ دوم یہ کہ انہیں پنڈتوں اور پادریوں کا خوف کھائے جاتا ہے۔ بلکہ ہم عربی گرامر کی رو سے ان آیات کا جائزہ لیں گے اور پھر ان کا حقیقی ترجمہ خود بخود سامنے آجائے گا۔ لیکن بہر حال وہ ارباب فن سے غلطی برداشت نہیں ہوتے انہیں میں مشورہ دوں گا کہ وہ اپنی سانسیں درست رکھیں۔

مرکب اضافی

مرکب اضافی اس مرکب لفظ کو کہتے ہیں جو دو اسموں سے مل کر بنا ہو اور ان دونوں اسموں کو اضافت یعنی زیر ۔ زیر یا پیش کے ذریعے ایک دوسرے سے ملایا گیا ہو مثلاً ''کتاب زید'' (زید کی کتاب) اس مرکب لفظ کا پہلا جزو ''مضاف'' اور دوسرا جزو ''مضاف الیہ'' کہلاتا ہے۔ مثلاً ''کتاب زید'' میں کتاب مضاف اور زید مضاف الیہ ہے۔ عربی گرامر کا اصول یہ ہے کہ چونکہ مضاف اور مضاف الیہ کے درمیان کوئی اور لفظ نہیں آتا اس لئے مضاف کی صفت ہمیشہ مضاف الیہ کے بعد آتی ہے مثلاً ''ولد الرجل الصالح'' اس میں ''ولد'' (یعنی لڑکا) مضاف ہے۔ ''الرجل'' (یعنی مرد) مضاف الیہ ہے اور ''الصالح'' صفت ہے۔ جس عربی گرامر کی رو سے اس صفت یعنی ''الصالح'' کا تعلق مضاف یعنی ''ولد'' سے ہوگا نہ کہ مضاف الیہ یعنی ''الرجل'' سے۔ اور اس کا ترجمہ ہوگا ''مرد کا نیک لڑکا''۔ اسی بات کی ایک مثال ہم خود قرآن مجید سے پیش کرتے ہیں جہاں سورۃ نجم کی آیت ۱۸ میں ارشاد ہوتا ہے۔ ''لقد رای من ایت ربہ الکبری'' ترجمہ ''یقیناً اس (رسول) نے (شب معراج) اپنے پروردگار کی سب سے بڑی نشانیوں (آیات) میں سے کچھ کو دیکھا''۔

اس جملے میں ''آیات'' مضاف ہے۔ ''رب'' مضاف الیہ ہے اور ''الکبری''

صفت ہے۔ یہاں اس صفت کا تعلق مضاف یعنی آیات سے ہے نہ کہ مضاف الیہ یعنی "ربہ" سے۔

اس اصول کی روشنی میں ہم مندرجہ بالا آیات کا جائزہ لیتے ہیں۔

پہلی آیت میں۔

"وجہ" مضاف ہے۔

"ربک" مضاف الیہ ہے۔

"ذو الجلال والاکرام" صفت ہے۔

پس اس صفت یعنی "ذو الجلال والاکرام" کا تعلق مضاف یعنی "وجہ" سے ہوگا نہ کہ مضاف الیہ یعنی "ربک" سے۔ اور اب اس آیت کا ترجمہ یوں ہوگا کہ "اور باقی رہے گا تیرے رب کا چہرہ جو ذو الجلال والاکرام (بڑی شان اور بڑی عزت والا) ہے۔

دوسری آیت میں۔

اسم مضاف ہے۔

ربک مضاف الیہ ہے۔

ذی الجلال والاکرام صفت ہے۔

لہذا اس صفت یعنی ذی الجلال والاکرام کا تعلق مضاف یعنی اسم سے ہوگا نہ کہ مضاف الیہ یعنی ربک سے اور اس آیت کا ترجمہ یوں ہوگا۔

”برکت والا ہے تیرے رب کا نام جو ذی الجلال والاکرام ہے۔

اس کی تفسیر میں امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں: ”خدا نے فرمایا ہے کہ تمہارے رب کا اسم مبارک ہے جو صاحب جلال و اکرام ہے۔ پس ہم ہیں جلالِ خدا اور کرامتِ خدا جنہی اطاعت کی محبت سے خدا نے تمام بندوں کو عزت بخشی ہے“۔ (صحیفہ سادات صفحہ ۵۸ بحوالہ تفسیر برہان)۔

اب اگر کوئی عارف مستجمع علی کو ”ذو الجلال والاکرام“ کہہ دے تو مقصر کم ظرف تو شاید خون تھوکنے لگے۔ حالانکہ جب اسے رزق یا اولاد کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ بہت بہک بہک کر مولاؤں کو مشکل کشا پکارتا ہے اور کبھی یہ نہیں سوچتا کہ وہ زبان سے کون سے الفاظ ادا کر رہا ہے اور ان الفاظ کے معنی کیا ہیں۔ یہاں ہم مفاتیح الجنان سے چھوٹی سی عبارت نقل کر رہے ہیں تاکہ واضح ہو جائے گا کہ ”ذو الجلال و الاکرام“ کون ہے اور اس کے بعد بھی اگر کسی شخص کو اعتراض ہوتا ہے تو اسے چاہیے کہ مفاتیح الجنان پڑھنا چھوڑ دے یا اسے دریا برد کر دے یا اسے زمین میں دفن کر دے۔ ہمیں بھی دیکھنا ہے کہ لوگوں کی دشمنی میں کس کس چیز کا انکار کیا جاتا ہے۔

مفاتیح الجنان صفحہ ۱۵۴۔ (دعائے سمات)۔

”وبجلال وجہک الکریم الاکرم (سمات)“۔

ترجمہ: ”پروردگارا میں سوال کرتا ہوں تیرے چہرے کے جلال کے ذریعے جو نہ

صرف یہ عزت والا ہے بلکہ جتنے بھی عزت والے ہیں ان سب سے بڑا عزت والا ہے"۔

یہاں کون ہے وہ جلال والا اور کون ہے وہ اکرام؟ وہی چہرہ جو باقی رہنے والا ہے!

۲۔ مفاتیح الجنان صفحہ ۹۵۔ "پروردگارا میں تیرے اس نام کے واسطے سے سوال کرتا ہوں جسے تو نے پردہ غیب میں پوشیدہ رکھا کہ تیرے پاس محفوظ ہے وہ تیرے سوا کسی چیز کی طرف باہر نہیں نکلتا۔ میں اس نام کے ذریعے اور تیرے ذریعے اور اسی کے واسطے سے سوال کرتا ہوں جو تیرے نام میں اجل و اشرف ہے"۔

یہ "اجل" اور "اشرف" کون ہے؟ وہی نام جو بڑا عزت والا ہے!

۳۔ مفاتیح الجنان صفحہ ۱۵۶۔ "باسمک العظیم الاعظم الاعز الاجل الاکرم"۔

ترجمہ: "(پروردگارا میں سوال کرتا ہوں) تیرے اس نام کے واسطے سے جو عظیم بھی ہے اور اعظم بھی۔ عزت والا اور جلیل و اکرم ہے"۔

یہاں جلیل و اکرم کون ہے؟ وہی نام جو بڑا عزت والا ہے!

۴۔ مفاتیح الجنان صفحہ ۲۰۶۔ "اعوذ بجلال وجھک الکریم"۔

ترجمہ: "میں تیرے کریم چہرے کے جلال کے ذریعے پناہ چاہتا ہوں"۔

یہاں ذوالجلال والاکرام کون ہے؟ وہی چہرہ جو باقی رہنے والا ہے!

اور پیغمبر کریم نے وہ وجہ دیکھا جنکے کرم کے نہ صرف اپنے بلکہ اغیار بھی قائل ہوں؟۔ اگر قائل نہ ہوتے تو انکے نام کے ساتھ "کرم اللہ وجہہ" کیوں لگاتے؟۔ یہ سچ بات ہے کہ وہ کسی توجیہ کو چاہے اور کریں اور جھوٹے شیعہ بھی اتنے ہم زبان ہو جائیں کہ علی کرم اللہ وجہہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ انھوں نے کبھی بتوں کو سجدہ نہیں کیا تھا۔ جاننا چاہئے کہ اس زمانے میں اور بھی بہت سے لوگ ایسے موجود تھے جنہوں نے کبھی بتوں کو سجدہ نہیں کیا تھا۔ ایک پورا گروہ پایا جاتا تھا جو حنفاء ابراہیمی پر تھا اور موحد تھا اور حضرت ابوذر جنکے ایک فرد تھے۔ خود حضرت سلمان نے بھی کبھی بتوں کو سجدہ نہیں کیا تھا۔ پھر ان دونوں کے نام کے ساتھ کرم اللہ وجہہ کیوں نہیں لگایا جاتا؟۔ یہ سبب ہرگز نہیں ہے بلکہ یہ خدا کی قدرت تامہ ہے جس نے لوگوں کی زبانوں کو مجبور کر دیا ہے کہ ان سے کرم اللہ وجہہ کہلوائے تاکہ انکے چہرے سے کرم کا اعلان ہو سکے۔

اور پیغمبر کریم نے وہ وجہ دیکھا جنکے کرم کی وسعت کو دوست بلکہ دشمن بھی اعتراف کرتے ہوں؟۔ عمرو بن عبدود جب جنگ خندق میں حضرت امیر المومنین کے مقابلے میں آیا تھا تو وہ انتہائی قیمتی زرہ اور زیورات پہنے ہوئے تھا اور اسکی تلوار میں متعدد قیمتی جواہر جڑے ہوئے تھے کہ پورا عرب اسے للچائی ہوئی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ لیکن جب وہ قتل ہو گیا اور اسکی بہن اسکی لاش پر آئی تو دیکھا کہ ان قیمتی چیزوں میں سے کسی ایک کو بھی ہاتھ تک نہیں لگایا گیا اور وہ جوں کی توں موجود ہیں۔ اس وقت اس نے کہا "اے بھائی اگر تیرا قاتل کوئی اور ہوتا تو میں زندگی بھر تیرا ماتم کرتی۔ لیکن اب میں تجھ پر نہیں

رہو گی کیونکہ مجھے کسی مریم نے قتل کیا ہے"۔

ہم نے مضاف، مضاف الیہ اور صفت کا جو اصول بیان کیا ہے اس کو ذہن میں رکھتے ہوئے آپ قرآن کا مطالعہ فرمائیے اور اپنے مولا کی شان کا مشاہدہ کیجئے۔ اس کتاب میں آئندہ جب یہ مضامین آئیں گے تو ہمیں وضاحت کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

عظمت

ہمارے یہاں عربی زبان کی جو مشہور لغات ملتی ہیں ان میں الفاظ کے موٹے معنی دیے جاتے ہیں اور کسی خصوصیت کا خیال نہیں رکھا جاتا جس کی وجہ سے تفہیم قرآن و حدیث میں بڑی مشکلات درپیش آتی ہیں۔ مثلاً حمد، مدح، مدحت، ثناء، توصیف، ان تمام الفاظ کے معنی "تعریف" ملتے ہیں۔ حالانکہ یہ مختلف الفاظ ہیں اور ان کے معنی بھی مختلف ہیں۔ یہی صورت لفظ "عظمت" کی بھی ہے۔ اس کے معنی "بزرگی" بتائے جاتے ہیں جو ایک مبہم مجمل لفظ ہے اور اس لئے پورا لفظ عظمت کا صحیح مفہوم ذہن میں نہیں آسکتا۔ عظمت درحقیقت اس بزرگی اور بڑائی کو کہتے ہیں جسے ناپتے تمہاری عقلیں رد ہو کر جھک جائیں۔ اس لئے ہم جب رکوع میں جھکتے ہیں تو "سبحان ربی العظیم" کہتے ہیں۔ اس سے عظمت خدا کا امکانی تصور کیا جا سکتا ہے لیکن یہ بات ذہن میں رکھنا ہوگی کہ عظمت خدا ہمارے فہم سے خارج ہوتی ہے اور وہی علی عظیم ہے۔ چنانچہ

اسی جلد صفحہ ۹۰ پر حضرت امیر المومنین فرماتے ہیں۔ "محمد رؤف و رحیم ہے اور میں علی عظیم ہوں"۔ ان کی عظمت کے آگے سر تسلیم خم کرنا نہ صرف کائنات کے ذرے ذرے پر بلکہ تمام انبیاء، اولیاء، اوصیاء۔ یہاں تک کہ حضرت ختمی مرتبت تک پر واجب ہے۔ اصول کافی۔ کتاب حجت۔ باب ۱۲۴۔ حدیث ۳ میں جابر بن عبد اللہ انصاری سے روایت ہے کہ "میں خدا کو گواہ قرار دے کر کہتا ہوں کہ میں حیات رسولؐ میں جناب فاطمہؑ کی خدمت میں حاضر ہوا امام حسینؑ کی ولادت کی مبارک باد دینے کے لئے۔ میں نے ان کے ہاتھ میں ایک سبز لوح دیکھی۔ اس پر سورج کی طرح روشن ایک تحریر تھی۔ میں نے کہا "اے بنت رسول! یہ لوح کیا ہے؟"۔ فرمایا: یہ اللہ نے اپنے رسولؐ کے پاس بھیجی ہے"۔ اس کی تحریر کا ایک جملہ یہ تھا: "اے محمد! میرے اسماء کی تعظیم کرو اور میری نعمتوں کا شکر ادا کرو"۔

اور حضرت کی خصوصیت یہ ہے کہ آپ نے نہ صرف عظمت خدا کے سامنے سر تسلیم خم کیا بلکہ اس عظمت کا مشاہدہ کیا جو کوئی اور نہیں کر سکا جیسا کہ حضرت موسیٰ کے واقعہ سے ظاہر ہے۔ توحید صفحہ ۸۳ حدیث ۲ میں امام حسن عسکری کی ایک توقیع مبارک درج ہے جس کا ایک جملہ یہ ہے۔ "بیشک اللہ نے اپنے رسولؐ کے قلب کو اپنے نور عظمت میں سے جو پسند کیا دکھایا"۔ اسی کتاب کے صفحہ ۸۲ حدیث ۹ میں حضرتؐ کا یہ فرمان موجود ہے جس میں آپ فرماتے ہیں۔ "اللہ نے اپنے نور عظمت میں سے

جنت پر مجھ کو دکھایا"۔ اس سے اللہ کے نور عظمت کی وسعت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اللہ نے حضرت آدمؑ کی مرتبت کو بھی اپنے عظمت کے نور کا کلی نہیں بلکہ جزوی مشاہدہ کرایا۔

اس کی عظمت الٰہیہ کا ہم اپنی استطاعت کے مطابق ذکر کرتے جا رہے ہیں تاکہ شک اور تذبذب سے اللہ کی پناہ مانگیں اور اپنے دلوں کو باخدا اللہ کی تعظیم کے ساتھ جھکا دیجئے۔ جیسا کہ سورہ نور ۳۶ میں ارشاد ہوا ہے۔ "یہ نور ان گھروں میں ہے جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ ان کی تعظیم کی جائے اور ان میں اس کے اسم کا ذکر کیا جائے"۔

اسم اعظم

وہ چہاردہ زیارات جو کتب معتبرہ میں منقول ہیں وہ خود امام معصومین کی تعلیم کردہ ہیں اور باب اعتقادات میں ہمارے لئے سند ہیں۔ علامہ عباس قمی شیعہ دنیا میں ایک بڑا نام ہے اور ان کی کتاب مفاتیح الجنان ہر شیعہ گھر میں موجود ہے۔ اس میں درج دعاؤں اور زیارات کو شیعہ حضرات بڑی عقیدت اور محبت سے پڑھتے ہیں لہٰذا جب ہم اس کتاب سے اللہ کے اسم کے مقامات کی نشاندہی کریں تو کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ کوئی حرف حقارت زبان پر لائے۔ چونکہ طالب رزق حلال و رزق پاک کے لئے وہ بھی دعاؤں کو بہت خضوع و خشوع سے پڑھتے ہیں لہٰذا یہاں ذکر میں ہونا چاہئے کہ ان کی دعاؤں میں رسالت کا تذکرہ نکل آئے تو لوگ سارا خضوع و خشوع بھول کر پتھر مارنے لگیں

مشغول ہو جائیں۔

ان دعاؤں اور زیارات میں اللہ کے اسم کی عظمت کا تعارف بڑے لطیف و جمیل پیرائے میں کرایا گیا ہے جس کا ذکر انشاء اللہ آئندہ اوراق میں آتا رہے گا۔ یہاں ہم اللہ کے اسم اعظم کے بارے میں ایک مختصر جائزہ پیش کرتے ہیں لیکن سب سے پہلے ہم چاہتے ہیں کہ آپ یہ جان لیں کہ وہ اسم اعظم کون ہے۔

۱۔ کنز الاسرار جلد ۱ حضرت امیر المومنین فرماتے ہیں: "میں اللہ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ایک اسم ہوں جو عظیم و علی ہے"۔

اسم اعظم کے بارے میں تو ہم بات کر رہے ہیں لیکن اس حدیث میں آنجناب نے خود کو "اسم علی" بھی فرمایا ہے لہٰذا تصدیق خود خداوند قدوس اپنے کلام میں یوں فرماتا ہے۔

سورۃ الاعلیٰ آیت ۱۔ "سبح اسم ربک الاعلی (پ ۳۰)"۔

ترجمہ: "(اے رسولؐ!) تو اپنے رب کے اسم کی تسبیح کرتا رہ جو علی ہے"۔

۲۔ کنز الاسرار جلد ۱ صفحہ ۳۹۵: "ایک مرتبہ حضرت امیر المومنین ایک راستے سے گزر رہے تھے اور ایک خیبری (یہودی) آپ کے ہمراہ تھا۔ چنانچہ دونوں کا گزر ایک وادی سے ہوا جس میں پانی بہہ رہا تھا۔ خیبری نے اپنی چادر پر سوار ہو کر کچھ پڑھا اور پانی پر سے گزر گیا اور پلٹ کر حضرت کو آواز دی: "اے شخص! اگر تو بھی جانتا ہے جو میں جانتا ہوں تو تو بھی پانی پر سے گزر جا جیسا کہ میں گزر گیا۔ حضرت نے پانی کی طرف اشارہ

فرمایا وہ جم گیا اور آپ اس پر سے گزر گئے۔ جب خیبری نے دیکھا تو آپ کے پیچھے دوڑا اور
پریشان ہو گیا اور کہنے لگا'' اے جوان! تو نے کیا کہا کہ پانی جم کر پتھر بن گیا؟'' آپ
نے اس سے پوچھا'' تو نے کیا کہا تھا کہ پانی پر سے گزر گیا؟'' اس نے جواب دیا
کہ'' میں نے <u>اللہ کو اس کے اسم اعظم کے ساتھ پکارا تھا</u>'' آپ نے پوچھا'' وہ اسم
اعظم کیا تھا؟'' اس نے جواب دیا کہ'' میں نے محمد اعظم کے وصی کے نام کے ساتھ
خدا سے سوال کیا تھا'' آپ نے فرمایا'' محمد کا وصی میں ہی ہوں''۔

آپ کے جذبہ محبت کی تقویت کے لئے ہم ان الآخر والمنتہیٰ (اردو) جلد ۲ صفحہ ۱۰۳
سے اس دعا کا ایک اقتباس پیش کرتے ہیں جو حج کے موقع پر طواف کعبہ کرتے
ہوئے پڑھی جاتی ہے۔ موصوف فرماتے ہیں کہ حالت طواف میں پڑھو۔

'' اے اللہ میں تیرے اس اسم کے واسطے سے سوال کرتا ہوں جس سے سطح آب پر بھی
اسی طرح چلا جا سکتا ہے جس طرح سطح زمین پر چلا جاتا ہے اور میں تیرے اس اسم کے
واسطے سے سوال کرتا ہوں جو تیرے پاس تیرے خزانے میں پوشیدہ ہے اور میں تجھ
سے سوال کرتا ہوں تیرے اس اسم کے واسطے سے جو اعظم، اعظم، اعظم، اعظم
الاعظم الاعظم ہے''۔

آپ نے پہچان لیا کہ اللہ کا اسم اعظم کون ہے۔ اور اب ہم مفاتیح الجنان سے چند
دعاؤں کے کلمات نقل کرتے ہیں۔

صفحہ ۲۰: '' اے معبود! بہشت میں تیرے <u>عرش کے مقامات</u> بلند۔ <u>تیری کتاب کی</u>

تجھ سے رحمت اور تیرے اسم اعظم اور تیرے کامل کلمات جو صدق و عدل میں
پورے ہیں کے واسطے سے سوال کرتا ہوں"۔

۲۔ صفحہ ۵۵۔ "پروردگار! میں سوال کرتا ہوں تیرے حق۔ اور تیری صفت و
میں جو اعظم ہے کے واسطے سے"۔

۳۔ صفحہ ۵۵۔ "اے معبود! میں سوال کرتا ہوں تیرے اسم کے ذریعے جو عظیم بھی
ہے اور اعظم بھی۔ کہ جب آسمان کے بند دروازے کھولنے کے لئے تجھے اس نام
سے پکاریں تو وہ کھل جائیں اور جب زمین کے تنگ راستے کھولنے کے لئے تجھے اس نام
سے پکارا جائے تو وہ کشادہ ہو جائیں اور جب تنگی کے وقت آسانی کے لئے اس نام
سے پکاریں تو آسانی ہو جائے اور جب مردوں کو اٹھانے کے لئے تجھے اس نام
سے پکاریں تو وہ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اور سوال کرتا ہوں تیرے چہرے کے جلال
کے ذریعے جو کریم بھی ہے اور اکرم بھی۔ سب سے معزز ذات کہ جس کے آگے
چہرے جھکتے ہیں اور جس کے سامنے گردنیں خم ہوتی ہیں اور جس کے خوف سے دل کانپتے ہیں
اور دل خوفزدہ ہو جاتے ہیں۔ اے اللہ! تیری عظمت کے واسطے سے اس کے
ذریعے سے تو نے اپنے بندے اور رسول حضرت موسیٰ سے کلام فرمایا"۔

۴۔ صفحہ ۵۶۔ "پروردگار! میں سوال کرتا ہوں تیرے اس اسم کے واسطے سے جو عظیم
بھی ہے اور اعظم بھی۔ بلند و برتر۔ عزت والا۔ جلال والا اور کریم۔ اور تیری شان کے

واسطے سے جس کے ذریعے تو نے تجلی فرمائی اپنے کلیم موسیٰ کے لئے طور سینا میں اور اس سے پہلے اپنے خلیل ابراہیم کے لئے مسجد خیف میں اور اپنے برگزیدہ اسحاق کے لئے چاہ شیع میں اور اپنے نبی یعقوب کے لئے بیت ایل میں۔ اور تیری اس شان کے واسطے سے جو تو نے فرمان پر حضرت موسیٰ کے لئے ظاہر ہوئی۔ تیری شان و عزت اور غلبے میں عزت والی نشانیوں سے اور غالب سلطان سے۔ قدرت کی بلندی اور تیرے کلمہ تامہ کی شان سے اور تیرے ان کلمات سے جن کے ذریعے تو نے آسمانوں اور زمین کے رہنے والوں اور اہل دنیا اور اہل آخرت پر احسان کیا۔ میں سوال کرتا ہوں تیرے نور کے واسطے سے جس کے خوف سے طور سینا چکنا چور ہوا۔ اور تیرے علم و جلالت۔ تیری بڑائی اور عزت اور تیرے جبروت کے واسطے سے جس کو زمین برداشت نہ کر سکی اور آسمان عاجز ہو گیا اور اس سے زمین کی گہرائیاں کپکپا گئیں۔ جھک گئے سمندر اور نہریں رک گئے۔ پہاڑ اس کے لئے جھک پڑے اور زمین اس کے ساتھ اپنے قدموں پر رک گئی۔ اس کے سامنے ساری ہی مخلوق سرنگوں ہو گئی۔ اپنے راستوں پر چلتی ہوئی ہوائیں اس کے سامنے پریشان ہو گئیں۔ میں سوال کرتا ہوں تیرے سلطان کے واسطے سے جس کے ذریعے ہمیشہ تیرے غلبے کی پہچان ہوتی ہے اور آسمانوں اور زمین میں اس سے تیری حمد ہوتی ہے"۔

۵۔ صفحہ ۱۲۴ پر "اے معبود! میں سوال کرتا ہوں تیرے تمام ناموں کے واسطے سے جن کا

جنہیں ہم جانتے ہیں اور جنکا ہمیں علم نہیں۔ اور سوال کرتا ہوں تجھ سے تیرے اس اسم کے واسطے سے جو عظیم بھی ہے اور اعظم بھی۔ کبیر بھی ہے اور اکبر بھی"۔

جس شخص میں تھوڑا سا بھی ایمان ہے اور جسکے سینے میں علیؑ کی ذرا سی بھی محبت ہے وہ یقیناً ان دعاؤں کو پڑھ کر عرش کی سیر کر رہا ہوگا اور اسکی روح نجف کا طواف کر رہی ہوگی۔ اسکی آنکھوں میں خوشی کے آنسو ہونگے اور اسکو یہ محسوس ہو رہا ہوگا جیسے اسکا دل خوشی کے مارے اچھل کر سینے سے باہر آجائے گا۔ علیؑ کے ذکر کی خصوصیت ہی یہی ہے اور اسی کے بارے میں اللہ نے فرمایا ہے "الا بذکر اللہ تطمئن القلوب"۔

مندرجہ بالا دعاؤں میں حضرت امیر المومنینؑ کی جو خصوصیات بیان کی گئی ہیں ان پر نظر کرنا ضروری ہے۔

۱۔ عرش کے مقامات بلند۔ ۲۔ کتاب اللہ کی انتہاء رحمت۔ ۳۔ اللہ کا اسم عظیم اعظم۔ ۴۔ کلمۂ تامہ۔ ۵۔ اللہ کا حق۔ ۶۔ اللہ کی پاکیزگی۔ ۷۔ جسکے ذریعے مردوں کو زندہ کیا جائے۔ ۸۔ اللہ کا وہ چہرہ جو جلیل و اکرم ہے۔ ۹۔ جسکے آگے پیشانیاں سجدے کرتی ہیں۔ ۱۰۔ جسکے سامنے گردنیں خم ہوتی ہیں (اور یہ حالت رکوع ہے)۔

۱۱۔ جسکے حضور آوازیں کانپتی ہیں۔ ۱۲۔ بلند و برتر (یہ لفظ علی کا ترجمہ ہے)۔ ۱۳۔ اللہ کی شان۔ ۱۴۔ اللہ کا نور۔ ۱۵۔ اللہ کا جبروت جسکی تاب مخلوق میں نہیں اور قہر جسکے آگے سرنگوں ہے۔ ۱۶۔ اللہ کا سلطان (اسکی وضاحت آئندہ اوراق میں آئے گی)۔

۷ ۔ وسیلہ محمد ۔

عرش کے مقامات بلند

اللہ کی تمام مخلوق زمان و مکان کی قیدی ہے اور ان سے باہر نکلنا اس کے لئے محال ہے۔ بڑی بات یہ ہے۔ نفس انسانی کے پاس جو طاقتیں موجود ہیں ان میں قوی ترین قوت واہمہ ہے جو نفس ناطقہ کا موثر ترین ہتھیار ہے۔ تخیل کی مدد سے وہ دریا کے سینے میں اتر جاتا ہے اور اس کی غواصی کو تلاش کرکے محیر العقول نتائج برآمد کرتا ہے اور ان نتائج کی بنیاد پر عجیب و غریب اشیاء ایجاد کرتا ہے لیکن یہ قوت واہمہ بذات خود زمان و مکان کی اسیر ہے اور انسان کسی ایسی شے کو اپنے وہم میں نہیں لا سکتا جو ان حدود سے باہر ہو اور نہ کسی کی سمجھ میں کوئی ایسی بات آ سکتی ہے جو زمان و مکان سے ماوراء ہو۔ اس لئے اللہ نے قرآن میں اور معصومین نے اپنے ارشادات میں لوگوں کو جو کچھ سمجھایا ہے وہ انہی حدود کے حوالے سے ہے کیونکہ یہ انسان کی خلقت کی مجبوری ہے۔ لہٰذا جب اللہ کو اپنی بلندی اور عظمت کا اظہار مقصود ہوا تو اس نے عرش کی مثال کے ذریعے سمجھایا ہے تاکہ لوگ اپنی اپنی استطاعت کے مطابق سمجھ سکیں۔ مگر ہماری یہ بات کہ ان مثالوں سے اللہ یا کسی جسم کے مقام کا تعین کرنا مقصود نہیں ہے۔ نہ ہی ان مثالوں کی وجہ سے اللہ اور جسم اللہ کو محدود کیا جا سکتا ہے بلکہ یہ محض افہام و تفہیم کے لئے ہے اور یہ بات ذہن میں رکھنا بہت ضروری ہے۔

عرش مکانات میں داخل ہے اور مکان سے بلند ترین مقام کا نام ہے۔ عرش کے سلسلے میں مختلف مفسرین مختلف مفاہیم ظاہر کیے ہیں۔ کچھ نے اسے ایک چوکور اور مربع شکل کا ایک ہیولا سمجھا ہے۔ کچھ نے اس سے مراد تخت لیا ہے جو اس کے لغوی معنی بھی ہیں اور یہ بیان کیا ہے کہ اللہ بذات خود اس تخت پر بیٹھتا ہے۔ لیکن ائمہ معصومین کے ارشادات سے جو کچھ ماخوذ ہوتا ہے اس کے مطابق عرش سے مراد ہے اللہ کا علم۔ اللہ کی قدرت۔ اللہ کی حکومت۔ اللہ کی بلندی۔ اللہ کی عظمت۔ اللہ کا غلبہ۔ اللہ کا کرم اور اللہ کا جلال۔ معنوی اعتبار سے عرش ان تمام صفات کے بلند ترین مقام کا نام ہے اور اس بلند ترین مقام کی انتہائی بلندی کا نام علی ہے۔ علی کہتے ہی اس بلندی کو ہیں جس کو کوئی بلندی چھو تک نہ سکے اور جیسا کہ عرض کیا گیا کہ علی کا یہ تعارف بھی انسانی عقول کی حدود کے لحاظ سے ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ علی اپنے معنوں میں علی ہے ان معنوں میں اللہ علی ہے یہی وجہ ہے کہ علی اللہ کا ولی ہے ہم سمجھتے ہیں جس کے ذریعے اللہ کو علی کہہ کر پکارا جاتا ہے۔

بہر حال جس مقام پر ہم گفتگو کر رہے ہیں وہاں حضرت امیر المومنین کو "عرش کے مقامات بلند" بتلایا گیا ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اللہ نے بھی اپنی وسعت و عظمت و بلندی کا تعارف عرش ہی کے ذریعے کرایا ہے جس کی تشخیص مندرجہ ذیل آیت سے ہوتی ہے۔

نمل ۲۶۔ "اللہ وہ ہے کہ جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ عرش عظیم کا رب ہے"۔

یہاں عرش کو "عظیم" کہا گیا ہے اور اسی کا آئینہ دار ہے دعا کا وہ جملہ کہ "پروردگار! میں سوال کرتا ہوں تجھ سے اس اسم کے واسطے سے جو عظیم بھی ہے اور اعظم بھی"۔

عرش بڑی قوت و بلندی کی حد آخر ہے اور اسکو اللہ نے عظیم کہا ہے، اعظم نہیں کہا۔ لفظ "عظیم" کا تو ہم کسی حد تک ادراک کر سکتے ہیں لیکن لفظ "اعظم" ہماری رسائی سے باہر ہے اور اسے محض اسکی لفظی ساخت یعنی صیغہ تفضیل ہونے کی بنا پر ہم سمجھ پاتے ہیں اور یہی عالی کی شان ہے جسکے ذریعے وہ اسم اللہ ہونے کے ناطے اپنے مسمّیٰ کا تعارف کرتا ہے کہ اسکا ایک پہلو یعنی "عظیم" مخلوق سے ملا ہوا ہے اور دوسرا پہلو یعنی "اعظم" اللہ سے ملا ہوا ہے۔ اسکا ایک پہلو جسے اللہ نے قرآن مجید میں "عالی کبیر" کہا ہے مخلوق سے ملا ہوا ہے اور اسکا دوسرا پہلو "اکبر" اللہ سے ملا ہوا ہے۔

۲۔ مومنون ۱۱۶ "پس برتر ہے بادشاہ برحق اللہ تعالیٰ۔ اسکے سوا کوئی معبود نہیں۔ رب ہے عرش کریم کا"۔

یہاں اللہ نے عرش کو کریم کہا ہے اور ہم آئینہ پاتے ہیں دعا کا وہ جملہ کہ "پروردگار! میں سوال کرتا ہوں تجھ سے اس اسم کے واسطے سے جو کریم بھی ہے اور اکرم بھی"۔

عظیم و اعظم، کبیر و اکبر کے تناظر میں کریم اور اکرم کو بھی دیکھا جا سکتا ہے اور وہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے جو پہلے ظاہر ہو چکا۔

۳۔ حدید ۴:۵۷ ''وہ (اللہ) وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں بنایا۔ پھر وہ عرش پر مستوی ہوا۔ وہ جانتا ہے جو کچھ زمین میں داخل ہوتا ہے اور جو کچھ اس میں سے نکلتا ہے اور جو کچھ آسمانوں سے نازل ہوتا ہے اور جو کچھ اس میں چڑھتا ہے اور وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں کہیں بھی تم ہوتے ہو اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ سے خوب دیکھنے والا ہے۔ آسمانوں اور زمین کی حکومت اسی کے لئے ہے اور تمام معاملات اللہ ہی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں''۔

اس آیت میں عرش کے حوالے سے اللہ نے اپنی چند صفات کا ذکر فرمایا ہے۔ ان میں سب سے پہلی صفت، عالم ہے۔ پھر قدرت، پھر حکومت، پھر حاضر و ناظر ہونے کا ذکر اور پھر اسکی صفت بصیر کا تذکرہ۔ یہ تمام الوہیت کے اجزاء اور اسکے متعلقات ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کا عرش کے حوالے سے اپنا تعارف کرانا درحقیقت وابستہ امیر المومنین کا تعارف کرانا ہے۔

۴۔ اعراف ۵۴:۷ ''یقیناً تمہارا رب اللہ تعالیٰ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا۔ پھر عرش پر مستوی ہوا۔ وہ رات کو دن سے ڈھانپتا ہے جو جلدی (جلدی) کی تلاش میں (پیچھے چلا) آتا ہے اور سورج اور چاند اور ستارے اسکے حکم کے تابع ہیں۔ آگاہ رہو کہ خلق و امر اسی کے لئے ہیں''۔

اس آیت میں قدرت و حکومت کے ساتھ خلق و امر کی بات کی گئی ہے۔ یہ آپ سب جانتے ہیں کہ خلق اسے کہتے ہیں جو قدرتی ہو اور امر اسے کہتے ہیں جو بلا قدرتی خلق

ہو اور جو خدا سے براہ راست وجود میں آئے اور ان دونوں چیزوں یعنی خلق و امر کا تعلق ولایت سے ہے۔ آپ یہ بھی دیکھیں گے کہ جہاں اللہ نے عرش کا ذکر کیا ہے وہیں کائنات کی خلقت کا بھی ذکر کیا ہے اور یہ بھی فرمایا ہے کہ پوری کائنات کو اس نے چھ دنوں یا چھ وقتوں میں خلق کیا ہے۔ یہ لفظی ترجمہ ہے ورنہ اس سے مراد یہ ہے کہ چھ مراحل میں ہر شے کو خلق کیا گیا ہے۔ یہ مسئلہ بھی سمجھ لیا جائے تو اچھا ہے۔ معصوم فرماتے ہیں کہ "کوئی شے وجود میں نہیں آسکتی جب تک چھ مراحل سے نہ گزرے۔ مشیت، ارادہ، امر، قضا، قدر اور اجل" مشیت کے معنی ہیں چاہنا۔ یعنی ہر مخلوق پہلے مشیت خدا میں آتی ہے۔ پھر ارادے میں اور پھر امر میں۔ جب امر ہوتا ہے تو قضا ظاہر ہوتی ہے۔ قضا کے معنی ہیں وہ تمام امور جو کسی مخلوق کو انجام دینا ہوتے ہیں یا اسے درپیش ہونے والے ہوتے ہیں۔ اس کے بعد قدر کی منزل آتی ہے۔ قدر کے معنی ہیں مخلوق کو وہ تمام اندازہ، صلاحیتیں اور قوتیں عطا کرنا جو اس کے فرائض کی ادائیگی کے لئے ضروری ہوں۔ آخر میں اجل معین ہوتی ہے۔ اجل کے معنی ہیں وہ مدت معینہ کہ دوران اسکو وہ تمام امور مکمل کرنا ہوتے ہیں جن کے لئے اسے خلق کیا گیا ہے۔

یہ چھ کا عدد بھی عجیب عدد ہے۔ سائنس کہتی ہے کہ زندگی کیلئے کاربن کا وجود ضروری ہے اور کاربن کا اٹامک عدد چھ ہے۔ اسی طرح انسان کی پیدائش بھی چھ مرحلوں میں ہوتی ہے۔ اگر شریعتوں کو بھی دیکھا جائے تو وہ بھی چھ مرحلوں میں نازل کی گئیں۔ اور

اگر ذرا سا بھی تدبر کیا جائے تو آپ فوراً محسوس کریں گے کہ پوری آیت کا خلاصہ بھی ایک چھ مہینے کا بچہ تھا۔

آپ محسوس فرمائیں گے کہ عمل تخلیق امر سے جاری ہوتا ہے اور امر میرا مولا ہے۔ وہ امر بھی ہے اور صاحب امر بھی۔ امر پیدا ہوتا ہے ارادے سے۔ اور ارادۃ اللہ بھی میرا مولا ہے۔ ارادہ پیدا ہوتا ہے مشیت سے۔ اور مشیت بھی میرا مولا ہے۔ مشیت کا سرچشمہ ہے علم خدا۔ اور آپ میرے مولا کا فرمان پڑھ چکے ہیں کہ "میں ہوں اللہ کا علم"۔ پس سلسلہ خلق اول تا آخر علی مرتضیٰ کے ہاتھ میں ہے کیونکہ وہ اللہ کا ہاتھ ہے اور خلق کا تعلق ہاتھ ہی سے ہوتا ہے۔

۵۔ رعد ۲۔ "اللہ وہی ہے جس نے آسمانوں کو بغیر ایسے ستونوں کے بلند کیا جنکو تم دیکھتے ہو۔ پھر وہ عرش پر مستوی ہوا۔ اور اس نے سورج اور چاند کو کام میں لگا دیا۔ ہر ایک مقررہ مدت کے لئے چل رہا ہے۔ وہی تمام امور کی تدبیر کرتا ہے اور آیتوں کو تفصیل سے بیان کرتا ہے تاکہ تم اپنے رب کی ملاقات پر یقین کرو"۔

اس آیت میں تین باتیں فکر کی متقاضی ہیں۔ تدبیر امور۔ آیات کی تفصیل اور رب سے ملاقات۔

تدبیر امور

امور جمع ہے امر کی اور امر کے معنی جب حضرت امیر المومنین سے پوچھے گئے تو آپ

نے فرمایا" کے معنی ہیں خلق۔ رزق۔ اجل۔ عمر۔ حیات و موت۔ علم غیب۔ رضی
اور دوسرے معجزات جو حضرات ائمہ و پنجتن ہی کے لئے مخصوص ہیں"۔ (اصول کافی
و حقائق و ساند)۔ اس لئے یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ جو صاحب امر ہو گا وہی
خالق و مربی کائنات ہو گا۔

حقائق و ساند جلد اصفحہ ۱۱۵ پر بحوالہ احتجاج طبرسی جناب امیر المومنین کا یہ
ارشاد درج ہے۔ "اس (اللہ) نے اپنے دوستوں کے لئے اپنے مثل پیدا کئے ہیں اور کلی
تخلیق میں ایک ایسی قدرت پیدا کر دی ہے جو کلی ترتیب تخلیق کا تذکرہ کرتی ہے اور یہ
ہے جسکے ذریعے وہ تمام کائنات پر غالب ہے اور یقیناً خدا کا فعل انکا فعل ہے"۔

حقائق و ساند جلد اصفحہ ۲۳۲ بحوالہ اصول کافی۔ امام جعفر صادق فرماتے
ہیں۔ "تمھیں معلوم نہیں کہ دنیا و آخرت امام کے لئے ہیں۔ امام کو اختیار ہے کہ انھیں
جس طرح چاہے استعمال کرے اور جس طرح چاہے عطا کرے۔ یہ اختیار خدا نے انکو
عطا کیا ہے"۔

غرر الحکم و درر الکلم میں جناب امیر المومنین کا یہ فرمان محفوظ ہے۔ "ہم ہی
اسکے پہلو اور ہاتھ، اسکی زبان اور اسکا امر ہیں۔ اور ہم ہی اسکا علم اور اسکا حق
ہیں۔ جب ہم چاہتے ہیں تو خدا بھی چاہتا ہے اور ہم جو ارادہ کرتے ہیں تو خدا بھی
وہی ارادہ کرتا ہے۔ ہم ہی وہ وجہ اللہ ہیں جو زمین پر تمہارے درمیان پھر رہی

سے تصرف کرتے ہیں۔ بہ تحقیق کہ تمام مخلوق کی بازگشت ہماری ہی طرف ہے اور ہم ہی ان کا حساب لینے والے ہیں"۔

ان احادیث سے وہ تمام امور ثابت ہوتے ہیں جو اللہ نے عرش کے حوالے سے اپنے بارے میں ارشاد فرمائے اور یہ بات منکشف ہوتی ہے کہ صفات خدا کا ظہور اسم محمد سے ہی ہوتا ہے۔

آیت کی تفصیل

یونس ۳۷: "اور یہ قرآن ایسا نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی طرف سے جھوٹ موٹ بنا لیا جائے بلکہ وہ تصدیق ہے ان کی جو اس کے پاس ہے اور تفصیل ہے تمام جہانوں کے پروردگار کی طرف سے آئی ہوئی کتاب کی جس میں کوئی ریب نہیں"۔

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ قرآن دراصل ایک ایسی کتاب کی تفصیل ہے جس میں کوئی ریب نہیں اور جیسے مولا فرماتے ہیں کہ "الم ذالک الکتاب لا ریب فیہ" "میں ہوں وہ کتاب جس میں کوئی ریب نہیں"۔ لہٰذا صحیح مطلب یہ ہوا کہ قرآن درحقیقت حضرت امیر المومنین ہی کی تفصیل بیان کرتا ہے اور یہی مراد ہے آیت کی تفصیل سے۔

"رب سے ملاقات" کے بارے میں ہم گذشتہ اوراق میں تفصیل سے

چاہیے یعنی اس بات کو سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہونی چاہیے۔

۲۔ سجدہ ۴: ''اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ دونوں کے درمیان ہے چھ وقتوں میں پیدا کیا۔ پھر وہ عرش پر مستوی ہوا۔ تمہارے لیے اسکے سوا نہ کوئی ولی ہے اور نہ شفیع (سفارشی)''۔

اس آیت میں اللہ نے عرش کے حوالے سے مکمل رہنمائی و ہدایت فراہم کر دی ہے جسکی وضاحت کی کوئی ضرورت نہیں۔

۳۔ مومن ۱۵: ''بلند درجے والا، عرش کا مالک، اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اپنے امر سے روح نازل کرتا ہے تاکہ ملاقات کے دن سے ڈرائے''۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ جس کسی کے بھی درجات کو بلند کرتا ہے تو وہ تحت امر و روح ہوتا ہے اور امر و روح ہی بلندیٔ درجات کی بنیاد ہوتے ہیں۔ ''فضلنا بعضهم على بعض'' کے یہی معنی ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ آدم کو جو سجدہ کرایا گیا تھا وہ بھی اسی امر و روح کی وجہ سے تھا۔ اس سلسلے میں ہم سورہ شوریٰ کی آیت ۵۲ آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں تاکہ آپکو اس امر و روح کی اہمیت کا صحیح اندازہ ہو سکے۔

''اور اسی طرح ہم نے تیری طرف ایک روح وحی کی جو ہمارے امر سے تھی۔ تو نہیں جانتا تھا کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا۔ لیکن ہم نے اس (روح) کو نور قرار دیا جس

سے ہم جس کسی کو چاہتے ہیں ہدایت کرتے ہیں۔ بیشک تو صراط مستقیم پر ہے"۔

تفسیر نور الثقلین میں امام محمد باقرؑ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔ "یہ آیت حضرت امیر المومنین کی شان میں ہے۔ اللہ جس کسی کی بھی ہدایت کرتا ہے علیؑ ہی کے ذریعے کرتا ہے"۔ اور خطبۃ البیان میں حضرت امیر المومنین فرماتے ہیں۔ "میں ہوں اللہ کا امر اور روح"۔

عرش کے حوالے سے ہم نے سات آیات پیش کی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ جہاں بھی اللہ نے خود کو "ذوالعرش" یعنی عرش والا کہا ہے وہاں اپنے ولی کی طرف اشارہ کیا ہے اور اسی کا قصیدہ پڑھا ہے۔ لہذا "ذوالعرش" کے حقیقی معنی ہیں "علی والا"۔ ہم اس علیؑ کو مانتے ہیں جو اللہ والا ہے اور اس اللہ کو مانتے ہیں جو علی والا ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ عرش کے چند مقامات کا مفہوم آپ کے ذہن تک پہنچ گیا ہوگا۔

وسیلہ حمد

"حمد" پر ہم انشاءاللہ ایک مقام پر جداگانہ گفتگو کریں گے۔ یہاں صرف اتنا عرض کریں گے کہ کسی بھی شے کی تعریف اس کی کسی نہ کسی خصوصیت کو لے کر کی جاتی ہے اور جو تعریف کی جاتی ہے وہ حقیقتاً اس خصوصیت ہی کی ہوتی ہے جبکہ نسبت صاحب خصوصیت کی طرف مجازاً کی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ہم کسی باغ کی تعریف کرتے ہیں تو

کے پھولوں پھلوں اور اسکی تزئین و آرائش دیکھ کر۔ آپ یقیناً اس بات کی تائید کریں گے کہ اگرچہ ہم تعریف باغ کی کرتے ہیں لیکن حقیقتاً وہ تعریف ان پھولوں اور پھلوں کی ہوتی ہے جنکو ہم دیکھتے ہیں۔ فرض کریں کہ ایک باغ میں ایک نادر قسم کا پھول لگا ہوا ہے جو انتہائی خوش رنگ ہے اور اسکی خوشبو سے سارا باغ مہکتا ہے اور دور دور سے لوگ اس پھول کو دیکھنے کے لئے آتے ہیں اور باغ کی تعریف کرتے ہیں۔ اب اگر کوئی اس پھول کو توڑ کر باغ سے لے جائے تو کوئی بھی نہ باغ میں آئے گا اور نہ اسکی تعریف کرے گا۔ پس ثابت ہوا کہ خلق کو خالق سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ اگر ایسا کیا گیا تو حمد خدا معطل ہو جائے گی جو محال عقلی ہے۔ اسی طرح اگر ہم کسی شخص کے بارے میں کہیں کہ "وہ بہت حسین و جمیل ہے" تو یہ بات ہم اسکے چہرے کو دیکھ کر کہیں گے اور تعریف اگرچہ ہم اس شخص کی کر رہے ہیں لیکن دراصل اسکے چہرے کی تعریف ہو رہی ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ جو وسیلہ تعریف ہوتا ہے اسی کی تعریف کی جاتی ہے جو منسوب ہوتی ہے اسکی طرف جسکا یہ وسیلہ ہے۔ پس جو وسیلہ حمد ہوگا حقیقتاً محمود بھی وہی ہوگا اور اسی سے مقام محمود کو سمجھنا چاہئے۔

ہم نے بڑی روانی میں یہ بات لکھ دی ہے لیکن اس خیال سے کہ آپ اس سے کسی الجھن میں نہ پڑیں ہم اسکی تھوڑی سی وضاحت کر دیتے ہیں۔

۱۔ بحار الانوار (جلد ۱۰۰) نئی ایڈیشن صفحہ ۳۰۵ پر حضرت صاحب الزمان کی ایک توقیع مبارک درج ہے جس میں آپ نے رسول اللہ پر درود بھیجنے کا طریقہ سکھایا ہے۔ اس کا ایک ٹکڑا یہ ہے۔

"واعطه الفضل والفضيلة والدرجة والوسيلة الرفيعة وابعثه مقاماً محموداً يغبطه به الاولون والآخرون"۔

ترجمہ: "(اے اللہ) انکو (رسول اللہ کو) عطا فرما فضل اور فضیلت اور درجہ اور بلند وسیلہ اور انکو مقام محمود پر مبعوث فرما جس پر اولین و آخرین رشک کریں"۔

۲۔ مفاتیح الجنان صفحہ ۲۲ پر بھی یہی عبارت ہے۔

"خدایا! ان (رسول اللہ) کو فضل و فضیلت اور وسیلہ عطا فرما اور درجہ بلند عطا فرما اور انہیں اس مقام محمود پر فائز کر جسکے لئے اولین و آخرین ان پر رشک کریں"۔

۳۔ صحیفہ سجادیہ صفحہ ۲۳۔ "پروردگار! محمد کو قیامت میں عظیم وسیلہ عطا فرما"۔

امام زمانہ کے فرمان، مفاتیح کی عبارت اور سید الساجدین کی دعا سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ رسول اللہ کو فضل و فضیلت، درجہ بلند اور مقام محمود ایک وسیلے کے ذریعے سے ملتا ہے۔ اور وہ وسیلہ کون ہے یہ معراج میں ظاہر ہو گیا۔

جب ہم خاص طور پر حمد خدا کی بات کرتے ہیں تو کسی ناقص حمد کا تو ہم تصور بھی نہیں کرتے۔ یقیناً کسی حمد کو کامل بلا خلل ہونا چاہئے اور اسکے لئے ضروری ہے کہ وسیلہ حمد یعنی وہ شخصیت جسکے ذریعے اللہ کی تعریف کی جاری ہے وہ جامع کمالات ہستی ہو۔ چونکہ

اگر اس میں ذرہ برابر بھی نقص رہ گیا تو وسیلہ ناقص ہو جائے گا۔ وسیلہ ناقص ہو تو حمد ناقص ہو جائے گی۔ اور اگر حمد ناقص ہوئی تو (معاذ اللہ) وہ ناقص ٹھہرے گا جس کی حمد کی جا رہی ہے۔ لہٰذا دیکھنا پڑے گا کہ اللہ کی اکمل ترین آیت کون ہے جو وسیلہ حمد ہے۔ سورۂ نجم میں اس کا تعارف "آیت اللہ الکبریٰ" کے طور پر کرایا گیا ہے اور اصول کافی میں حضرت امیر المومنین خود ارشاد فرماتے ہیں۔ "اللہ کے نزدیک مجھ سے بڑی کوئی آیت ہے ہی نہیں اور نہ مجھ سے بڑی کوئی خبر ہے"۔

اسم کون ہے؟

پہلے ہم اس اسم اعظم کی خصوصیات معلوم کریں گے اور پھر تلاش کریں گے کہ وہ اسم کون ہے۔

۱۔ صحیفہ سجادیہ صفحہ ۸۲۔ "پروردگارا! میں تیرے اس اسم مخزون کے ذریعے سے سوال کرتا ہوں کہ جس کے سبب سے آسمان و زمین قائم ہیں۔ تاریکیوں میں روشنی ہے۔ ملائکہ اسی کے ذریعے تسبیح میں مشغول ہیں۔ دلوں میں اسی کا خوف موجود ہے۔ اور زمین اسی کے سامنے سرنگوں ہیں اور تو مردوں کو اس کے ذریعے زندہ کرتا ہے"۔

۲۔ مفتاح الجنان صفحہ ۲۱۸۔ "پروردگارا! میں سوال کرتا ہوں تیرے اس اسم کے ذریعے سے جسے تو نے آسمانوں پر رکھا تو وہ مستقل ہو گئے اور زمین پر رکھا تو وہ قائم ہوگئی اور

پہاڑوں پر رکھا تو وہ اپنی جگہ جم گئے اور رات پر رکھا تو وہ کالی ہوگئی اور دن پر رکھا تو وہ چمک گئے"۔

۳۔ کوکب دری صفحہ ۴۹۔ رسول اللہ نے فرمایا۔

"اے اللہ! میں تجھ سے تیرے اس اسم کے واسطے سے سوال کرتا ہوں کہ جب اس کا ذکر کیا جاتا ہے تو اس کی عظمت و ہیبت سے آسمان کانپ اٹھتے ہیں۔ زمین شق ہو جاتی ہے۔ بادل ٹکڑے ہو جاتے اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جاتے۔ ہوائیں چل نکلیں۔ سمندر خشک ہو جائیں۔ موجیں مضطرب ہوں۔ دل کانپ اٹھیں۔ قدم ڈگمگا جائیں۔ کان بہرے ہو جائیں۔ آنکھیں پتھرا جائیں۔ آوازیں پست ہو جائیں۔ گردنیں جھک جائیں۔ روحیں جسموں سے اکھڑی ہوں۔ فرشتے سجدے میں گر پڑیں اور تسبیح کرنے لگیں۔ انگ جوڑ بند کانپ اٹھیں۔ عرش عظیم متزلزل ہو جائے اور تمام خلائق پر اطاعت جھکا دے۔ اور تیرے اس اسم سے سوال کرتا ہوں کہ جب اسے جنت پر رکھا گیا تو وہ سج گئی۔ دوزخ پر رکھا تو وہ بھڑک گئی۔ آسمانوں پر رکھا تو وہ مستقیم ہوگئے۔ ستاروں پر رکھا تو وہ مزین ہوگئے۔ آفتاب پر رکھا تو وہ چمک اٹھا۔ چاند نورانی ہو گیا۔ زمین نے قرار پکڑا۔ اور تیرے اس اسم سے جس سے تو نے اپنے نفس کو موسوم کیا ہے اور جس سے عرش قدرت پر مستوی ہوا ہے اور اپنے علم پر مطمئن ہوا ہے اور جس سے

فرشتوں، زمین، آسمان، جنت و نار سب کچھ پیدا کیا ہے"۔

پہلے ہم عدد کے اسم اعظم کی مندرجہ بالا خصوصیات کی روشنی میں سے تلاش کرتے ہیں۔ لیکن چونکہ ہمارے رسولؐ کا ایک جملہ یہ بھی ہے کہ "فرشتے سجدے میں رہتے ہیں اور تسبیح کرتے ہیں" تو اس حوالے سے بھی ہم مختصر سی گفتگو کریں گے۔

[illegible] جلد ۱ صفحہ ۹۲ پر حضرت امیر المومنین فرماتے ہیں۔

"میں وہ ہوں جس کا نام عرش پر لکھا ہوا ہے اس نے مستقر پایا اور آسمانوں پر لکھا ہوا ہے جس سے وہ قائم ہو گیا اور زمین پر لکھا گیا تو اس نے قرار پکڑا اور پہاڑوں پر لکھا گیا تو وہ بلند ہوئے اور ہوا پر لکھا گیا تو وہ اڑنے لگی اور برق پر لکھا گیا تو وہ چمکی اور بارش کے قطروں پر لکھا گیا تو وہ جاری ہوئے۔ نور پر لکھا گیا تو وہ روشن ہوا۔ بادلوں پر لکھا گیا تو وہ برسنے لگے اور رعد پر لکھا گیا تو اس سے خشوع کی صدا بلند ہوئی۔ رات پر لکھا گیا تو وہ تاریک ہوئی اور دن پر لکھا گیا تو وہ چمک اٹھا اور تبسم کیا"۔

بے شک و شبہ ہمیں معلوم ہو گیا کہ وہ اسم اعظم ذات امیر المومنین ہے

اور ہم اسی اسم اعظم کے وسیلے سے دعا کرتے ہیں کہ پروردگار عالم ہمیں زندگی میں بھی ان کی محبت میں سرشار رکھے۔ موت بھی ان کی محبت پر دے اور آخرت میں بھی ان کے محبوں کے ساتھ محشور فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

اب ہم حضرت ختمی مرتبتؐ کے مذکورہ جملے کی طرف توجہ دیتے ہیں اور چند شواہد آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

۱۔مدینۃ المعاجز (اردو) جلد ۱، امام جعفر صادق نے فرمایا کہ (معراج کے موقع پر) اللہ نے اپنے نبی کو سات آسمانوں کی سیر کرائی۔ پہلے آسمان پر اللہ نے نور کا ایک محمل اتارا جس میں چالیس قسم کے انوار تھے جو اللہ کے عرش کو گھیرے ہوئے تھے۔ سو دیکھ کر فرشتے سجدے میں گر گئے اور انہوں نے "سبوح قدوس" کی تسبیح پڑھی اور کہنے لگے "یہ نور ہمارے رب کے نور سے کتنا مشابہ ہے!" دوسرے آسمان اور باقی آسمانوں پر بھی یہی ہوا کہ اس نور کو دیکھ کر فرشتے سجدے میں گر گئے اور "سبوح قدوس" کی تسبیح پڑھی اور کہنے لگے کہ یہ نور ہمارے رب کے نور سے کتنا مشابہ ہے!۔ (یہ روایت فروع کافی اور من لا یحضرہ الفقیہ میں بھی منقول ہے)۔

یہاں فرشتوں کے اس جملے پر غور کرنا انتہائی ضروری ہے جس میں انہوں نے کہا "یہ نور ہمارے رب کے نور سے کتنا مشابہ ہے"۔ کیونکہ فرشتے اچھی طرح جانتے ہیں کہ اللہ کے ساتھ تشبیہ جائز نہیں۔ جس "رب" سے کوئی مشابہ ہو، اس پر دھیان دینا ضروری ہے۔

۲۔مدینۃ المعاجز (اردو) جلد ۱ صفحہ ۲۷ ابلیس کا بیان۔

"ایک مرتبہ جب ہم اللہ کی تسبیح و تقدیس میں مصروف تھے کہ ہمارے پاس سے ایک نور کا گزر ہوا۔ اس نور کو دیکھ کر فرشتے سجدے میں گر پڑے اور انہوں نے "سبوح قدوس" کی تسبیح پڑھی۔ میں نے حیرت سے پوچھا "خدایا یہ نور کسی ملک مقرب کا ہے یا

مرسل کا تھا؟" "اس وقت اللہ کی طرف سے ندا آئی۔ "یہ نور نہ تو کسی ملک مقرب کا تھا اور نہ ہی کسی نبی مرسل کا تھا۔ یہ نور علی ابن ابی طالب کی طینت کا تھا"۔

یہ واضح رہے کہ طینت اس مٹی کا نام ہے جس سے آنجناب کے جسد بشری کی تشکیل ہوئی۔ جب اس طینت کے نور کا یہ عالم ہے تو اگر علی اپنی حقیقت نورانیہ کے ساتھ آجائے تو فرشتے کیا کریں گے؟ اور جب اللہ کے معصوم فرشتوں کا یہ عالم ہے تو ہم جیسے کمزور لوگ کیا کریں گے؟ سورہ قیامت میں صاف لکھا ہے کہ تمام مومنین سجدے میں گر پڑیں گے۔

اب بھی آپ کے دل کو اطمینان ہوا یا نہیں؟ یا آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں نام لے کر بتاؤں؟۔

مفتاح الجنان صفحہ ۱۸۹۔ "اے اللہ! میں سوال کرتا ہوں تیرے اسم "یا علی" کے واسطے سے"۔

اسم اللہ

قرآن مجید کے بارے میں اللہ نے ارشاد فرمایا ہے کہ "بہت سے لوگ اس سے ہدایت پاتے ہیں اور بہت سے لوگ اسی قرآن سے گمراہ ہو جاتے ہیں"۔

علی بھی قرآن ناطق ہے لہذا قرآن ناطق کی بھی خاصیت یہی ہے کہ بہت سے لوگ اس سے ہدایت پاتے ہیں اور بہت سے لوگ انکی محبت سے گمراہ ہو جاتے ہیں۔

گمراہ ہونے والے بھی دو قسم کے ہوتے ہیں۔ پہلے تو انکار کرنے سے گمراہ ہو کر کافر ہو جاتے ہیں اور دوسرے وہ جو علی کی محبت میں پھسل کر اسکو خدا سمجھنے لگتے ہیں۔ ایسے محبوں کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو وہ ہے جو محبت میں بے خود ہو کر ایسا کرتے ہیں اور اسکا سبب لاعلمی جہالت ہوتی ہے۔ دوسرے وہ جو بطور فیشن اور اپنی انفرادیت کے اظہار کے طور پر ایسا کرتے ہیں اور "بدنام اگر ہونگے تو کیا نام نہ ہوگا" کا اصول ان کے پیش نظر ہوتا ہے۔ میں بہت سے لوگوں کو دیکھتا ہوں جو ہاتھوں میں کڑے پہنے انگلیوں میں بڑے بڑے نگ ہیں۔ چوراہوں پر اور فٹ پاتھوں پر "تعالی اللہ اعلی اللہ" کی آوازیں لگاتے ہیں جو "کلمۃ حق یرید بہا الباطل" کا مصداق ہوتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ایسے لوگوں کی جو محض شعوری سوچ کی غیر ذمہ دارانہ حرکات سے مومنین مخلصین بھی خواہ مخواہ طعن وغیرہ کی زد میں آتے ہیں۔ یہ ایک نہایت نازک مسئلہ ہے جس میں انتہائی احتیاط کی ضرورت ہے اور بغیر علم زبان سے نکلا ہوا ایک لفظ بھی انسان کو کہیں سے کہیں پہنچا

دیتا ہے۔ اسم و معنی پر قلم اٹھانے سے ہمارا مقصد یہی ہے کہ قارئین اس نازک فرق کو پہچانیں اور اللہ اور علی کے اختلافی اتحاد کو معنوی اتحاد میں تبدیل نہ کریں۔ حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ اسم و معنی کو ایک ہی نام سے پکارا جاتا ہے پھر بھی چونکہ لوگوں میں علم و معرفت سے بے رغبتی عام ہے اس لئے اس معاملے میں احتیاط کی جائے تو بہتر ہے۔ حالانکہ عارفین کاملین اور خود ائمہ معصومین نے یہ لفظ اسم و معنی دونوں کے لئے استعمال فرمایا ہے جیسا کہ ثابت کیا جائے گا لیکن یہ بات ان ہی کی زبان پر جچتی تھی۔ ہم جیسے انسان کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس معاملے میں اپنی زبان کھولے۔

جو حقیقت حال تھی وہ ہم نے پوری سچائی کے ساتھ بیان کر دی لیکن لوگوں کا بھی یہ فرض بنتا ہے کہ بیتابانہ دونوں کو ایک سمجھ لینے اور ان پر فتوے لگانے کے بجائے اس مجمل کے اصل اسباب پر غور کریں۔ اور خلوص کے ساتھ غور کریں۔ ٹھنڈے دل سے غور کریں۔ اور سمجھنے کے لئے غور کریں۔ اور مسئلے کی تہہ تک پہنچنے کے لئے غور کریں اور معلوم کریں کہ یہ اشتباہ پیدا کیوں ہوتا ہے؟

حضرت ختمی مرتبت کے جن معجزات کو محدثین و مورخین نے نقل کیا ہے ان کی تعداد کم و بیش دس ہزار تک پہنچتی ہے۔ اس کے مقابلے میں حضرت امیر المومنین کے بہت کم معجزات نقل کئے گئے ہیں۔ لیکن آج تک کوئی ایک بھی ایسا انسان نہیں گزرا جس نے حضرت ختمی مرتبت کو اللہ کہا ہو۔ اس کے برخلاف ہر دور میں ایک طبقہ ایسا ضرور موجود رہا ہے اور آج بھی موجود ہے جو علی کو اللہ کہتا اور مانتا ہے۔ ایسا کیوں ہے۔ سبب تو ہوں گے

سکتا۔ عقل حکم لگاتی ہے کہ ایسی کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور ہے جس کی وجہ سے لوگوں کو اس پر اللہ ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ یہ مقام غور کرنے کا ہے بلکہ انتہائی سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کا ہے کیونکہ اسی ایک بات پر انسان کے مکمل عقیدے کا دارومدار ہے اور ذرا سی لغزش بھی انسان کو ایک خدا سے انکار کرنے والوں میں پہنچا سکتی ہے۔ اس کتاب کا مرکز "اسم ذاتی" کا تصور ہے اور یہ کتاب لکھی ہی اس لئے گئی ہے تاکہ ان لوگوں کو باز رکھا جا سکے جو اسم کو معنی سمجھ لیتے ہیں۔ اور ان لوگوں کو بھی سمجھایا جا سکے جو معنی کو اسم سمجھتے ہیں اور اسم ذاتی کا انکار کرتے ہیں اور جن کا کام فقط مظاہر کی پرستش کرنا، شخصوں کی معرفت کرنا اور فقط انہی سے لگاؤ ہوتا ہے۔

لفظ "اللہ" کا مفہوم

لفظ "اللہ" تو پانچ حروف سے مرکب ایک لفظ ہے اور ہر شخص اس بات سے واقف ہے کہ لفظ مخلوق ہیں لہٰذا یہ اللہ بھی مخلوق ہے۔ کیا کوئی ایک بھی ایسا بندہ ہوگا جو کاغذ پر لکھے ہوئے لفظ "اللہ" کی پرستش کرتا ہو لیکن اس کے باوجود وہ اس لفظ کو "اللہ" کہہ کر ہی پکارتا ہے۔ کیا یہ نہیں سمجھتے کہ جب ہم زبان سے لفظ "اللہ" ادا کرتے ہیں تو اس کے دو مفہوم ہوتے ہیں۔ ایک اللہ وہ ہے جو تعارف کرانے والا ہے۔ اسے ہم اسم کہتے ہیں اور اسم کے لئے لفظ "اللہ" استعمال کرنا جائز ہے کیونکہ اس کے ذریعہ آپ اس معبود حقیقی پر ایمان لاتے ہیں اور بندگی کی بات کرتے ہیں۔ دوسرا اللہ وہ

ہے جسکا تعارف کرایا جاتا ہے اسے معنی کہتے ہیں اور یہ دونوں "اللہ" ایک دوسرے سے مختلف ہیں جیسا کہ التوحید صفحہ ۲۲۰ حدیث ۳ میں حضرت امیر المومنین فرماتے ہیں۔ "اسکا اسم "اللہ" اللہ کا غیر ہے"۔

اس بات سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ اسم کا سہارا لئے بغیر اور اسم کو وسیلہ بنائے بغیر معنی کو پکارنا یا اسے مخاطب کرنا یا اس سے دعا مانگنا ممکن ہی نہیں ہے۔ نماز میں ہم اللہ سے بات کرتے ہیں اور اسے مخاطب کرتے ہیں۔ "ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تیری ہی مدد چاہتے ہیں"۔ یہ وہ جملہ ہے جسکے بغیر نماز ہوتی ہی نہیں۔ اس میں لفظ "تیری" کسی کی طرف اشارہ کررہا ہے اور ہر مسلمان کا یہ ایمان ہے کہ اللہ قابل اشارہ نہیں ہے۔ جو قابل اشارہ ہوگا وہ جسم ہوگا۔ جسم ہوگا تو محدود ہوگا۔ محدود ہوگا تو حادث ہوگا۔ اور حادث ہوگا تو اللہ نہ رہے گا۔ پھر آپ نماز میں یہ جملہ ادا کرتے وقت کس سے مخاطب ہوتے ہیں؟۔ ہم نے گذشتہ صفحات میں سورہ شوریٰ کی آیت ۵ نقل کی تھی جس میں اللہ نے حتمی طور پر فیصلہ فرمایا کہ کوئی بھی بشر خواہ وہ نبی ہو یا ایک عام انسان۔ اللہ سے بغیر حجاب کا سہارا لئے ہوئے کلام نہیں کرسکتا۔ پس جب آپ اپنی زبان سے لفظ "ایاک" ادا کرتے ہیں تو لازم ہے کہ آپ کا مخاطب وہ حجاب ہو جسکے بغیر اللہ سے کلام نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح "اھدنا" جسکا ترجمہ یہ ہے کہ "تو ہماری ہدایت فرما" یا "تو ہمیں ثابت قدم رکھ" تو یہاں بھی لفظ "تو" کسی کی طرف اشارہ کررہا ہے اور یہ اشارہ جارہا ہے حجاب کی طرف۔ اسی طرح جب آپ کوئی

بھی۔ دعا مانگتے وقت کہتے ہیں "اے اللہ" تو یہ لفظ "اے" بھی حرف ندا ہے جو کسی
ہوتا ہے جو غائب ہو۔ آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ یہ کتنا نازک معاملہ ہے اسے نازک سمجھ
کر اس سے پہلو تہی کرنا اور یہ کہنا کہ "ارے چھوڑو۔ کون ان باریکیوں میں پڑے"
درحقیقت اپنے ایمان اور اپنی آخرت کو داؤ پر لگانے کے مترادف ہے۔ کیونکہ عبادت
کرنے سے پہلے یہ تعین کرنا ضروری ہے کہ آپ کس کی عبادت کرتے ہیں۔ اگر
یہ تعین غلط ہو گئی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ کی عبادت نہ ہوئی بلکہ کسی اور کی
عبادت ہو گئی۔ اور اسی کو اللہ نے "عبادت شیطان" سے تعبیر کیا ہے۔ عبادت خدا اور
عبادت شیطان میں بڑا نازک سا فرق ہے۔ اور کوئی اس نزاکت سے چشم پوشی کرے
گا تو خود اسے بھی علم نہیں ہوگا کہ وہ کس کی عبادت کر رہا ہے۔ اگرچہ اپنے زعم میں وہ اللہ
ہی کی عبادت کیوں نہ کر رہا ہو۔ لہٰذا اس بات کو دل پہ نقش کر لیں کہ جب بھی آپ
عبادت کرتے ہیں یا دعا مانگتے ہیں تو اگرچہ آپ کا مقصود "حق" ہوتا ہے لیکن
آپ کا خطاب "اسم" سے ہوتا ہے یعنی اسم اللہ کا کان (اذن اللہ) ہے اور اسی کی
نسبت سے اللہ نے خود کو "سمیع" کہا ہے۔ اب یہ کام اسم کا ہوتا ہے کہ وہ ان کلمات کو
اللہ تک پہنچائے۔ اور یہ بات بھی قابل فہم و تفہیم کے لئے ہے ورنہ یہی اسم مشیت اللہ
بھی ہے اور یداللہ بھی۔ رد و قبول اسی کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور مخلوق کو جو کچھ بھی
ملتا ہے اسی سے ملتا ہے۔

یہ بات بہر حال طے ہو گئی کہ ہمیں جس شے سے واسطہ پڑتا ہے اور جس تک ہماری رسائی ہے اور جس کا ہم تصور رکھتے ہیں اور جس سے ہم بات کرتے ہیں وہ اللہ ہے مگر وہ اللہ جو ہم نے تذکرہ کیا۔ جیسا کہ سورہ بنی اسرائیل کی آیت ۱۱۰ میں ارشاد ہوتا ہے۔ "(اے رسولؐ) کہہ دو کہ اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر پکارو جس نام سے بھی پکارو اس کے سب اچھے نام اسی کے ہیں"۔ اس آیت سے ثابت ہو گیا کہ جب کوئی "یا اللہ" کہتا ہے تو اس کا مخاطب اللہ کا اسم حقیقی ہوتا ہے اور لفظ اللہ اسکے مسمّٰی کی طرف ایک اسم ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ تمام اسماء کا جامع ہو۔ جیسا کہ توحید صفحہ ۲۲۰ حدیث ۱۰ میں حضرت امیر المومنین فرماتے ہیں۔ "تمہارا اللہ کہنا اسماء الٰہی میں عظیم ترین نام ہے"۔

یہاں یہ بے جا نہ ہوگا اگر ہم مفاتیح الجنان صفحہ ۷۹۷ سے زیارت امیر المومنین کا ایک جملہ آپ کی خدمت میں ہدیہ کریں۔ "سلام ہو اللہ کے پسندیدہ نام پر۔ اسکے چہرے پر جو خالق ہے اور اس کا صراط مستقیم ہے۔ سلام ہو اس پر جسکے پاس ام الکتاب ہے۔ سلام ہو اس پر جسے جبرئیل نے کسی شب سے بھی امیر المومنین کہہ کر مخاطب کیا"۔

اللہ کی معرفت

اس تمام گفتگو سے واضح ہو جاتا ہے کہ اللہ کو جاننا، پہچاننا اور مانا جاسکتا ہے لفظ اور لفظ کے اسم کے ذریعے سے۔ کیونکہ اور کوئی ذریعہ نہیں ہے جس سے ہم کسی معرفت

حاصل کرتے ہیں اور درحقیقت اسکے اسم کی معرفت حاصل کرلینا ہی اسکی معرفت کہلاتا ہے۔ اس موقعہ پر ہم ایک انتہائی اہم حدیث پیش کررہے ہیں جو توحید کی کلید ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں شیاطین کام آتے ہیں اور لوگوں کو گمراہ کرنے کے لئے اپنے لشکروں کو حرکت میں لاتے ہیں۔

توحید صفحہ ۲ حدیث ۷۔ امام جعفر صادق نے فرمایا "دراصل اللہ کو اسی نے پہچانا جس نے اسکو اللہ کے ذریعے پہچانا۔ جس نے اللہ کو اسکے ذریعے نہیں پہچانا تو وہ اسکو نہیں پہچانتا ہے بلکہ وہ اسکے غیر کو جانتا ہے۔ وہ اپنے اسماء سے پکارا جاتا ہے حالانکہ وہ اپنے اسماء کا غیر ہے اور اسماء اسکا غیر ہیں"۔

یہ حدیث اس قدر واضح ہے کہ اسکی تشریح کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی لیکن ایک مقصر اور بدنام مولوی نے اس سے یہ مطلب نکالا ہے کہ اللہ کو اسی اسم کے ذریعے نہیں بلکہ خود اسی کے ذریعے پہچانا جانا چاہئے یعنی اللہ کی معرفت براہ راست اسی سے حاصل کرنا چاہئے۔ اس مولوی کا اصل مقصد یہ ہے کہ وسیلہ کو درمیان سے ہٹا دیا جائے اور اس بات کو اس نے قطعی طور پر نظر انداز کردیا کہ اگر وسیلہ درمیان سے ہٹ گیا تو اللہ کا کوئی وجود ہی ثابت نہیں ہوگا کیونکہ نہ تو اسکا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے اور نہ وہ وہم وگمان میں آسکتا ہے۔ یہ بات عقل کے بھی خلاف ہے اور نقل کے بھی اور سراسر تکذیب قرآن ہے جہاں اللہ نے وسیلہ تلاش کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس بات کا ذکر ہم

نے اس سے پردہ کر دیا تاکہ مومنین شیطان کے جال سے محفوظ رہ سکیں۔ ورنہ جو گفتگو ہم کر چکے ہیں اس کی روشنی میں اس حدیث کا مفہوم بالکل واضح ہے۔ یعنی اس اللہ کو جو معنی ہے صرف اس اللہ کے ذریعے پہچانا جا سکتا ہے جو اسم ہے اور اس اللہ کو جو اسم سے ظاہر نہ کیا جائے تو اس سے جس کی معرفت حاصل ہوگی وہ اللہ نہیں بلکہ کوئی اور چیز ہوگی۔

ممسوس فی ذات اللہ

ہم نے کشف العقائد میں جن امور کا ذکر کیا تھا ان میں سے بعض کے بارے میں ملک بھر سے مومنین کے لاتعداد سوالات ہم تک پہنچے۔ اس وقت ہمارے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ ہم ان امور کی تفصیل میں جاتے۔ کچھ تو خوف فساد خلق کی وجہ سے اور کچھ اس لئے کہ کوئی بات مومنین کے لئے پریشانی کا باعث نہ بنے۔ لیکن جن مراحل کو ہم اس کتاب میں طے کر چکے ہیں ان کے بعد ہمارے لئے یہ قدرے آسان ہو گیا ہے کہ ہم جامع طور پر ان سوالات کا جائزہ لیں جو ہمارے احباب کے ذہنوں میں منتشر رہے ہیں۔ یہاں ہم صرف ان سوالات پر گفتگو کریں گے جو کلیدی حیثیت رکھتے ہیں اور جن کی وجہ سے باقی سوالات بھی انشاء اللہ حل ہو جائیں گے۔ اس مقام پر ہم ایک سوال کے بارے میں عرض کرتے ہیں۔ دوسرے سوال کے جواب میں ایک الگ مقام پر گفتگو کی جائے گی۔

ہم نے ایک حدیث رسولؐ نقل کی تھی جس میں حضرتؐ نے فرمایا
ہے۔ "علیؑ کو برا مت کہو کیوں کہ وہ ذات خدا میں مس کیا ہوا ہے"۔ اس بات پر
خاص طور پر زور دیا تھا کہ "سے" اور "میں" میں فرق روا رکھا جائے کیونکہ حضرتؐ
نے یہ نہیں فرمایا کہ علیؑ ذات خدا "سے" مس کیا ہوا ہے بلکہ فرمایا کہ علیؑ ذات خدا
"میں" مس کیا ہوا ہے۔ اس بارے میں بہت سے مومنین ہم سے سوال کرتے رہے
ہیں کہ ذات خدا میں مس ہونے سے کیا مراد ہے؟

اللہ کے جتنے بھی اسماء کا قرآن میں ذکر آیا ہے وہ سب اسماء صفات ہیں مثلاً خالق
صفت خلق کی نسبت سے، رازق صفت رزاقیت کی نسبت سے اور رحمن صفت رحم کی
نسبت سے۔ لیکن جہاں تک اسم "اللہ" کے بارے میں مفسرین کا موقف یہ ہے کہ اللہ
اسم صفت نہیں بلکہ اسم ذات ہے اسی لئے اس کے تمام اسماء صفات کو اس کے اسم ذات
سے منسوب کیا جاتا ہے۔ مثلاً اللہ خالق ہے۔ اللہ رازق ہے۔ اللہ رحمن ہے
وغیرہ۔ جب یہ مان لیا ہے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اسم ذات۔ ذات ہی کا تعارف
کرائے گا۔ اب ترتیب یوں بنی کہ اسماء صفات اسم ذات کا تعارف کرائیں گے اور
اسم ذات ذات کا تعارف کرائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ تعارف ہمیشہ ذات ہی کا کرایا
جاتا ہے اور اس کے لئے وسیلہ اسم ذات ہوتا ہے جیسا کہ آپ نے ابھی پڑھا ہے کہ اللہ
کی معرفت اللہ سے ہی حاصل کی جا سکتی ہے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب اسم

ذات خود ذات کی معرفت رکھتا ہو اور وہ خود ہی ذات سے واقف نہیں تو وہ دوسروں
سے اپنا تعارف کیونکر کرا سکتا ہے؟۔

یہاں ایک بات پر غور وفکر کرنا لازمی ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے لئے تو ذات کی معرفت
کے لئے ہم ذات موجود ہے لیکن اُم ذات کے لئے ذات کی معرفت کا وسیلہ کون
ہوگا؟۔ یہ طے ہے کہ اُم ذات اور ذات کے درمیان کوئی تیسرا نہیں جو وسیلہ
بن سکے اس لئے لازم ہے کہ ان دونوں کا باہمی رشتہ بلاواسطہ ہو اور وہ ذات کو ذات
سے پہچانے۔ میرا دعویٰ ہے کہ پوری کائنات میں ایک شخص بھی ایسا نہیں جس نے
ذات کو ذات سے پہچاننے کا دعویٰ کیا ہو۔ یہ شرف صرف میرے مولا امیر المومنین کو
حاصل ہے جنہوں نے دعویٰ کیا کہ "یا من دل علی ذاتہ بذاتہ" "اے وہ
جس نے اپنی ذات پر اپنی ذات کو دلیل بنایا"۔ (مفاتیح الجنان صفحہ ۱۳۳)۔

یہ جملہ سوائے اس مقدس ہستی کے کسی اور کی زبان سے ادا ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ وہ
وسیلہ آخر ہے اور اس کے اور اللہ کے درمیان کوئی حجاب موجود نہیں ہے۔

یہ بات ہم نے صاحبان علم ومعرفت کے لئے عرض کی تھی اور اب ہم دو
مثالوں کے ذریعے محسوس کی "ذات اللہ" کا مفہوم بیان کرتے ہیں۔

آگ معنی ہوتی ہے حرارت کا نام۔ آگ کا تعارف یعنی حرارت سے
ہوتا ہے۔ اگر حرارت نہ ہو تو آگ کا وجود پایا نہیں جاسکتا۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ
حرارت آتی کہاں سے ہے؟ آگ کی بالائی سطح سے یا آگ کے اندر

ہے؟۔ طرح حرارت ''ممسوس فی نار'' ہوئی یا نہیں؟۔

سورج معنی ہوتا ہے اور زمین اس کا اسم۔ سورج کا تعارف انکی کرنوں سے ہوتا ہے۔ اگر زمین نہ ہوں تو سورج کا ادراک پایا نہیں جاسکتا۔ یہ زمین کہاں سے آتی ہیں؟۔ سورج کی باہر نکلتی ہے یا سورج کے اندر سے؟۔ اور یہ زمین رہتی کہاں ہیں؟۔ سورج کے باہر یا سورج کے اندر؟۔ تو اس طرح یہ زمین ''ممسوس فی شمس'' ہوسکتی ہیں یا نہیں؟۔

بالکل اسی طرح جو مظہر ذات ہوگا اسکا ''ممسوس فی ذات'' ہونا لازمی ہے۔

یہ سب چیزیں اسلئے عرض کیا جارہا ہے تاکہ یہ واضح ہوجائے کہ دین معصوم میں صرف لفظوں سے کھیلنے یا لفظوں کی رفت کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد اصل حقیقت تک پہنچنا ہے ابتدائی لفظ سے الجھا جانا اور چپکا جانا مومن کی شان نہیں ہوسکتی۔ بہت سی باتیں آپکی نظر سے گزرچکیں اور بہت سی باتیں ابھی آئیں گی جنکے لفظ چونکا دینے والے ہونگے تو ان سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ مثلاً مفاتیح الجنان صفحہ ۸۵۲ پر زیارت امام حسینؑ کا ایک جملہ یہ ہے۔

''السلام علیک یا قلب اللہ''۔ (سلام ہو آپ پر اے اللہ کے قلب)۔ اب ہم اگر صرف لفظ ''قلب'' کیطرف اشارہ کی جھول میں پھنس جائے اور یہ سوچنے لگے کہ بھلا اللہ تعالیٰ کی

واضح ہو جاتی ہے تو ایک شخص سے ہم سوال کریں گے کہ یہ "اللہ کا گھر" کہاں سے
آیا؟ کیونکہ اللہ تو لامکان ہے۔ پس جب مکان کا گھر اللہ کا گھر کہا جا سکتا ہے تو
وہ ولی "اللہ" کیوں نہیں کہلائی جا سکتی؟ ایک شخص کو سوائے دردِ سر کے کچھ بھی
ہاتھ نہ آئے گا لیکن جو مومن ہوگا وہ فوراً سمجھ جائے گا کہ اس سے مراد یہ دنیوی رشتہ داری
نہیں ہے بلکہ یہ اللہ سے اللہ کی نسبت ہم کی معنی سے انتہائے قربت کا استعارہ
ہے۔ یہ وہ آل ہے جو ذات خداوندی سے اس طرح جوڑ رکھتی ہے جیسے سورج کی
شعاع سورج سے۔

ہم اس مقام پر پہنچ گئے جہاں ایک اللہ اور دوسرے اللہ میں تمیز قائم ہو چکی
اور اب صرف لفظ "اللہ" سن کر بارہا خدا کا شور مچانے کا حق کسی کو نہیں رہا اور یہی ہمارا
مقصود ہے کہ لوگ یہ جان لیں کہ قرآن مجید میں جہاں جہاں لفظ اللہ استعمال ہوا
ہے وہاں بیشتر مقامات پر اس سے مراد وہ اللہ ہے جو امام ہے اور انشاء اللہ آگے بہت
سی مثالیں پیش کی جائیں گی۔

حقیقت یہ ہے کہ لوگوں نے اس بات کو قطعی نظر انداز کر دیا کہ مذہب شیعہ جو آج
ہمارے ہاتھوں میں ہے وہ کن کن دوروں اور کون کون سے مراحل سے گزر کر ہم تک پہنچا
ہے اس سے یہ غلط فہمی عام ہے کہ یہ بعینہ وہی مذہب ہے جو ائمہ اطہار نے ہمارے
چھوڑا تھا۔ حالانکہ اگر تحقیقی نظر سے مطالعہ کیا جائے اور زمانہ ائمہ کے شیعوں سے

عقائد پر نظر ڈالی جائے تو ایک شخص بھی ہم سے اختلاف نہ کرے۔ ہم نے ایک بات عرض کی تھی کہ جب ہم علی کو پکارتے ہیں تو ہمارا مقصود اللہ ہوتا ہے اور جب ہم اللہ کو پکارتے ہیں تو ہمارا مقصود علی ہوتا ہے۔ یہاں ہم مدینۃ المعاجز جلد ا صفحہ ۲۵ سے ایک واقعہ نقل کرتے ہیں تاکہ یہ بات ذہن میں رہے کہ امام معصوم کے سامنے کوئی بات کہی جائے یا کوئی کام کیا جائے اور معصوم خاموش رہے اور منع نہ کرے تو اسے "تقریر معصوم" کہتے ہیں اور یہ حجت ہوتی ہے اور مقام استدلال پر اسکا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ روایت مدینۃ المعاجز میں بھی موجود ہے۔

"(بحذف سند) خالد ربعی روایت کرتے ہیں کہ جناب امیر المومنین اپنے کسی کام کے سلسلے میں مکہ گئے۔ آپ نے ایک اعرابی کو دیکھا جو غلاف کعبہ سے چمٹا ہوا تھا اور یوں کہہ رہا تھا: "اے گھر کے مالک! یہ گھر تیرا گھر ہے اور مہمان تیرا مہمان ہے اور ہر میزبان اپنے مہمان کو مہمانی دیتا ہے۔ آج رات مجھے مغفرت کی مہمانی عطا فرما"۔ امیر المومنین نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا: "کیا تم اعرابی کی گفتگو سن رہے ہو؟" آپ کے ساتھیوں نے کہا کہ جی ہاں ہم سن رہے ہیں۔ اس پر آپ نے فرمایا "اللہ کی شان اس سے کہیں بلند و برتر ہے کہ وہ اپنے مہمان کو خالی ہاتھ لوٹائے"۔ دوسری رات آپ حرم میں تشریف لائے تو آپ نے دیکھا کہ وہ اعرابی اس رکن کے ساتھ چمٹا کہہ رہا تھا: "اے وہ ذات جو بڑی عزت میں عزیز ہے اور

عزت کے اعتبار سے تجھ سے زیادہ صاحب عزت کوئی نہیں۔ اپنی عزت کے صدقے میں مجھے بھی اپنی عزت عطا فرما جس کی ماہیت کے متعلق کسی کو علم نہ ہو۔ میں تیرے حضور محمد آل محمد کے حق کا وسیلہ دے کر تجھ سے درخواست کرتا ہوں کہ مجھے وہ کچھ عطا فرما جو تیرے علاوہ اور کوئی کسی کو نہیں دے سکتا اور مجھ سے وہ مصائب دور فرما جو تیرے علاوہ کوئی دور نہیں کر سکتا"۔ حضرت امیر المومنین نے فرمایا۔ "خدا کی قسم یہ اعرابی میں ہم کلام ہے اس نے اللہ سے جنت طلب کی ہے اور اللہ نے اسے دے دی ہے اور اس نے اللہ سے دوزخ سے تحفظ اور نجات کی دعا کی ہے اور اللہ نے اسے دوزخ سے بچا لیا ہے"۔ تیسری رات آپ حرم میں تشریف لائے تو آپ نے دیکھا کہ وہ اعرابی اسی رکن کعبہ سے چمٹ کر یہ مناجات کر رہا تھا۔ "اے وہ ذات جسے مکان اپنے اندر رکھنے سے قاصر ہے اور اے وہ ذات جس سے کوئی بھی مکان خالی نہیں ہے اور جو بغیر کسی کیفیت کے ہر مقام پر موجود ہے۔ اعرابی کو چار ہزار درہم عطا فرما"۔ یہ سن کر حضرت امیر المومنین آگے بڑھے اور فرمایا۔ "اے اعرابی! تو نے اپنے رب سے مغفرت کی مہمانی طلب کی۔ اللہ نے تجھے عطا فرمائی۔ تو نے اللہ سے جنت مانگی۔ اللہ نے تجھے عنایت کی اور تو نے اللہ سے دوزخ سے بچنے کا سوال کیا۔ اللہ نے تجھے دوزخ سے بچایا۔ اور آج رات تو اللہ سے چار ہزار درہم مانگ رہا ہے؟"۔

اس مقام پر ہم چند لمحوں کے لئے رکتے ہیں۔ آپ پوری ایمانداری اور دیانت داری سے بتائیے کہ وہ اعرابی کس سے سوال کر رہا تھا؟ کوئی فرد واحد بھی یہ نہ ہوگا جو یہ کہے کہ وہ اللہ سے نہیں مانگ رہا تھا۔ اور وہ یقیناً اللہ ہی سے مانگ رہا تھا لیکن آئیے ہم اس اعرابی سے یہ سوال پوچھتے ہیں۔ یہ یاد رہے کہ حضرت امیر المومنین اس کے سامنے کھڑے تھے اور انہوں نے اعرابی کی بات سن کر نہ صرف یہ کہ خاموشی اختیار کی بلکہ اس کی حاجت کو بھی رد کر دیا۔

اعرابی نے کہا: "آپ کون ہیں؟" آپ نے فرمایا: "میں علی بن ابی طالب ہوں۔" اعرابی نے جیسے ہی آپ کا نام سنا تو اس نے کہا: "خدا کی قسم! آپ ہی میرے مقصود ہیں اور میری حاجت کا تعلق آپ ہی سے ہے۔"

یہی وہ عقیدہ ہے جسے معصوم کی سند حاصل ہے۔ اس پر اعتراض کرنا یا ناک بھوں چڑھانا یا فتوے صادر کرنا درحقیقت معصوم کی تکذیب کرنا ہے۔

ہم مدینۃ المعاجز جلد صفحہ ۲۶ سے اسی قسم کا ایک اور واقعہ نقل کرتے ہیں اور یہ واقعہ بھی حضرت امیر المومنین کی موجودگی میں پیش آیا۔

"سید مرتضیٰ علم الہدیٰ نے اپنی اسناد سے حضرت عمار یاسر سے نقل کیا۔ انہوں نے کہا: "ایک روز میں کوفہ میں حضرت امیر المومنین کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ باہر سے شور شرابے کی آوازیں سنائی دیں۔ اس وقت آپ دکۃ القضاء پر بیٹھے لوگوں کے فیصلے کر رہے تھے۔ آپ نے مجھ سے فرمایا: "عمار! لاؤ ذوالفقار۔" میں نے

ذوالفقار پیش کی۔ آپ نے اسکو نیام سے نکال کر اپنے پاس رکھا اور فرمایا۔ "عمار آج میں اہل کوفہ کے سامنے ایک عقدہ حل کروں گا جس سے اہل ایمان کی جماعت اور مخلصین کے نفاق میں اضافہ ہوگا۔ جاؤ جو لوگ دروازے پر کھڑے ہیں انہیں میرے پاس لاؤ"۔ عمار کہتے ہیں کہ میں باہر آیا تو میں نے دیکھا کہ ایک عورت ایک محمل میں بیٹھی چیخ چیخ کر پکار رہی تھی: "اے پناہ طلب کرنے والوں کو پناہ دینے والے! اے عاشقوں کی منزل آخر! اے زبردست قوت کے مالک! (شدید القوی)۔ اے یتامیٰ کو طعام دینے والے! اے مفلس کو رزق فراہم کرنے والے! (رزاق)۔ اے بالیدہ ہڈیوں کو زندہ کرنے والے! (محی)۔ اے وہ قدیم جس سے پہلے کوئی نہ تھا! اے بے یار و مددگار کے یار و مددگار! اے آسمانوں کا خزانہ۔ میں نے تیری ہی طرف اپنے رخ کو متوجہ کیا اور میں نے تجھے ہی وسیلہ بنایا ہے۔ آج میرے چہرے کو آبرومند بنا اور میری مصیبت کو مجھ سے دور کر"۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ وہ کن الفاظ سے اپنے مطلوب کو یاد کر رہی ہے۔ جب وہ عورت حضرت امیر المومنین کی خدمت میں حاضر ہوئی تو اس نے عرض کیا۔

"مولا! میں آپ کا قصد کرکے آئی ہوں"۔

آپ نے محسوس کیا ہوگا اور بخوبی محسوس کیا ہوگا کہ زمانہ ائمہ کے مخلص شیعوں کے اعتقاد کیا تھے۔ یہ اعتقاد ملیامیٹ کیسے ہوئے؟ کیا وہ اسباب تھے۔ کیا تو مخلصین

اور صاحبانِ اقتدار کا خوف۔ اور یہ حقیقی سبب ہے اور جو وزن رکھتا ہے لیکن پھر صرف یہی نہیں کی جا سکتی لیکن اور سبب منافقین کی کارستانیاں تھیں جنھوں نے شیعوں کی صفوں میں گھس کر اپنا علم چمکایا اور مذہب شیعہ کو تہس نہس کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ لکھنؤ میں ایک عیسائی مشنری کے سربراہ سے ایک مرتبہ ایک اخباری نمائندے نے پوچھا کہ "آپ اتنے عرصے سے کام کر رہے ہیں۔ اب تک آپ نے کتنے مسلمانوں کو عیسائی بنایا؟" اس نے جواب دیا کہ "آپ کا سوال ہی غلط ہے۔ آپ مجھ سے یہ پوچھیے کہ ہم نے کتنوں کو مسلمان چھوڑا؟"۔ منافقین کا مقصد بھی یہ ہرگز نہیں تھا کہ شیعہ دنیا سے ختم ہو جائیں اور نہ وہ ایسا کر سکتے تھے بلکہ ان کی کوشش ہی یہ تھی کہ ملک شیعہ کہلاتے رہیں مگر شیعہ نہ رہیں۔ یعنی بوتلیں ہیں زہر بھری ہوئیں ان پر لیبل "تریاق" کا لگا ہوا ہو۔ اسی لئے ہم بھی انتہائی محتاط طریقے سے اعتقاد شیعہ کو بیان کرتے ہیں کیونکہ اس دور میں منافقین ہمارے ساتھ ہیں۔ میرے مولا امام محمد تقیؑ نے فرمایا تھا "خدا کی قسم! اس بات کا خطرہ نہ ہوتا کہ اہل باطل اور مسلح کفر ہم پر حملہ آور ہو جائے گی اور اہل شک و شبہ و نفاق ہم پر ٹوٹ پڑیں گے تو میں ایسی ایسی باتیں بتاتا کہ جنھیں سن کر اولین و آخرین حیرت میں پڑ جاتے"۔ اس کے بعد خود آپ نے اپنا ہاتھ اپنے منہ پر رکھ دیا اور فرمایا "اے محمد تم بھی خاموش رہو جس طرح تمہارے آبا و امام خاموش رہے"۔ ہمارا مقصد بھی لوگوں کو شیعہ بنانا نہیں ہے بلکہ جتنے شیعہ باقی رہ گئے ہیں ان کو بچانا ہے کیونکہ انہیں خطرہ غیروں سے نہیں بلکہ ان

سے بے شعوروں نے اسے مذہب کا بازار بنا رکھا ہے۔

جیسا کہ ہم عرض کر چکے کہ قرآن مجید میں جہاں جہاں لفظ "اللہ" مستعمل ہوا ہے وہاں بیشتر مقامات پر اس سے مراد اللہ ہے جو اسم ذات ہے۔ ہمارے لئے ممکن نہیں کہ پورا قرآن یہاں نقل کر کے رکھ دیں اور نہ ہی ہمارا یہ مقصد ہے جس کو ماننا ہوگا وہ ایک آیت سے بھی مان لے گا اور جس کا مقصد ماننا ہے ہی نہیں اسکو اگر پورا قرآن بھی پڑھ کر سنا دو تو وہ جہاں ہے وہیں رہے گا ایسے لوگوں سے ہمیں کوئی سروکار نہیں۔

خبیر

۱۔ البقرہ ۲۳۴ "اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے خوب خبردار (خبیر) ہے"۔

۲۔ البقرہ ۲۷۱ "اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے خوب واقف (خبیر) ہے"۔

۳۔ آل عمران ۱۸۰ "اور اللہ ہی کے لئے آسمانوں اور زمین کی میراث ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے پورا پورا خبردار (خبیر) ہے"۔

اس مطلب پر قرآن مجید میں بہت سی آیات موجود ہیں ان میں سے ہم نے صرف تین یہاں نقل کی ہیں۔ ان تینوں آیات میں کہا گیا ہے کہ "خبیر" اللہ ہے اور ایک موقع پر یہ تاکید بھی موجود ہے کہ خبیر صرف اللہ ہے اور اس کے سوا کوئی دوسرا خبردار نہ ہو۔

۴۔ فاطر ۱۴ "اور تمہیں خبیر کی طرح کوئی دوسرا خبر دینے والا نہ ہو"۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ یہ "اللہ" جو خبیر ہے اور جسکی طرح کوئی اور خبر دے ہی نہیں سکتا کون ہے؟ کیا وہ اللہ ہے جو مخفی ہے؟ یا وہ اللہ ہے جو عام ہے؟۔

ہمارا دعویٰ ہے۔ ولیکن قرآن میں یہ بھی حق لکھی نہیں ہے کہ اسکے خبیر ہونے کا دعویٰ کیا ہو سوائے مولا امیر المومنین کے۔ اور کسی کا نام لینے سے پیشتر ہماری وہ بات ذہن میں رکھیے کہ جس طرح دعویٰ بغیر دلیل کے بیکار ہوتا ہے اسی طرح دلیل بھی بغیر دعوے کے بے معنی ہوتی ہے لہذا ہماری بات کو رد کرنے سے پہلے آپ کو دعویٰ تلاش کرنا پڑے گا۔

خصائص ومناقب (ترجمہ غرر الحکم ودرر الکلم) جلد ۲ صفحہ ۵ قول ۲۰۵۔

حضرت امیر المومنین فرماتے ہیں۔ "تجھ جیسے سمجھنے والے اور کوشش کرکے عقل والے اور مجھے اس خبیر (یعنی خود حضرت امیر المومنین) جیسا کوئی خبر نہ دے گا"۔

پس معلوم ہو گیا کہ یہ خبیر کون ہے اور مولا کے اس فرمان کی توثیق خود قرآن نے کر دی جہاں اللہ نے اپنے رسول کو حکم دیا کہ وہ خبیر سے سوال کریں۔

فرقان ۵۹۔ "جس نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے چھ وقتوں میں پیدا کیا۔ پھر وہ عرش پر مستولی ہوا وہ رحمٰن ہے پس (اے رسولؐ) تو اسکے متعلق کسی خبیر سے پوچھ"۔

پس ثابت ہو گیا کہ "اللہ جو چاہے" سے مراد وہ قدرت ہے جو عام ہے۔ یہ معانی قرآن
کا منشا ہے اور یہ نہ ماننا قرآن کی مخالفت اور اپنی خواہش نفس کی پرستش کرنا
ہے درحقیقت یہ وہ جاہلیت ہے جو بعض لوگوں کے خون میں سرایت کر گئی ہے۔

علی العظیم

یہاں ہم جو کچھ لکھ رہے ہیں، کا مقصد صرف دعوت فکر و تدبر دینا اور قوت
عقلیہ و فکریہ کو تحریک دینا ہے۔ لہٰذا اس مقام پر بحث و مناظرہ کا باب نہ کھولا جائے۔ جنکے
دل کو بات لگتی ہے وہ مان لے اور جنکی عقل کا زنگ ہو وہ اپنے مقام پر رہے۔
بقرہ ۲۵۵۔ یہ آیت "آیت الکرسی" کے نام سے جانی جاتی ہے۔ یہ دو جملوں میں
گھری ہوئی ہے۔ "اللہ لا الہ الا ھو وھو العلی العظیم"۔
اس کا مکمل ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔
"اللہ وہ ہے کہ اسکے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ زندہ ہے اور ہمیشہ قائم ہے۔ اسے نہ اونگھ
آتی ہے اور نہ نیند۔ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اسی کی ملکیت
ہے۔ کون شخص ایسا ہے جو بغیر اسکی اجازت کے اسکے حضور میں سفارش کرے۔ جو کچھ
انکے سامنے ہے اور جو کچھ انکے پیچھے ہے وہ سب کو جانتا ہے اور اسکے علم میں سے کسی
بھی چیز پر احاطہ نہیں کر سکتے سوائے اسکے جتنا وہ چاہے۔ اسکی کرسی سب آسمانوں اور
زمین کو گھیرے ہوئے ہے اور ان دونوں کی حفاظت اسے تھکاتی نہیں اور وہ علی عظیم

ہے''۔

یہ آیت ''اللہ'' سے شروع ہوتی ہے۔ پھر اس اللہ کی چھ صفات بیان کی گئی ہیں اور آخر میں کہا گیا ہے کہ وہ اللہ جس کی صفات بیان کی گئی ہیں وہ ''علی العظیم'' ہے۔ یعنی اللہ جب اپنی صفت وحدانیت والوہیت ومعبودیت کے ساتھ منزل ظہور وشہود پر آتا ہے تو علی عظیم کہلاتا ہے۔

پہلی صفت حی یہ ہے کہ وہ زندہ وقائم ہے اور وہ کبھی سوتا نہیں ہے۔ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ وہ کون ہے جو کبھی نہیں سوتا۔

مفاتیح الجنان صفحہ ۵۷۰ زیارت امیر المومنین کا ایک جملہ۔

''آپ وہ زندہ آنکھیں ہیں جو سوتی نہیں۔ آپ کی خدا والی ہیں کہ خدا آپ کے ذریعے فیصلہ کرتا ہے''۔

اب یہ بھی معلوم ہو گیا کہ وہ زندہ وقائم جو کبھی نہیں سوتا وہ علی العظیم ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہ فیصلہ بھی علی العظیم ہی کرتا ہے کہ کس کو شفاعت کی اجازت دی جائے اور کس کو نہ دی جائے کیونکہ وہ خدا والی ہے جس کے ذریعے سے اللہ فیصلے کرتا ہے۔ جہاں تک زمین و آسمان کی ملکیت کا سوال ہے تو سورہ جاثیہ کی آیت ۱۳ میں ارشاد ہوتا ہے۔ ''اور جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اس نے سب کو تمہارے لئے مسخر کر دیا''۔

یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ کر دیا جائے تو بہتر ہوگا۔ بہت سے لوگ جن میں علماء بھی شامل ہیں آیت کو عام لوگوں کی طرف موڑتے ہیں حالانکہ یہ بات سراسر خلاف عقل ہے۔ "تسخیر" کہتے ہیں مکمل قبضے کو۔ اور مکمل قبضے کا مطلب ہوتا ہے مکمل اختیار۔ اگر یہاں عام لوگ مراد لے جائیں تو کچھ لوگوں کے پاس یہ اختیار ہونا چاہئے کہ وہ کائنات میں جو چاہیں تبدیلی کریں۔ سورج اور چاند کے راستے بدل دیں۔ سمندروں کو ساکن کر دیں۔ ہواؤں کا رخ موڑ دیں۔ ماضی کو مستقبل اور مستقبل کو ماضی بنا دیں۔ بے موسم کے پھل اگا دیں۔ مگر لوگ تو بے چارے تمام ترقی کر لینے کے باوجود مظاہر فطرت کے سامنے عاجز و مجبور ہیں۔ اور اگر تسخیر سے یہ مراد لیا جائے کہ انسان چاند پر پہنچ گیا اور مریخ سے سیاروں پر کمند پھینک رہا ہے تو کسی جگہ پہنچ جانے سے وہ جگہ تسخیر نہیں ہو جاتی۔ میں اگر آپ کے گھر پہنچ جاؤں تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوگا کہ میں نے آپ کے گھر کو تسخیر کر لیا۔ جبکہ یہ اولیاء اللہ ہی ہیں جن کے ہاتھ میں کائنات کا کنٹرول مسخر ہے۔ وہ جب چاہیں کائنات میں جو چاہیں تبدیلی کریں۔ وقت کی لگام ان ہی کے ہاتھ میں ہے۔ ذرے ذرے پر ان ہی کی اطاعت واجب ہے۔ لہذا اس آیت کا تعلق صرف ان ہی سے ہو سکتا ہے۔ ان کے علاوہ کسی اور پر اس کا اطلاق ہو ہی نہیں سکتا۔ نہ تاریخ اس کی تائید کرتی ہے اور نہ عقل۔

جہاں تک علم کا تعلق ہے تو حضرت امیر المومنین کا یہ فرمان آپکی نظر سے گزر چکا کہ "میں ہوں اللہ کا علم"۔ اب رہی ارادی کی بات تو اس کا تعلق خلق سے ہے۔ ہماری

زمین ایک نظام شمسی کا حصہ ہے جس کی وسعت کا اندازہ آج تک نہیں لگایا جا سکا۔ اس نظام میں موجود تمام سیارے ہمارے سورج کے گرد گردش کرتے ہیں اور وہ دوسرے ستارے کی کشش کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں۔ ایسے کروڑوں سورج ایک کہکشاں میں ہیں اور ہر سورج کا اپنا اپنا نظام شمسی ہے۔ ان میں سے کچھ سورج ہمارے سورج سے کروڑوں گنا بڑے ہیں۔ اور ہر کہکشاں میں یہ تمام سورج ہیں اس جیسی لاتعداد کہکشائیں موجود ہیں اور یہ تمام کہکشائیں اور تمام خلائیں کرسی میں ہیں۔ کرسی کی وسعت کا اندازہ اس آیت میں کیا گیا ہے۔ "وسع کرسیه السموت والارض" (اس نے اپنے آسمانوں اور زمین کی کرسی کو وسعت دی ہے)۔

اس وسعت کا تعلق خلق سے ہے۔ "کل یوم هو فی شان" سے ثابت ہے کہ اللہ ہر روز ایک نئی تخلیق کرتا ہے اور اپنی کرسی کی وسعت کو مسلسل بڑھاتا رہتا ہے۔ خلق کا تعلق تحریک سے ہے اور حفاظت کرنے کا تعلق آیۃ الکرسی سے ہے۔ یہ وہی اللہ ہے جس نے کرسی کو وسعت دی ہے اور یہ وہی عظیم اللہ ہے جو اس کی حفاظت کرتا ہے اور یہ وہی قدرت و قوت والا خدا ہے جو اسے تھکنے نہیں دیتی اور وہ ہی تو علی عظیم ہے۔

دورِ حاضر کے منفرد شاعر جناب احمد نوید نے خطبہ افتخاریہ کا منظوم ترجمہ کرتے ہوئے حضرت امیر المومنین کے ایک قول کو کیا خوب نظم کیا ہے۔

خدا گواہ میں خود کو خدا نہیں کہتا

خدا ہی خود کو علی العظیم کہتا ہے

جو کچھ ہم نے بیان کیا اس کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اگرچہ آیت الکرسی "وھو العلی العظیم" پر ختم ہو جاتی ہے لیکن ہمیں حکم ہے کہ اسے "ھم فیھا خالدون" تک پڑھیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اگلی آیت میں ولایت کا ذکر ہے جس سے آیت الکرسی کا مفہوم مکمل ہو جاتا ہے۔

اب ہر کوئی "لا الہ الا ھو" کی وجہ سے الجھن میں پڑا ہوا ہو تو اس کی الجھن بھی ہم دور کر دیتے ہیں۔

لا الہ الا اللہ

یہاں ہم پانچ احادیث کے ذریعے لا الہ الا اللہ کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔

۱۔ توحید صفحہ ۹ ۔ حدیث ۵ تا ۷۔ ان تینوں احادیث میں امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ جو شخص مر جائے اور اللہ کا کسی کو شریک نہ کرے، اس کے اعمال اچھے ہوں یا برے وہ جنت میں داخل ہوگا۔ نیز یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنی عزت و جلال کی قسم کھاتا ہے کہ وہ اپنی توحید والوں کو تا ابد آتش جہنم کا عذاب نہ دے گا۔

۲۔ توحید صفحہ ۲۲ ۔ حدیث ۲۲ ۔ امام علی رضاؑ نے فرمایا کہ اللہ نے فرمایا "لا الہ الا اللہ میرا قلعہ ہے۔ جو اس قلعے میں داخل ہو گیا وہ میرے عذاب سے محفوظ رہا"۔

اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ شرط نجات لا الہ الا اللہ ہے اور جو بھی اس قلعے میں داخل ہو گیا وہ اللہ کے عذاب سے مامون ہو گیا۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ یہ قلعہ خود اللہ نے لا الہ الا اللہ کہاں بیان کیا ہے۔

۳۔ امالی صدوق صفحہ ۲۲۵۔ حدیث ۹۔

''رسول خدا نے جبرائیل سے انہوں نے میکائیل سے انہوں نے اسرافیل سے انہوں نے لوح سے اور اس نے قلم سے روایت کی کہ اس نے کہا کہ اللہ نے فرمایا ''ولایت علی ابن ابی طالب میرا قلعہ ہے اور جو کوئی میرے قلعے میں داخل ہوگا وہ میری دوزخ سے امان میں ہے''۔

پس معلوم ہو گیا کہ حقیقت لا الہ الا اللہ ولایت علی ہے اور اس کا ذکر حدیث قدسی میں کیا گیا ہے۔ یعنی ''لا الہ الا اللہ'' باطن ولایت ہے اور ''علی ولی اللہ'' ظاہر ولایت ہے اور حضرت علی اول بھی ہے اور آخر بھی۔

اب ہم مزید اضافہ شواہد پیش کرتے ہیں جن سے یہ بات مکمل طور پر ثابت ہو جائے گی کہ قرآن مجید میں بیشتر مقامات پر لفظ ''اللہ'' اسم کے صفت مستعمل ہوا ہے۔ لیکن ہم نے ان شواہد کو اس طرح ترتیب دیا ہے کہ ان کے ذریعے اس سوال کا جواب بھی دے دیا جائے جو ہمارے احباب کی ایک کثیر تعداد نے ہم سے پوچھا ہے۔ یہ سوال اس حدیث سے متعلق ہے جو ہم نے کشف الاعتقاد میں نقل کی تھی۔ اس حدیث میں معصوم فرماتے ہیں۔ ''لنا مع اللہ حالات'' فیہا نحن ھو و ھو

نحن و معه ذالک هو هو و نحن نحن ''۔ یعنی اللہ کے ساتھ ہمارے حالات ایسے ہیں کہ کبھی ہم وہ بن جاتے ہیں اور کبھی وہ ہم بن جاتا ہے لیکن اسکے باوجود وہ وہ رہتا ہے اور ہم ہم رہتے ہیں۔

ان شواہد سے ظاہر ہوجائے گا کہ وہ ہم کیسے بنتا ہے اور ہم وہ کیسے بنتے ہیں۔

__ہم وہ ہوجاتے ہیں__

النساء ۱۷۵ '' پس وہ لوگ جو اللہ پر ایمان لائے اور انھوں نے اس سے تمسک کیا تو وہ انہیں عنقریب اپنی رحمت اور فضل میں داخل کرے گا''۔

اس آیت میں ان مومنین کا ذکر کیا گیا ہے جو اللہ سے تمسک کرتے ہیں۔ اعتصام و تمسک کے معنی چمٹ جانا۔ مضبوطی سے تھام لینا۔ اطاعت و اتباع کی غرض سے دل لگانا اور محبت کرنا ہے۔ اس اعتبار سے اللہ سے تمسک کرنا بعید از عقل ہے اور اسکا اتباع کرنا محال ابدی۔ کیونکہ اتباع کے لئے کسی عمل کرنے والے کی ضرورت ہے۔ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ وہ عمل کرنے والا مشاہدے میں بھی آئے کیونکہ اتباع مشاہدہ کرکے ہی کیا جاسکتا ہے۔ لہذا تلاش کرنا چاہئے کہ یہ ''اللہ'' کون ہے جس سے تمسک رکھنا ضروری ہے؟۔

ہم وہ مقامات دکھاتے ہیں جہاں اعتصام بھی ہے اور تمسک بھی جن سے معلوم ہوگا کہ ان دو لفظوں سے منشاء خداوندی کیا ہے۔ اسکے بعد ہم انشاء اللہ مذکورہ بالا آیت کی تفسیر

بھی پیش کریں گے۔

(الف) بقرہ ۲۵۶۔ "پس جس نے کفر کیا طاغوت سے اور ایمان لایا اللہ پر تو یقیناً اس نے بڑی مضبوط رسی کو تھام لیا جو کبھی ٹوٹنے والی نہیں"۔

تفسیر صافی صفحہ ۷ پر رسول اللہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔ "جو کوئی یہ چاہے کہ وہ اس رسی کو پکڑے (متمسک کرے) جو کبھی نہ ٹوٹے تو اسے چاہئے کہ میرے بھائی اور میرے وصی حضرت علی ابن ابی طالب کی ولایت سے متمسک کرے۔ بے شک جو شخص اس سے محبت اور تولا کرے گا اللہ تعالیٰ اسے ہلاک ہونے نہیں دے گا اور جو اس سے بغض رکھے گا اسے نجات نہ دے گا"۔

یہاں سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اللہ پر ایمان لانے کا مطلب کیا ہے اور حبل اللہ سے کیا مراد ہے۔

(ب) آل عمران ۱۰۳۔ "اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہو (اعتصام کرو) اور فرقہ فرقہ نہ ہو جاؤ"۔

تفسیر عیاشی میں امام محمد باقرؑ سے منقول ہے کہ حبل اللہ آل محمدؑ ہیں جن سے اعتصام کرنے کا حکم خداوند عالم نے دیا ہے۔ اور اسی تفسیر میں امام موسیٰ کاظمؑ فرماتے ہیں کہ حبل اللہ سے مراد حضرت علی ابن ابی طالب ہیں۔

سورہ نساء کی جو آیت آپ کی خدمت میں پیش کی گئی تھی اسکی تفسیر میں تفسیر فرات صفحہ ۵۸ پر امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں۔ "اللہ سے متمسک کیا سے مراد یہ ہے کہ علی ابن ابی

طالب کی روایت سے تمسک کیا"۔ پس یہاں "اللہ" سے مراد معنی نہیں بلکہ اسم ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں "اسم" - "ذات" ہو جاتے ہیں۔

۲۔ یہ درس سے اگلی آیت بھی اسی کے بارے میں ہے۔

نساء ۱۴۶۔ "سوائے ان کے جنھوں نے توبہ کی اور نیکی اختیار کی اور اللہ کو مضبوطی سے پکڑا اور اپنے دین کو اللہ ہی کے لئے خالص کر لیا پس وہ مومنین کے ساتھ ہوں گے"۔

۳۔ حج ۷۸۔ "پس تم نماز قائم کرو اور زکوۃ دیتے رہو اور اللہ کو مضبوطی سے تھامے رہو وہی تمہارا مولا ہے۔ پس وہ کیسا ہی اچھا مولا اور کیسا ہی اچھا مددگار ہے"۔

۴۔ حم سجدہ ۳۰۔۳۱۔ "یقیناً وہ لوگ جنھوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر وہ اس قول پر قائم ہو گئے ان پر فرشتے نازل ہوتے اور کہتے ہیں کہ تم خوف نہ کرو اور نہ حزن کرو اور تمہیں اس جنت کی خوشخبری ہو جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔ ہم دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی تمہارے دوست ہیں"۔

یہ آیت بالکل واضح ہے اور کسی تشریح کی محتاج نہیں۔ خوشخبری ان لوگوں کو دی جا رہی ہے جنھوں نے کہا کہ "ہمارا رب اللہ ہے"۔ (ربنا اللہ) پھر وہ اپنے اس قول یعنی ربنا اللہ پر جم گئے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ اس چیز پر جم گئے۔ پس جس چیز پر وہ قائم ہوئے ہوں گے وہی "ربنا اللہ" ہے۔

تفسیر مجمع البیان میں ہے کہ امام رضا سے پوچھا گیا کہ استقامت سے کیا مراد

ہے؟ آپ نے فرمایا "خدا کی قسم وہی جس پر تم قائم ہو" تفسیر قمی میں ہے کہ "اس کا مطلب ولایت جناب امیر المومنین پر قائم رہنا ہے"۔ اور تفسیر فرات میں امام جعفر صادق نے فرمایا "ربنا اللہ سے مراد ولایت علی ہے"۔

ان تفاسیر سے ثابت ہو گیا کہ قائم رہا جائے گا ولایت علی پر اور کہا جائے گا "اللہ" پر قائم رہنا۔ اور اس کا مطلب ہے کہ "تم" سے "وہ" ہو جاتے ہیں۔

۵۔ نور ۳۵۔ "اللہ نور السموت والارض" (اللہ زمین اور آسمانوں کا نور ہے)۔

توحید صفحہ ۲۲۳ پر حدیث ہے امام رضا نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا "یہ نور آسمان والوں کے لئے ہادی ہے اور زمین والوں کے لئے رہبر ہے۔ یہ نور اللہ کا خلیفہ ہے"۔ ہادی کا مطلب ہے "ہدایت کرنے والا" اور رہبر کا مطلب ہے "امام"۔ ہم قرآن سے ہی پوچھتے ہیں کہ ان دونوں سے کون مراد ہے۔

رعد ۷۔ "سوائے اس کے نہیں کہ (اے رسول) تو ایک ڈرانے والا ہے اور ہر قوم (یعنی تمام قوم) کے لئے ایک ہادی ہے"۔ یعنی قومیں بہت سی ہیں مگر کل ہدایت کرنے والا ایک ہی ہے۔ شیعہ سنی تفاسیر متفق ہیں کہ "منذر" سے مراد رسول اللہ ہیں اور "ہادی" سے مراد جناب امیر المومنین ہیں۔

تفسیر صافی صفحہ ۲۵۸ پر بحوالہ تفسیر مجمع البیان لکھا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو

آنحضرت نے فرمایا ”میں تو ڈرانے والا ہوں اور علیؑ میرے بعد ہادی ہیں“۔ پھر حضرت علیؑ سے فرمایا ”یا علیؑ میرے بعد ہدایت پانے والے تمھارے ہی ذریعے سے ہدایت پائیں گے“۔ اسی طرح تفسیر عیاشی میں شوریٰ ۵۴ کی تفسیر میں معصوم فرماتے ہیں ”خدا جس کسی کی بھی ہدایت کرتا ہے وہ علیؑ ہی کے ذریعے کرتا ہے“۔ اب رہا یہ یعنی امام کا سوال تو سورہ یٰسین ۱۲ میں ارشاد ہوتا ہے ”ہم نے ہر شے کو امام مبین میں جمع کر رکھا ہے“۔

تفسیر صافی صفحہ ۲۴۰ پر بحوالہ تفسیر قمی جناب امیر المومنینؑ سے منقول ہے کہ انھوں نے فرمایا ”خدا کی قسم وہ امام مبین میں ہوں“۔ تفسیر برہان صفحہ ۸۸۲ پر امام محمد باقرؑ سے منقول ہے کہ رسول اللہ حضرت امیر المومنینؑ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا ”امام مبین یہ ہیں۔ خدا نے امام ہے جنکی ذات میں کل شے کا علم احاطہ کیا ہوا ہے“۔

چند ذرے ہیں جسے قرآن نے اللہ کہا ہے۔

۶۔ احزاب ۲۵۔ ”قتال میں اللہ ہی مومنین کے لئے کافی ہوا“۔

قتال کے معنی ہیں جسمانی اور عملی طور پر جنگ کرنا۔ یہ آیت جنگ خندق سے متعلق ہے۔ کیا جنگ خندق میں اللہ خود آ کر لڑا تھا؟ اور کیا تلوار اللہ نے چلائی تھی؟ اور کیا عمرو بن عبدود کو اللہ نے قتل کیا تھا؟ پھر اللہ اپنے لئے لفظ قتال کا استعمال کیوں کرتا ہے؟ پس معلوم ہوا کہ وہ اللہ جو مومنین کے لئے قتال میں کافی

جو معنی نہیں بلکہ اسم ہے اور اس آیت میں حضرت امیر المومنین کو ہی مدد کہا گیا ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں "ہم وہ ہو جاتے ہیں"۔

۷۔ مثال ۷: "وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمی"۔ (وہ تو نے کنکریاں نہیں پھینکی تھیں جبکہ تو نے ہی پھینکی تھیں بلکہ یہ اللہ نے پھینکی تھیں)۔

اس آیت میں ایک فعل کو دو طرف منسوب کیا گیا ہے۔ یہ فعل کس کا ہے وہ عمل دو۔ رسول کو تو کنکریاں پھینکتے ہوئے ساری دنیا نے دیکھا مگر اللہ کو کنکریاں پھینکتے ہوئے کس نے دیکھا؟ آئیے ہم آپکو بتاتے ہیں کہ وہ اللہ جو کنکریاں پھینکنے کے عمل میں شریک تھا وہ کون تھا؟۔

علی فی قرآن صفحہ ۱۵۳۔ ابن عباس سے روایت ہے کہ آنحضور نے حضرت علی سے فرمایا۔ "مجھے کنکریوں کی ایک مٹھی دو۔" حضرت علی نے اٹھا دی۔ آپ نے وہ کنکریاں ان کے منہ پر پھینکیں۔ کوئی کافر ایسا نہ بچا جس کی آنکھیں کنکریوں سے بھر نہ گئی ہوں۔

معلوم ہو گیا کہ کنکریاں اللہ کے ہاتھ نے اٹھا دیں اور رسول کے کنکریاں پھینکنے کے عمل میں چونکہ علی شریک تھے اور یہاں ان کے لئے لفظ اللہ استعمال کیا گیا ہے۔

۸۔ یہاں ہم تین آیات پیش کریں گے تا کہ نتیجہ اخذ کیا جا سکے۔

(الف)۔ رعد ۴۳۔ "اور وہ لوگ جو کافر ہو گئے کہتے ہیں کہ تو (اللہ کا) رسول نہیں ہے۔ (اے رسول) تم کہہ دو کہ میرے اور تمہارے درمیان اللہ کافی گواہ ہے اور وہ جس کے پاس کل کتاب کا علم ہے (یعنی علی)"۔

(ب)۔ نساء ۷۹۔ "اور (اے محمد) ہم نے تجھے لوگوں کے لئے رسول بنا کر بھیجا اور گواہی کے لئے اللہ ہی کافی ہے"۔

(ج)۔ بنی اسرائیل ۹۶۔ "(اے رسول) کہہ دو کہ میرے اور تمہارے درمیان گواہی کے لئے اللہ کافی ہے"۔

پہلی آیت میں کہا گیا ہے کہ آنحضرت کی رسالت کے دو گواہ ہیں۔ ایک اللہ اور دوسرا وہ جس کے پاس کل کتاب کا علم ہے اور یہ دو گواہ کافی ہیں۔ اللہ نے یہاں نصاب شہادت کو لازمی کر دیا ہے اور دو گواہ قرار دیے ہیں لیکن دوسری اور تیسری آیت میں صرف ایک گواہ کو کافی قرار دیا ہے۔ اور ظاہر بیں نگاہوں سے دیکھا جائے تو اس طرح (معاذ اللہ) قرآن میں تضاد ثابت ہوتا ہے۔ علماء کا فرض ہے کہ وہ جو مترجمین ہیں اس تضاد کی توجیہ کریں اور قرآن مجید کی ان آیات میں مطابقت ثابت کریں۔ جب تک وہ یہ کام نہ کریں اس وقت تک انہیں ہماری کسی بات پر اعتراض کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔

یہاں سب سے پہلے "اللہ کی گواہی" کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ قرآن مجید میں کئی مقامات پر اللہ نے اپنی گواہی کا ذکر کیا ہے۔ یہ بات آپ اور ہم تو عقیدتاً مان لیں گے لیکن دنیا بھر کو یہ بات سمجھانا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے کیونکہ اللہ کی گواہی

انسانی مشاہدے میں نہیں آتی اور جو شے مشاہدے میں نہ آتی ہو اسے ثابت کرنا کسی کے بس کی بات نہیں۔ سورہ آل عمران کی آیت ۱۸ میں ارشاد ہوتا ہے۔ "اللہ نے گواہی دی کہ بیشک اس کے سوا کوئی معبود نہیں"۔

اللہ کی گواہی میں کوئی شک نہیں ہے لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ چاہے توحید کی گواہی ہو یا اپنے رسول کی رسالت کی گواہی۔ یہ دونوں گواہیاں اللہ نے اپنے لئے نہیں بلکہ لوگوں کے لئے دی ہیں تاکہ لوگوں کو توحید و رسالت پر یقین آجائے اور وہ ایمان لے آئیں لیکن جب اللہ کی گواہی لوگوں کے فہم و ادراک سے بالاتر ہو تو کسی کی سمجھ میں کیسے آئے گی؟ اور جب سمجھ میں نہیں آئے گی تو وہ قبول کیسے کریں گے؟ اور جب قبول ہی نہیں کریں گے تو گواہی دینے کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ دوسری اہم تر بات یہ کہ کسی بھی اصول کے تحت مدعی خود گواہ کبھی نہیں بن سکتا۔ جبکہ یہ ظاہر ہے کہ حکیم کا کوئی فعل عبث نہیں ہوا کرتا۔ لہٰذا غور کرنا پڑے گا کہ جب اللہ خود گواہی دینے کا ذکر کرتا ہے تو اس کا مطلب کیا ہے؟ بصورت دیگر اللہ کی گواہی سے توحید و رسالت کو بظاہر کوئی فائدہ پہنچتا نظر نہیں آتا۔ لہٰذا ہمارے پاس کوئی چارہ کار ہے ہی نہیں سوائے اس کے کہ جہاں جہاں اللہ کی گواہی کا ذکر ہے وہاں اللہ سے مراد معنی نہیں بلکہ اسم ہیں یعنی اسم جو گواہی دیتا ہے وہ بھی مراد لی جاتی ہے اور درحقیقت اسی کی گواہی پر توحید و رسالت کا دارومدار ہے۔

اب سورہ کی رعد ۴۳ اور نساء ۷۹ میں تضاد کی بات تو ہم اس کا بھی مختصر جائزہ لے لیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ رعد ۴۳ میں جہاں بطور گواہ دو ہستیوں کا ذکر کیا گیا ہے وہیں ایک ہی شہادت ہے لیکن اس میں اثبات دینے والے کے دو روپ بیان کئے گئے ہیں۔ یہ واضح رہنا چاہئے کہ علی اسم اللہ تو ہے ہی لیکن خود اپنی ذات میں ایک معنی بھی ہے جیسا کہ جناب خود ارشاد فرماتے ہیں "میں وہ معنی ہوں جس پر اسم واقع نہیں ہو سکتا" یعنی "عالم کل کتاب" ہے اپنے معنی کے طور پر اور اللہ ہے اسم اللہ کے طور پر۔ پس اس آیت میں اثبات دینے والے کی حیثیت دو ہیں لیکن شہادت ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ علی رسالت رسول کی گواہی اللہ کی طرف سے بھی دیتا ہے اور اپنی طرف سے بھی۔ اللہ کی گواہی سے مراد وہ معجزات و بینات ہیں جو رسول سے ظاہر ہوتے ہیں اور یہ بات ناقابل تردید ہے کہ معجزات و بینات کا تعلق ولایت سے ہوتا ہے چونکہ معجزے کا مطلب کسی اشیاء عالم پر اپنا تصرف ثابت کرنا ہوتا ہے اور اللہ کی ولایت کا مظہر تام ذات علی ابن ابی طالب ہے اور اسی لئے کہا جاتا ہے کہ "ولایت باطن نبوت ہے"۔ اور علی کے اپنی ذات کے طور پر گواہی دینے کا مطلب نبی کی نبوت ثابت کرنے کے لئے اپنی جان ہتھیلی پر لے کر عملی نصرت کرنا ہے۔ یہ عملی شہادت ہے جس سے بڑی کوئی شہادت ہو ہی نہیں سکتی۔ اسی لئے اللہ کی راہ میں قتل ہو جانے والے کو شہید کہا جاتا ہے۔ چونکہ علی نے دونوں حیثیات سے توحید خدا ور

رسالت رسولؐ کی ہو گئی، حضرت علیؑ کی وہ دعاؤں کے مشاہدے میں آ گئی اور ان پر حجت بن گئی۔

۹۔ یوسف ۲۱ "اور اللہ تعالیٰ اپنے امر پر غالب ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے"۔
اس بارے میں ہمیں کسی تشریح کی ضرورت نہیں ہے۔ جو امر پر غالب ہو وہ صاحب الامر ہوتا ہے اور دنیا جانتی ہے کہ صاحب الامر کون ہے۔ جس ہی کو اس آیت میں "اللہ" کہا گیا ہے۔

۱۰۔ مفاتیح الجنان صفحہ ۲۹۰ "اس (اللہ) نے اپنا وعدہ پورا کیا اور اپنے بندے کی نصرت فرمائی اور اکیلے لشکر کو مغلوب کیا اور اکیلے ہی جتھوں کو مار بھگایا"۔
کیا دنیا میں کوئی ایک بھی ایسا شخص ہے جس نے اللہ کو میدان میں اترتے اور اکیلے ہی پورے لشکر کو مار بھگاتے ہوئے دیکھا ہو؟ پھر یہاں "اللہ" سے کون مراد ہے؟ اس کا جواب بھی ہم مفاتیح الجنان صفحہ ۴۹۲ پر درج زیارت امیر المومنین سے ہی پیش کرتے ہیں۔
"انھوں نے (علی) مشرکین کے لشکر تیرے حکم سے پچھاڑ دیئے۔ غداری فوجوں کو تیرے حکم سے تباہ کر دیا"۔

۱۱۔ توحید صفحہ ۸۰ حدیث ۱۸ امام محمد باقرؑ نے فرمایا "اللہ نے آدم کو اپنی صورت پر خلق کیا"۔

عالم کو درمیان سے ہٹا کر اور کوئی اس حدیث کا مطلب بتا دے تو ہم اسے مرد میدان سمجھیں گے جبکہ دو سنی روایات شاہد ہیں کہ حضرت ؑ نے حضرت امیر المومنین سے مشابہ تھے۔ پس یہاں "اللہ" کون ہے؟ یہ واضح رہے کہ شیخ صدوق کی کتاب توحید کا موضوع ہی توحید ہے اور انھوں نے یہ حدیث بھی توحید کے ضمن میں درج کی ہے۔

یہ دو مواقع تھے جن سے "ہم وہ ہو جاتے ہیں" کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ ہم نے حتی الامکان اختصار سے کام لیتے ہوئے صرف چند مثالیں دی ہیں ورنہ اگر تفصیل میں جایا جائے تو پورا قرآن اس قسم کی مثالوں سے بھرا پڑا ہے۔ لیکن زیادہ تفصیل سے اصل مقصد نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے اس لئے ہم اتنے ہی پر اکتفا کرتے ہیں جو سمجھنے والوں کے لئے بہت ہے۔

<u>وہ ہم ہو جاتا ہے</u>

۔زخرف ۵۵۔ "پس جب انھوں نے ہمیں غصہ دلایا تو ہم نے ان سے انتقام لیا"۔

غصہ ایک کیفیت کا نام ہے اور اللہ کیفیات سے منزہ ہے لہذا اس بات پر تدبر کرنا لازم ہے کہ اللہ کو غصہ دلانے کا کیا مطلب ہے؟ اور یہاں لفظ "اللہ" کس کے لئے استعمال کیا گیا ہے؟

توحید صفحہ ۱۸۹ حدیث ۷ میں امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں۔ "اللہ ہماری طرح غصہ نہیں کرتا مگر اس نے اپنے اولیا کو خلق کیا ہے جو غصہ کرتے ہیں اور راضی ہوتے ہیں۔ پھر ان کی رضا کو اپنی رضامندی اور ان کی ناراضگی کو اپنی ناراضگی قرار دیا ہے"۔

ثابت ہوا کہ لوگوں نے غصہ دلایا آل محمدؑ کو اور اللہ نے فرمایا کہ انھوں نے مجھ کو غصہ دلایا۔ اس اعتبار سے اس آیت میں لفظ اللہ آل محمدؑ کے لئے استعمال ہوا ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں "وہ ہم بن گیا"۔

قرآن مجید میں بیشتر مقامات پر اللہ نے اپنے لئے غضب اور رضا کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں۔ مندرجہ بالا آیت کی روشنی میں ان تمام آیات کا مطلب سمجھا جا سکتا ہے اور "وہ ہم ہو جاتا ہے" کا مفہوم جانا جا سکتا ہے۔

۲۔ بقرہ ۵۷۔ "ان لوگوں نے ہم پر کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ یہ تو اپنے ہی پر ظلم کرتے ہیں"۔

اللہ پر ظلم کون کر سکتا ہے؟ اور کیسے کر سکتا ہے؟ ظلم کہتے ہیں کسی شے کو اس کے مقام سے ہٹا دینا۔ غرض اللہ پر ظلم کرنا صرف اس صورت میں ممکن ہے جب ظلم کرنے والا اللہ کے مقام سے واقف ہو۔ یہ بحث بعد میں آئے گی کہ اللہ کا مقام کون ہے لیکن یہاں صرف یہ مقصد ہے کہ اللہ پر ظلم کرنا محالات سے ہے۔ پھر یہ "اللہ" کون ہے جس پر ظلم کیا گیا ہے؟۔

معانی فی قرآن صفحہ ۲۹۔ امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں۔ "کثرت احادیث اس بات سے ہمیں

عظیم تر۔ جل اور رفیع ہے کہ اس پر ظلم کیا جائے۔ خلاقِ عالم نے اپنی ذات کو ہم اہلِ ایمان میں شمار کر کے اپنی طرف ظلم کی نسبت دی ہے۔ گویا خداوند عالم نے ہمارے اوپر ظلم کو اپنی ذات پر ظلم سے تعبیر کیا ہے"۔

پس یہ وہ مقام ہے جہاں "وہم ہو جاتا ہے"۔

۳۔ آلِ عمران ۱۸۱: "بیشک اللہ نے ان لوگوں کا قول سن لیا جنھوں نے یہ کہا کہ یقیناً اللہ فقیر ہے اور ہم مالدار ہیں"۔

کسی کی مالداری یا فقر کا اندازہ اسلوبِ زندگی سے کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً اگر ہم دیکھیں کہ کوئی شخص محلوں میں رہتا ہے۔ نوکر چاکر اس کی خدمت کے لئے حاضر رہتے ہیں۔ پیسے کی ریل پیل ہے تو ہم کہیں گے کہ فلاں شخص مالدار ہے۔ اور اگر ہم کسی شخص کو جھونپڑی میں رہتے۔ فاقے کرتے اور پھٹے پرانے کپڑے پہنے دیکھیں تو ہم کہیں گے کہ فلاں شخص فقیر ہے۔ اللہ کو کس نے اس حالت میں دیکھ لیا کہ اسے فقیر کہہ دیا؟ معلوم ہوا کہ کوئی تھا جسے لوگوں نے فاقے کرتے دیکھا تھا۔ جس کے بچوں کو بھوک سے بلکتے دیکھا تھا۔ جس کے کپڑوں میں جابجا لگے ہوئے پیوندوں کو دیکھا تھا اور یہ سب کچھ دیکھ کر اسے فقیر کہا تھا۔ اس کے فقر کو اللہ نے اپنی طرف منسوب کیا۔

پس یہی وہ مقام ہے جہاں "وہم ہو جاتا ہے"۔

۴۔ احزاب ۵۷: "جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کو اذیت دیتے ہیں اللہ نے ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت کی اور ان کے لئے ذلیل کرنے والا عذاب تیار کیا ہوا ہے"۔

رسولؐ کو اذیت دینا تو سمجھ میں آتا ہے لیکن اللہ کو اذیت دینا کیا معنی رکھتا ہے؟ پھر عرض ہے کہ اذیت ایک کیفیت ہے جو اللہ کے لئے جائز نہیں۔ پھر یہاں کیوں اذیت دی جا رہی ہے جسکو اللہ خود کو اذیت دینے سے تعبیر کر رہا ہے؟

یہی وہ مقام ہے جہاں "وہ مجسم ہو جاتا ہے"۔

۵۔ صف ۱۴: "اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ کے مددگار ہو جاؤ"۔

یہ ظاہر ہے کہ اللہ کسی کی مدد کا محتاج نہیں لیکن اسکی طلب نصرت بتا رہی ہے کہ منصور کوئی اور ہے جس کی مدد کرنے کو اللہ خود کی مدد کرنا کہتا ہے۔

۶۔ حجرات ۱: "اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ اور اسکے رسولؐ کے سامنے آگے نہ بڑھو"۔

اس آیت میں اللہ نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ وہ اللہ اور اسکے رسولؐ سے آگے نہ بڑھیں۔ تقدم آگے بڑھنے اور فوقیت حاصل کرنے کو کہتے ہیں۔ تقدم کے بعد "بین یدی اللہ و رسولہ" آیا ہے۔ "بین یدی" کا مقصد کسی کے آگے چلنا ہی ہوتا ہے اور کسی کے آگے چلنے کا عمل جسمانیت اور رومیت پر منحصر ہے یعنی کسی صاحب جسم وجود کو دیکھ کر اسکے آگے نہ چلا جائے اور جو وجود صاحب جسم نہ ہو اور دیکھا نہ جا سکے اسکے آگے یا پیچھے چلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اللہ کی ذات جسم و جسمانیت سے پاک اور اس بات سے منزہ و مبرا ہے کہ اسکو دیکھا جا سکے اور اسکے آگے اور پیچھے چلنے کا عمل ناممکن و محال ہے اور نہ ہی اللہ سے آگے چلنے اور ظفر کے ہونے کا فعل صادر ہوتا

ہے لہذا ہم سب کا فرض بنتا ہے کہ اس بات پر غور کریں کہ اللہ سے آگے بڑھنے کا کیا مطلب ہے کیونکہ یہ اللہ کا حکم ہے جس پر بہرحال ہمیں عمل کرنا ہے۔ اللہ نے اس آیت میں اپنے رسول کو الگ بیان کرکے خود کو کسی امر سے ملحق کر دیا ہے اور اس سے آگے بڑھنے کی ممانعت فرمائی ہے۔ ہم اشارہ کریں کہ امام کتنے ہی سے ہیں جو سب سے آگے ہوں اور اس سے آگے بڑھنا جائز نہ ہو یہاں تک کہ وہ امام جو نماز کی امامت کر رہا ہو اس تک سے آگے نہیں بڑھا جا سکتا۔ مولوی یہاں بہت سی تاویلیں کرے گا مگر ان سے اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا کیونکہ یہ ثابت ہے کہ جب امام ظہور فرمائیں گے اور حضرت عیسیٰ سے کہیں گے کہ "اے عیسیٰ آگے بڑھیے اور نماز پڑھائیے" تو وہ فرمائیں گے کہ "اے فرزند رسولؐ! میں کس طرح آپ سے آگے بڑھ سکتا ہوں؟"۔ اس کے بعد حضرت عیسیٰ اس آیت کی تلاوت فرمائیں گے جس سے پوری طرح ثابت ہو جاتا ہے کہ یہاں آگے بڑھنے سے مراد جسمانی طور پر آگے بڑھنا ہے۔ لہذا آپ بخوبی فیصلہ کر سکتے ہیں کہ وہ "اللہ" کون ہے جو "ہم" بن کر اور جن سے آگے بڑھنے کی ممانعت کی گئی ہے؟۔

۲۔ (الف)۔ انفال ۱۔ "(اے رسولؐ) لوگ تجھ سے انفال کے متعلق پوچھتے ہیں۔ کہہ دو کہ انفال اللہ تعالیٰ اور رسولؐ کے لئے ہے"۔

(ب)۔ انفال ۴۱۔ "اور تم جان لو کہ ماسوا اس کے نہیں ہے کہ جو کچھ بھی تم کو کسی چیز سے غنیمت ملے پس اس کا خمس (پانچواں حصہ) اللہ تعالیٰ کے لئے ہے اور رسولؐ کے لئے ہے

اور رسول کے قرابتداروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لئے ہے"۔

(ج) حشر ۷: "اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو بستیوں والوں سے دیا پس وہ اللہ تعالیٰ کے لئے اور رسول کے لئے اور اسکے قرابتداروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لئے ہے"۔

ان تینوں آیات میں اللہ نے انفال اور خمس میں اپنا حصہ قرار دیا ہے اب سوچنے کی یہ ضرورت ہے کہ کیا دنیائے فانی کے مال فانی میں اللہ کو اپنا حصہ مقرر کرنے کی یہ ضرورت پڑ گئی؟ اور باعتبار خالق و مطلق اور صمد بے احتیاج ہونے کے باوجود اپنی خلق کی دولت خلق کے ساتھ اپنا مادی حصہ ان خدمات کی بنا پر مقرر کر دیا؟ اور اگر یہاں اپنا حصہ مقرر فرمانا تھا تو پھر صدقات میں اپنا حصہ کیوں قرار نہ دیا؟ ہم عقل اس بات کو فوراً سمجھ لے گی کہ وہ "اللہ" جسکے لئے انفال و خمس میں حصہ قرار دیا گیا ہے وہ ایسا ہے جس کو لوگوں کے ہاتھوں کے میل کچیل کو دور رکھنا مقصود ہے۔ صدقہ کا ہے یعنی انکے بدلے اللہ خود انکے ہاتھ کا ہو جانے کا اعلان کرتا ہے۔ پس یہ وہ مقام ہے جہاں "وہ ہم بن جاتا ہے"۔

ہم نے اختصار کے ساتھ اس سوال کا بھی جواب دے دیا جو ہم سے کیا گیا تھا اور یہ بھی ثابت کر دیا کہ قرآن مجید میں لفظ اللہ بیشتر مقامات پر امام کے لئے استعمال کیا گیا ہے اس لئے صرف لفظ "اللہ" سن کر یا پڑھ کر دھوکا نہیں کھانا چاہئے بلکہ حقیقت کو

سمجھنا چاہئے۔ اسی لئے ہمارے عارف حضرت میر تقی میر نے فرمایا تھا۔

کیا دن ہے یہ ہم جو اسے شاد کرتے ہیں
سچے ہیں وہی لوگ جو اللہ کہتے ہیں

حرفِ آخر

اپنی گفتگو ختم ہم تک پہنچانے سے قبل ہم آپ کی خدمت میں معصوم کا وہ قولِ فیصل پیش کرتے ہیں جس کے بعد کسی کے پاس کوئی عذر باقی نہیں رہ جائے گا اور جو شخص واقعی سمجھنا چاہتا ہے اس کے دل سے مولویوں کا پیدا کیا ہوا فرضی خوف انشاءاللہ کافور ہو جائے گا۔ لیکن اس سے بھی پہلے ہم شیخ صدوق کی کتاب معانی الاخبار (۳۰) صفحہ ۳۰ کی حدیث ۲ نقل کرتے ہیں جس سے لفظ ”اللہ“ کے معنی واضح طور پر سامنے آ جاتے ہیں۔

”راوی نے امام جعفر صادقؑ سے عرض کیا کہ ”اللہ سے کیا مراد ہے؟“۔ امام نے فرمایا۔ ”اللہ کے لفظ میں ”الف“ سے مراد اللہ کی نعمتیں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوقات پر ہماری ولایت کے ذریعے سے نازل فرمائی ہیں۔ اللہ کے لفظ میں ”ل“ سے مراد اللہ تعالیٰ کی جانب سے اپنی مخلوق پر ہماری ولایت کا لازم کر دینا ہے۔ اللہ کے لفظ میں ”ہا“ سے مراد توہین، لعنت، پستی و رسوائی ہے ان لوگوں کے لئے جنہوں نے محمدؐ و آلِ محمدؐ کی مخالفت کی“۔

اس حدیث سے ثابت ہو گیا کہ لفظ اللہ، متعارف ہے ولایت علیؑ کا اور اس تناظر میں

اس نقطہ کو سمجھنا چاہئے۔ اور اب ہم وہ حدیث پیش کرتے ہیں جس کا ہم نے آپ سے وعدہ کیا تھا۔

توحید صفحہ ۹۰۔ حدیث ۲۰۔ ابو بصیر نے امام جعفر صادق سے عرض کیا۔ "آپ مجھے بتائیے کہ کیا مومنین اللہ کو روز قیامت دیکھیں گے؟" آپ نے فرمایا۔ "ہاں! اور انہوں نے اس (اللہ) کو قیامت سے قبل بھی دیکھا ہے"۔ ابو بصیر نے پوچھا "کب؟" آپ نے فرمایا "جب اللہ نے ان سے فرمایا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے کہا کہ ہاں"۔ پھر آپ چند ساعت خاموش رہے۔ پھر فرمایا "بیشک مومنین اس (اللہ) کو دنیا میں قیامت کے دن سے پہلے دیکھیں گے۔ کیا تم نے اس کو اس وقت نہیں دیکھا؟" ابو بصیر کہتے ہیں کہ میں نے کہا کہ میں آپ پر فدا ہو جاؤں۔ کیا میں آپ سے (آپ کے حوالے سے) یہ حدیث بیان کر سکتا ہوں؟" آپ نے فرمایا "نہیں۔ کیونکہ جب تم اس کے متعلق بیان کرو گے تو منکر کا انکار کرے گا جو جاہل ہوگا اس معنی سے جو تم کہو گے"۔

ہم نے اصل مسئلہ کی حقیقت آپ تک پہنچا دی۔ اب جو شخص بھی انکار کرنے کا ارادہ رکھے وہ پہلے سوچ لے کہ معصوم نے اسکے بارے میں کیا ارشاد فرمایا ہے۔

مندرجہ بالا مباحث کے بعد یہ بات دل میں بٹھا لینا چاہئے اور اس پر یقین رکھنا چاہئے کہ۔

علیؑ عابد ہے بطورِ معنی کے — اور — معبود ہے بطورِ اسم کے

علیؑ ساجد ہے بطورِ معنی کے — اور — مسجود ہے بطورِ اسم کے

علیؑ علیم ہے بطورِ معنی کے — اور — علم ہے بطورِ اسم کے

علیؑ رب ہے بطورِ معنی کے — اور — ربّ الارباب ہے بطورِ اسم کے

علیؑ خالق ہے بطورِ معنی کے — اور — احسن الخالقین ہے بطورِ اسم کے

علیؑ رازق ہے بطورِ معنی کے — اور — خیر الرازقین ہے بطورِ اسم کے

علیؑ علی ہے بطورِ معنی کے — اور — اللہ ہے بطورِ اسم کے

واللہ مستعان

المعارف

مذہب کے بننے یا بگڑنے کا دارومدار اس بات پر ہوتا ہے کہ اُسے ماننے والے عقل
سے کتنے قریب ہیں یا کتنے دور۔ کیونکہ مذہب کا تعلق بنیادی طور سے غیر مادی ہوتا
ہے جس کا اصل موضوع حیات بعد الممات ہوتا ہے اور یہ موضوع ایسا ہے کہ اس
میں مشاہدہ کم اور تخیل زیادہ کارگر ہوتا ہے۔ موت کے وقت کیا کیفیت گزرتی ہے
یہ کسی کو نہیں معلوم۔ قبر میں کیا ہوتا ہے یہ کسی کو خبر نہیں۔ برزخ کے حالات سے بھی سب
لاعلم ہیں۔ قیامت کے بارے میں محسوساتی شواہد کسی کے پاس بھی نہیں۔ یہ تمام
چیزیں خبریں ہیں جو لوگوں تک کسی نہ کسی ذریعے سے پہنچتی ہیں۔ لہٰذا اس ذریعے کی جانچ
پرتال نہایت ضروری ہے۔ ذریعہ مشکوک ہوگیا تو مذہب کی پوری عمارت پل بھر میں
منہدم ہوجائے گی اور صرف قصے کہانیوں اور روایات کا ایک جال باقی رہ جائے گا جس
میں جھوٹے مذہبی لوگ ٹھوکریں کھاتے رہیں گے اور منہ کے بل گرتے رہیں گے۔ اس
ذریعے کو مذہبی اصطلاح میں "وسیلہ" کہتے ہیں اور اس وسیلے کا منجانب اللہ ہونا فقط
واجب ہے کیونکہ حیات بعد الممات کے بارے میں کسی بھی قسم کی معلومات حاصل کرنا
انسان کے لیے عقلی اور عملی دونوں اعتبارات سے محال ہے اور ان چیزوں کے بارے
میں صرف وہی جان سکتا ہے جسے خود اللہ نے علم عطا فرمایا ہو۔ ہماری تکلیف صرف اتنی
ہے کہ ہم سچے وسیلے تلاش کریں اور جب وسیلہ مل جائے تو اس کی دی ہوئی خبروں کو بے چون

سے تعلیم رہیں نہ کہ اس خبر میں اشتباہات پیدا کریں اور اس نئی تحقیق کو اپنا مقصد حیات بنائیں۔ جو لوگ روایات کی چھان بین میں لگے رہتے ہیں وہ اپنی پوری زندگی شک اور حیرت کے عالم میں گزارتے ہیں کیونکہ راویوں کا حال یہ ہے کہ ایک محدث کسی راوی کو ثقہ اور قابل اعتماد سمجھتا ہے جبکہ دوسرا محدث اسی راوی کو جھوٹا اور غیر معتبر قرار دیتا ہے۔ ایسی صورت میں ضروری ہو جاتا ہے کہ راویوں کو چھوڑ کر پہلے ان لوگوں کی چھان بین کی جائے جو راویوں کو جھوٹا یا سچا قرار دیتے رہے ہیں اور یہ ایک انتہائی مشکل کام ہے۔ لہٰذا کسی بھی روایت پر اعتبار کرنا عقلی اعتبار سے ممکن نہیں رہتا اور ہر طرف پورا مذہب مشکوک ہو کر رہ جاتا ہے۔ احادیث کو پرکھنے کا یہ طریقہ غیروں نے ایجاد کیا ہے اور شیعوں نے اس معاملے میں ان کی تقلید کی ہے جب کہ روایت کی اس چھان بین کو لوگوں نے آسان مذہب سمجھ رکھا ہے اور ہر طرف انتشار و خود غرضی ہے۔ محمد نے مذہب کو آسان بنایا ہے جبکہ نام نہاد علماء نے اسے ایک چیستان میں تبدیل کر دیا ہے کہ نہ وہ خود سمجھ سکتے ہیں اور نہ لوگوں کو سمجھا سکتے ہیں۔ یہاں تک قاعدہ تو ضرور کہا جاتا ہے کہ جس حدیث کو عقل قبول نہ کرے تو سمجھو راوی میں کسی نہ کسی قسم کا سقم نکال کر وہ آسانی سے اس حدیث کا انکار کر دیتے ہیں۔

نہج البلاغہ جلد ا صفحہ ۲۲۳ پر حضرت امیر المومنین فرماتے ہیں۔ "جب تم کوئی حدیث نقل کرو تو اس کے راوی کا بھی اندازہ کرو جس سے تم نے حدیث سنی ہے۔ پھر اگر وہ سچ

ہے تو اس کا فائدہ تمہیں پہنچے گا اور اگر وہ جھوٹا ہے تو اس کا نقصان اس جھوٹے راوی کو پہنچے گا"۔

فرمانِ معصوم نے مذہب کو کتنا آسان بنا دیا ہے بشرطیکہ عقل سے کام لیا جائے اور متن حدیث پر غور کیا جائے جیسا کہ خود حضرت امیر المومنین ارشاد فرماتے ہیں: "جب کوئی حدیث سنو تو اسے عقل کے معیار پر پرکھ لو صرف نقل الفاظ پر بس نہ کرو کیونکہ علم کے نقل کرنے والے تو بہت ہیں مگر اس (متن حدیث) میں غور و فکر کرنے والے کم ہیں"۔ (نہج البلاغہ صفحہ ۸۳۲ قول ۹۸)۔ چند راویوں کے پیچھے بھاگنے والوں نے مذہب کو بجائے تحقیق کے ایک دوسرے سے دست و گریبان ہونے کا ذریعہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ اس مشغلے کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ لوگ مقصد مذہب سے بالکل بے تعلق ہو کر رہ گئے ہیں اور ہر کوئی کسی نہ کسی مذہب سے صرف اس لئے وابستہ رہتا ہے کہ جب وہ پیدا ہو تو اس کے کان میں اذان کہی جائے اور جب وہ مرے تو اس کی آخری رسومات صحیح ادا کئے جائیں اور زندگی درمیانی مدت کے دوران وہ ایک امید موہوم کا سہارا لئے ہوئے پوجا پاٹ کرتا رہتا ہے۔

نتیجہ اور کوتاہ نظر لوگوں نے عمل کے معاملے کو بہت پیچھے رکھا ہے کیونکہ یہ لوگوں کو گمراہ کرنے کا آسان ترین طریقہ ہے۔ میری گزارش ہے کہ میری عرض داشت کو نہایت ٹھنڈے دماغ اور انصاف پسندی کے ساتھ سماعت فرمایا جائے

کیونکہ جب تک آپ کسی کی بات کو پوری طرح نہیں سنیں گے اس وقت تک آپ یہ فیصلہ ہی نہیں کر سکتے کہ اس کی بات حق ہے یا غلط۔ اور کسی کی بات کو سنے اور سمجھے بغیر جہالت سے اسے غلط کہہ دینا احمقوں کا ہی کام ہوتا ہے اور ایسے لوگ ہمیشہ حقائق سے محروم اور کنوئیں کے مینڈک بنے رہتے ہیں۔

اگر تمام عالم انسانیت کے سامنے یہ سوال قائم کیا جائے کہ کیا عمل کرنا ہی مقصد حیات ہے؟ چاہے مقصد عمل معلوم ہو یا نہ ہو؟ چاہے طریقہ عمل کا علم ہو یا نہ ہو؟ تو یقیناً ہر شخص یہی جواب دے گا کہ نہیں! عمل صرف اسی صورت میں مفید ہوتا ہے جبکہ۔

۱۔ <u>مقصد عمل معلوم ہو۔</u>

۲۔ <u>طریقہ عمل صحیح ہو۔</u>

۳۔ <u>یہ یقین ہو کہ جو عمل کیا جا رہا ہے وہ ضرور قبول ہوگا۔</u>

کوئی بے وقوف ہی ہوگا جسے معلوم نہ ہو کہ اس کا عمل قبول ہوگا یا نہیں لیکن پھر بھی وہ عمل میں مشغول رہے اسے اندھیرے میں تیر چلانا کہتے ہیں۔ مجھے اگر کہیں جانا ہو تو پہلے میں صحیح سمت معلوم کروں گا پھر اپنا سفر شروع کروں گا۔ اگر صحیح چلا تو جلدی منزل پر پہنچ جاؤں گا اور اگر راستہ یا سمت گم کر چلا تو دیر سے پہنچوں گا مگر پہنچوں گا ضرور لیکن اگر میں بغیر سمت معلوم کئے چل پڑا تو ساری زندگی بھٹکتا ہی رہوں گا اور کبھی بھی منزل

مقصود پر نہیں پہنچ سکوں گا۔ عمل کا انکار دنیا کا ایک شخص بھی نہیں کرسکتا لیکن وہ عمل جسے قبول ہونے کا انسان کو یقین ہوتا ہے کہ وہ عمل جسے عامل کو شرط قبولیت کا علم میسر ہوئی نہیں جیسا کہ اس سے پہلے ایک عالم صاحب کا قول نقل کیا کہ نماز نہ پڑھنے سے نماز پڑھنا بہتر ہے۔ یہ محققوں کا قول ہے جاہلی تاویل حقیقت کبھی نہیں بدلے گی۔ یہاں ہم صرف شرط قبولیت بیان کرتے ہیں۔ تفصیلات ان حدود سے معلوم کی جائیں جنکے تحت لوگ عمل کرتے ہیں۔

۱۔ قاعدہ: "وہ کتاب ایسی ہے جس میں کوئی ریب نہیں وہ ہدایت کرتی ہے متقین کی"۔

یہاں سے معلوم ہوا کہ ہدایت پا کر انسان متقی نہیں بنتا بلکہ ہدایت پانے سے پہلے کا متقی ہونا شرط لازمی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ متقی بننے سے پہلے متقی کم ہوتا ہے۔ کیا غیر متقیوں کا عمل قبول ہوسکتا ہے؟ اگر نہیں ہوسکتا تو کیا عمل کرنے والے کو یہ یقین حاصل ہے کہ وہ متقی ہے؟ اور اگر ایسا نہیں ہے تو جو عمل وہ کر رہا ہے وہ اس کے کھاتے میں جائے گا؟

۲۔ قاعدہ ۲۔ "بس اور بس (انما) اللہ صرف متقین سے ہی قبول کرتا ہے"۔

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ عمل کرنے سے متقی نہیں بنا جاسکتا بلکہ عمل کرنے سے پہلے کا متقی ہونا ضروری ہے۔ صرف اس صورت میں خدا عالم کے عمل کو شرف

توفیق بخشے گا۔ یعنی تقویٰ شرط عمل ہے نہ کہ نتیجۂ عمل۔ اس لئے کسی بھی عمل کرنے والے کو عمل کے لئے مرتکب ہونے سے پیشتر یہ یقین حاصل کرنا ضروری ہے کہ وہ متقی ہے ورنہ وہ اس یقین کے ساتھ عمل کرے کہ اس کا عمل ہرگز قبول نہیں ہوگا۔ میں ان تمام لوگوں سے جنہوں نے عمل کو ایک نتیجہ کی بنا رکھا ہے سوال کرتا ہوں کہ یہ وہ سب کے سب متقی ہیں؟ اور ہیں تو ہمیں بھی وہ طریقہ بتائیں جس سے بغیر عمل کے متقی ہو جاتا ہو مگر قرآن سے اور حدیث سے سند لائیں یا کسی اور کی نقل کریں سے۔ کیونکہ کسی کی نقل کرنے (تقویٰ) کا اللہ نے ہمیں پابند نہیں بنایا اور ہم پہلے ہی مرحلے میں کسی کی نقل کرنے کے صاف صاف منکر ہیں۔

یہ معاملہ ایسا نہیں جس سے سرسری طور پر گزر جائے۔ لوگوں کو اس پر غور کرنا چاہئے بجائے اس کے کہ وہ مومنین کو طعن و تشنیع کا نشانہ بنائیں۔

یہ واضح ہو گیا کہ وہ حالت جس میں انسان ہدایت کا مستحق بنتا ہے تقویٰ کہلاتی ہے اور جو شخص اس حالت میں ہوتا ہے اسے متقی کہتے ہیں اور یہ یاد رکھئے کہ ہدایت کا مطلب معرفت ہوتا ہے۔ اس لئے وہ لوگ جن کا تقویٰ سے دور کا بھی تعلق نہیں معرفت کے بارے میں غیر سنجیدہ رویہ اختیار کئے رہتے ہیں اور یہی لوگ ہیں جنہوں نے لفظ معرفت کو تضحیک کا نشانہ بنایا ہوا ہے اور یہ بھول گئے ہیں کہ جہالت اور ہدایت ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

مراد

کسی بھی شے کو ماننے یا نہ ماننے کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ اس شے سے مراد کیا لی جا رہی ہے۔ اگر مراد صحیح ہے تو وہ چیز حق ہے اور اگر مراد غلط ہے تو وہ چیز غلط ہے۔ اس بات کو یوں سمجھئے کہ اگر کوئی شخص ایک بت بنا لے یا اپنے ذہن میں کسی شے کا ایک تصور تشکیل دے لے اور یہ سمجھے کہ وہ شے اللہ ہے اور پھر کہے کہ لا الہ الا اللہ تو اگرچہ یہ کلمہ، شرک سے نکالنے کے لئے ہے لیکن یہی کلمہ پڑھ کر وہ شخص مشرک ہو جائے گا صرف اس لئے کہ اس کی مراد غلط ہے۔ اسی طرح کلمہ محمد رسول اللہ کا مقصد ختم نبوت کی تائید کرنا ہے لیکن اگر کوئی شخص مقام نبوت سے ناآشنا ہے یا پھر یہ سمجھتا ہے کہ اس کے محلے میں جو محمد خان رہتا ہے وہ رسول اللہ ہے تو یہی کلمہ پڑھ کر وہ کافر ہو جائے گا محض اس لئے کہ اس کی مراد غلط ہے۔ یہی صورت کلمہ علی ولی اللہ کی ہے کہ اگرچہ اس کلمے کا مقصد رد نفاق ہے لیکن اگر کوئی شخص مرتبہ ولایت سے جاہل ہے اور علی کے بارے میں اس کا تصور انتہائی ناقص ہے اور وہ آنجناب کو ایک بااثر رہنما، مسلک شیعہ سے عقیدت رکھنے والے ایک بڑے پہلوان سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا تو ایسا شخص یہی کلمہ پڑھ کر منافق ہو جائے گا فقط اس لئے کہ اس کی مراد غلط ہے۔ اسی "مراد" کا نام معرفت ہے اور اسی لئے بغیر معرفت کے نہ عقیدہ صحیح ہو سکتا ہے اور نہ عمل۔

ہماری بات شاید ابھی تشنہ رہ گئی ہے۔ ہم پہلے کی طرح ایک عقلی شے

ہے۔ چنانچہ عقل کی جو تعریف معصوم نے بیان فرمائی ہے وہ یہ ہے کہ "عقل وہ ہے جو انسان کو ہادی کی معرفت کروائے"۔ اور اصول کافی کتاب عقل میں معصوم فرماتے ہیں: "انسان کے لئے اتنی عقل کافی ہے جس سے وہ ہادی کو پہچان لے"۔ عقل ہی ہادی کی مختلف خصوصیات کی نشاندہی کرتی ہے جن کی تفصیل تحقیق روایت کے ذریعے حاصل کی جاتی ہے۔ پس جو روایت ہادی کی شان بیان کرے وہ تحقیق اور قابل قبول سمجھی جائے، خواہ راوی کوئی بھی ہو اور جس روایت سے ہادی کی شان میں کمی ہوتی ہو وہ ناقابل قبول سمجھی جائے، خواہ راوی کوئی بھی ہو۔

ہم نے آپ کو ایک ایسا معیار بتا دیا ہے جس کی مدد سے آپ زندگی بھر علماء رجال کے تعصبات سے محفوظ رہیں گے۔ انشاء اللہ

وسیلہ معرفت

دین کا مرکز و محور عقیدہ توحید ہے اور توحید کے لئے سب سے پہلی شے جو ضروری ہے وہ اللہ کی معرفت ہے جیسا کہ حضرت امیر المومنین نے فرمایا: "اوّل الدین معرفته"۔ یعنی دین کی ابتداء یہ ہے کہ اللہ کی معرفت حاصل کی جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ معرفت ہمیشہ ذات کی ہی ہوتی ہے اور اس معرفت کا ذریعہ وسیلہ صفات ہوا کرتی ہیں۔ جیسا کہ آپ اس سے قبل قول معصوم ملاحظہ فرما چکے کہ "اللہ کی معرفت اللہ سے ہی حاصل کی جاتی ہے"۔ یعنی اس اللہ کی معرفت جو معنی ہے اس اللہ سے

حاصل کی جاتی ہے جو اسم ہے اور یہی اسم اس کی صفت تامہ ہے اور اس کی تمام صفات کا جامع ہے۔ یہ اسم مظہر ذات ہے یعنی ذات کا پرتو ہے اور مظہر صفات ہے یعنی صفت کا ظاہر کرنے والا ہے اور چونکہ یہ خود تمام صفات کا جامع ہے اس لئے یہ خود ہی کو ظاہر کرتا ہے اور اس کی شان کے طور پر اللہ کو جانا اور مانا جاتا ہے اور یہی توحید خاص ہے۔ اسی لئے اصول کافی کتاب التوحید صفحہ ۱۸۹ حدیث ۲ میں امام جعفر صادق فرماتے ہیں۔ "توحید کے بارے میں سچا راستہ مذہب وہ ہے جو قرآن میں اللہ کی صفات کے بارے میں نازل ہوا"۔ مطلب یہی ہے کہ صفات خدا کو وسیلہ بنائے بغیر نہ تو جانا جاسکتا ہے نہ پہچانا جاسکتا ہے اور نہ تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ بلکہ حقیقت معرفت اس کی صفت ہی کی حاصل کرنا ممکن ہے اور اس کی صفات کی معرفت ہی اس کی معرفت کہلاتی ہے۔ وسیلہ معرفت کو درمیان سے ہٹا کر اللہ کو گوشہ تنہائی میں۔ جنگلوں میں اور بیابانوں میں ڈھونڈتے پھرنا ایسا ہے جیسے اندھیرے میں تیر چلانا۔ التوحید صفحہ ۲۲۲۔ حدیث ۲ میں امام جعفر صادق فرماتے ہیں۔ "تمہاری دعا اس لئے قبول نہیں کی جاتی کہ تم اس کو پکارتے ہو جسے پہچانتے نہیں ہو"۔ یعنی لوگ بظاہر اللہ کو پکار رہے ہوتے ہیں لیکن چونکہ اس کی صفت تامہ سے بے خبر ہوتے ہیں اس لئے کسی اور ہی انجان خدا کو پکار رہے ہوتے ہیں۔ اس کو پکارا جائے گا تبھی اسم کے ذریعے ورنہ ہر پکار صدا بصحرا ثابت ہوگی۔

مثلِ اعلیٰ

لہٰذا نہ صرف یہ کہ وسیلہ اختیار کرنا پڑے گا بلکہ اس بات کو یقینی بنانا پڑے گا کہ وسیلہ اللہ کے شایانِ شان بھی ہو۔ یہ مشکل لوگ اس سے غلو کرتے ہیں حالانکہ یہ بات مسلّم ہے کہ تعارف کرانے والے کی شان اور اس کی شان جس کا تعارف کرایا جا رہا ہے اگر حد سے حد ہو تو بھی صحیح تعارف نہ ہو سکے گا۔ معنی اور اسم کے فرق کو چھوڑ کر صرف خصوصیات میں دونوں کا متحد ہونا محال و عجب ہے کیونکہ ناقص کے ذریعے کامل کا تعارف ہرگز نہیں کرایا جا سکتا۔

مثل اسی کو کہتے ہیں یعنی صفات میں ایک جیسا ہونا اور مثلِ اعلیٰ تو مثل بھی نہیں بلکہ مثالی ہیں۔ اب آپ بندیوں کا تصور کرتے جائیے اور جہاں یہ تصور رک جائے وہاں سے آگے بڑھنا جس کے لئے ممکن نہ رہے تو اسے اپنی حد سمجھ کر تصور کر لیجئے کہ حقیقی تعارف اپنی سطح پر کرایا جاتا ہے۔ اس سے پست سطح پر نہیں۔

امام جعفر صادقؑ نے اپنے ایک فرمان میں اسی بات کی وضاحت کی ہے۔ چنانچہ توحید صفحہ ۱۷۲ حدیث ۱۱ میں آنجناب فرماتے ہیں۔ "(اللہ) مثلِ اعلیٰ کا رب ہے اور اللہ کے لئے ایسی مثلِ اعلیٰ ہے کہ کوئی چیز اس کی مثل نہیں اور نہ اس کی تعریف کی جا سکتی ہے اور نہ وہم و خیال میں آ سکتا ہے۔ یہی ہے مثلِ اعلیٰ ہے۔ لوگوں نے اپنے رب کا وصف معمولی مثال سے بیان کیا اور اس کو مشابہ کیا۔ یہ تشبیہ اپنے جہل کی بنا پر کی"۔

معصومؑ کے اس فرمانِ ذیشان سے معلوم ہو گیا کہ جب ہم اللہ کو "رب" کہہ کر پکارتے ہیں تو اس کا مطلب کیا ہوتا ہے۔ اس کا اسم جو مشکل کشا علی ہے وہ ساری کائنات کا رب ہے اور اللہ وہ ہے جو اس مشکل کشا علی کا رب ہے۔ اور اس کا رب ہونے پر ہی وہ فخر کرتا ہے ورنہ موجوداتِ ارضی و سماوی کی ربوبیت کرنا اس کے لئے کوئی قابلِ فخر بات نہیں۔ وہ تو فخر کرتا ہے اس بات پر کہ جو وجہ عالمِ وجود کا رب ہے اللہ اس کا بھی رب ہے۔ اسی وجہ کو اس نے مختلف ناموں سے یاد کیا ہے مثلاً احمد، محمد، مصطفیٰ اور حیدر۔ اس کا مالک ہونے پر فخر کیا ہے کیونکہ یہی وہ مشکل کشا علی ہے جن کے ذریعے اللہ کی عظمت و جلالت اپنی اصل صورت میں ظہور پذیر ہوتی ہے اور یہی وہ جہت اللہ ہے جسے وجہ اللہ، ید اللہ، عین اللہ کہا جاتا ہے۔ اسی کو درمیان سے ہٹا دیا جائے تو کلمہ اللہ کوئی معنی ہی نہیں رکھتا۔

اس حدیث پر غور فرمایئے اور ہمارے مندرجہ بالا بیان کی صداقت کا اندازہ لگایئے جہاں ہم نے عرض کیا تھا کہ اللہ اپنا تعارف اپنی ہی شئے پر کرنا چاہتا ہے۔ اور اللہ کو کسی شئے سے تشبیہ نہیں دی جا سکتی تو اس کے اسم کو بھی کسی سے تشبیہ نہیں دی جا سکتی۔ کیونکہ عالمِ امکان میں کوئی شئے اس کے مشابہ ہے ہی نہیں۔ اللہ وہ ہے جس کی تعریف کی ہی نہیں جا سکتی جیسا کہ خود امیر المومنین فرماتے ہیں۔ "الحمد للہ الذی لا یبلغ مدحته القائلون"۔ (حمد ہے اس اللہ کی کہ جس کی مدح کرنے والے

جتنی مدح کر ہی نہیں سکتے)۔ یہی صورت اسم اللہ کی بھی ہے کہ اس کی مدح کا حق ادا کرنا محالات سے ہے۔ جو کوئی بھی خالق کی مدح کرتا ہے وہ اپنی حد بیان کرتا ہے نہ کہ خالق کی۔ جس طرح اللہ کا وہم خیال میں آنا ممکن نہیں ہے اسی طرح اس کے اسم کا وہم خیال و گمان میں آنا ممکن نہیں ہے۔ لیکن جو کچھ خود اس نے بتایا ہے وہی ہم دہراتے رہتے ہیں ورنہ ہمارا اپنا قول تو بس یہ ہے کہ "لا علم لنا الا ما علمتنا"۔ (اے ہمارے رب ہم تو کچھ جانتے ہی نہیں سوائے اس کے کہ جو تو نے خود ہمیں سکھا دیا ہے)۔

کب ترا دبدبہ و جاہ و حشم جانتے ہیں
ہم نہیں جانتے بس اتنا ہی ہم جانتے ہیں

مشیت اللہ

توحید صفحہ ۲۵۶۔ حدیث ا۔ امام علی رضاؑ سے پوچھا گیا کہ "اسم اللہ کو کس چیز سے پہچانیں گے؟" آپ نے جواب دیا "اس کے غیر سے"۔ پوچھا گیا کہ کونسی چیز اس کی غیر ہے؟" آپ نے فرمایا "اس کی مشیت، اس کا اسم اور اس کی صفت"۔

آپ کے ذہن میں یقیناً یہ بات محفوظ ہوگی کہ ہم وسیلہ معرفت پر گفتگو کر رہے ہیں اور اس حدیث میں بھی وسیلہ معرفت ہی کا ذکر کیا گیا ہے جن میں سب سے پہلی چیز اس کی مشیت ہے۔ بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا مکمل بیان نہیں کیا جا سکتا لیکن اگر

یہ معلوم ہوا کہ جب ہم مشیت پر غور کریں تو خالق مخلوق کی مشیت میں واضح فرق نظر آئے گا۔ ہماری مشیت ہمارے بس میں نہیں ہوتی بلا ارادہ اچانک پیدا ہوتی ہے یعنی بیٹھے بیٹھے کسی چیز کو دل چاہنے لگتا ہے۔ یہ حدوث ہے جو ذات باری تعالیٰ کے لئے جائز نہیں۔ لہذا ماننا پڑے گا کہ اس کی مشیت قدیم ہوتی ہے اور ہمیشہ سے اس کے ساتھ رہتی ہے۔ وہ پیدا نہیں ہوتی بلکہ ظاہر ہوتی ہے۔ پس اب اس مشہور حدیث کو بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے جس میں کسی نے کہا تھا کہ "میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا"۔ یہ ظاہر ہونے کا کام ہے اور کام تحت مشیت ہوتا ہے۔ لہذا یہ مشیت ہی تھی جسے خدا نے چھپایا ہوا تھا اور یہی مشیت تھی جو ظاہر ہوئی اور یہی مشیت تھی جس نے خلق کیا۔

مخلوق کی مشیت مجبور ہوتی ہے یعنی خواہش انسان چاہے ضروری نہیں کہ وہ پورے عمل میں بھی آ جائے۔ تو پھر انسان کیا کرتا ہے؟ وہ دل مار کر بیٹھ جاتا ہے لیکن اللہ کی مشیت مجبور نہیں بلکہ مختار ہے۔ بہت سے لوگ "وما تشاءون الا ان یشاء اللہ" سے یہ مراد لیتے ہیں کہ (معاذ اللہ) ہم مجبور ہیں اس کی مثال یہ ہے جب کسی کی بات نہ مانی جائے تو ان سے اف کر کے جایا سمجھایا جاتا ہے۔ اس لئے ہم کہہ رہے ہیں کہ مشیت خدا مجبور نہیں بلکہ مختار ہے۔ اسی طرح ارادہ خدا بھی مجبور نہیں بلکہ مختار ہے۔ اسی لئے معصوم نے فرمایا ہے کہ "اللہ جو چاہتا ہے تو ہم بھی وہی چاہتے ہیں اور

جو ہم چاہتے ہیں تو اللہ بھی وہی چاہتا ہے۔ اللہ جو ارادہ کرتا ہے تو ہم بھی وہی ارادہ کرتے ہیں اور ہم جو ارادہ کرتے ہیں تو اللہ بھی وہی ارادہ کرتا ہے"۔

نقلی اعتبار سے بھی مشیت ارادہ کا مختار ہونا ثابت ہے کیونکہ مدح اور ذم کا تعلق اختیار سے ہوتا ہے۔ مجبور کی نہ تو تعریف کی جاتی ہے اور نہ برائی۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ پورا قرآن بالحیث طہارت کی مدح سے بھرا ہوا ہے اور یہ مدح ثابت کرتی ہے کہ یہ مشیت مختار ہے نہ کہ مجبور۔ سورہ کہف میں حضرت موسیٰ اور انکے معلم کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ اگر اس کا مطالعہ کیا جائے تو مشیت ارادہ بخوبی سمجھ میں آتا ہے۔ جب حضرت موسیٰ اپنے معلم کے پاس پہنچتے ہیں اور ان سے تعلیم دینے کی درخواست کرتے ہیں تو وہ فرماتے ہیں۔ "اس نے (معلم موسیٰ نے) کہا کہ یقیناً تو میرے ساتھ ہرگز صبر نہیں کر سکے گا"۔ (آیت ۶۷)۔ اسکے جواب میں حضرت موسیٰ فرماتے ہیں۔

"انشاء اللہ تم مجھے صبر کرنے والا پاؤ گے"۔ (آیت ۶۹)۔ ان دو جملوں پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ حضرت موسیٰ نے "انشاء اللہ" کہا لیکن پھر بھی کہی بات غلط ثابت ہوئی اور وہ صبر نہ کر سکے۔ اسکے مقابلے میں معلم موسیٰ نے "انشاء اللہ" نہیں کہا لیکن ہوا وہی جو انہوں نے کہا تھا۔ پس ثابت ہوا کہ یہ مشیت مختار ہے مجبور نہیں۔

جب حضرت موسیٰ مسلسل تین بار ناکام ہو گئے تو انکے معلم نے کہا۔ "بس اب میرے اور تمہارے درمیان جدائی ہے۔ لو میں تمہیں ان باتوں کی حقیقت بتائے دیتا

ہوں جن پر تم صبر نہ کر سکے"۔ (آیت ۷۸)۔ "وہ جو کشتی تھی پس وہ چند مسکین لوگوں کی تھی جو دریا میں (اپنی روزی کے لئے) کام کرتے تھے۔ پس میں نے ارادہ کیا کہ اسے عیب دار کر دوں اور (یہ اس وجہ سے کیا کہ) ان کے پیچھے ایک بادشاہ تھا جو ہر کشتی کو جبراً چھین لیا کرتا تھا"۔ (آیت ۷۹)۔ "اور وہ لڑکا سو اس کے ماں باپ دونوں مومن تھے۔ پس ہمیں ڈر (واضح رہے کہ یہاں جس لفظ کا ترجمہ "ہمیں ڈر" کیا گیا ہے وہ ہے "فخشینا" اور یہ اس ڈر کو کہتے ہیں جو علم و معرفت کی وجہ سے ہو نہ کہ جہل کی وجہ سے۔ جیسا کہ سورہ فاطر میں ارشاد ہوا "انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء" یعنی ماسوا اس کے نہیں کہ اللہ سے اس کے بندوں میں سے صرف علماء ہی ڈرتے ہیں۔ اور یہ بھی واضح رہے کہ یہاں علماء سے مراد کتابی علماء نہیں بلکہ علمائے ربانی مراد ہیں یعنی صرف وہی جو اللہ کی معرفت رکھتے ہیں) کہ وہ ان دونوں کو سرکشی اور کفر میں نہ پھنسا دے۔ سو ہم نے ارادہ کیا کہ ان دونوں کا رب انھیں پاکیزگی میں اس سے اچھا اور رحمت میں زیادہ (قریب) انھیں بدل دے"۔ (آیت ۸۱)۔ "اور رہی وہ دیوار۔ پس وہ شہر کے دو یتیم لڑکوں کی تھی اور اس کے نیچے ان دونوں کے لئے خزانہ (دبا ہوا) تھا اور ان دونوں کا باپ ایک نیک مرد تھا سو تمھارے رب نے ارادہ کیا کہ وہ دونوں اپنی جوانی اور عقل و تمیز کو پہنچ جائیں اور وہ خود اپنا خزانہ نکال لیں"۔ (آیت ۸۲)۔

ان آیات میں آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ ایک مقام پر معلم موسیٰ نے فرمایا "میں نے ارادہ کیا" اور کشتی کو عیب دار بنانے کے عمل کو اپنی طرف منسوب کیا۔ دوسرے مقام پر فرمایا "ہم نے ارادہ کیا" اور لڑکا دینے کے عمل کو رب کی طرف منسوب کیا۔ یعنی معلم موسیٰ تنہا نہ تھا بلکہ باطنی ایک جماعت تھی۔ گویا یہ ایک فریق اور ان سب کا ارادہ ایک تھا۔ اور تیسرے مقام پر فرمایا "رب نے ارادہ کیا"۔ اس بیان سے سمجھ لینا چاہئے کہ یہ حضرات ارادہ کرنے میں مختار ہیں۔ یہ ارادہ کریں تو اللہ کا ارادہ ہوتا ہے اور اللہ ارادہ کرے تو ان کا ارادہ کہلاتا ہے۔

تیسری بات یہ کہ تخلیق کی مشیت غیر مرئی ہوتی ہے۔ وہ اس بات پر قدرت نہیں رکھتی کہ جسم و جسمانیت کے ساتھ ظاہر ہو جائے یعنی اللہ کی مشیت "علی کل شیء قدیر" ہے اور یہی قدرت کے ذریعے عالم خلق سے ماورا ہوتے ہوئے بھی خلق کا روپ مختص کر کے ظاہر ہو سکتی ہے۔

ایک اچھوتی حقیقت

عالم خلق کی ابتداء ایک نور سے ہوئی۔ جملہ مخلوقات خفی تخلیق ہیں یعنی ان کی تخلیق تدریجی ہوتی ہے۔ حضرت عیسیٰ امری مخلوق ہیں یعنی ان کی تخلیق تدریجی نہیں بلکہ "کن" کے ذریعے ہوئی۔ یعنی یہ نور اول مشیتی مخلوق ہے یعنی یہ مشیت سے ظاہر ہوئی۔ یعنی لوگوں کو حیرت اس وقت ہوئی جب انہوں نے دیکھا کہ اس نور مخلوق میں مشیت

خدا خود بھی چھپی بیٹھی ہے۔ اس بات کو سمجھانے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں بہتر ہے جناب جعفر الزماں صاحب کی کتاب "نخل معرفت فی اسرار حجت" جلد دوم صفحہ ۴۲۷، ۴۳۴ اور ۴۳۵ سے چند اقتباسات پیش کرتا ہوں۔ شاید اس سے حقیقت تک پہنچنے میں کچھ مدد ملے اور تخلیق کسی حد تک سمجھ سکیں۔ یہ سائنسی حقائق ہیں جو مجھ بات کی سمجھ سے بالاتر ہیں اس لئے انکار ممکن نہیں ہے۔

صفحہ ۴۲۷ پر لکھتے ہیں "جب سائنس آگے چلتی ہے تو سامنے ایک بند دروازہ نظر آتا ہے۔ جب اس دروازے کو کھولنے کی کوشش کی جاتی ہے اور وہ کھلتا ہے تو اس کے پیچھے اس اور بند دروازے نظر آتے ہیں۔ پھر جب ان میں سے ایک دروازے کو کھولا جاتا ہے تو اس کے پیچھے مزید بند دروازے نظر آتے ہیں اور انسان یہ سلسلہ حق سے دور ہوتا چلا جاتا ہے"۔

صفحہ ۴۳۴ پر ... گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "پھر ایک بند دروازہ نظر آیا۔ قریب جا کر دیکھا تو یہ بند دروازہ ایک نہیں بلکہ بارہ تھے۔ اب اس میں سے ایک دروازے کو کھولنے کی کوشش ہوئی تو سائنس نے کیا کہہ دیا ہے؟ جواب ملا کہ "زیٹا"۔ اصل قوت کا سرچشمہ زیٹا ہے۔ اصل فعال قوت زیٹا ہے۔ [illegible] کافی زیٹا ہے جو گیارہ عددوں میں خود کو چھپائے بیٹھا ہے"۔

"اس کائنات میں جو قوت فعال Active ہے وہ متعدد نہیں بلکہ وہ قوت ایک ہی

ہے صرف ہم کا ہی نہیں بلکہ کائنات کا ایک ہی مرکز ہے اور وہی فعال قوت ہے اور وہی منبع مرکز ہے جسے حاصل کرنا انتہائے عقل بشر ہے۔ یہ بھی خیال رہے کہ مرکز صرف اور صرف ایک ہی ہوتا ہے۔ کائنات کی وحدت گویا بتا رہی ہے کہ مرکز ایک ہے۔ قوت ایک ہے جو کائنات میں برسرِ عمل ہے۔ جہاں مرکز کا تصور پیدا ہو جاتا ہے وہاں دوئی کا تصور معدوم ہو جاتا ہے۔ اس حقیقت سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا کہ مرکز (نقطے) کو تصور تو کیا جا سکتا ہے مگر اس کا حواس مدرکات سے ادراک کرنا محال ہے۔" (اقتباس ختم ہوا)۔

ہم نے جو عرض کیا تھا اس کا چھوٹا سا مفہوم آپ کے ذہنوں تک ضرور پہنچ گیا ہوگا اور کثرت میں وحدت اور وحدت میں کثرت کا ایک اجمالی خاکہ ضرور سامنے آ گیا ہوگا۔ اسی سے ہم کہتے ہیں کہ علی کو ایک انسانی کائنات کے طور پر سب سے الگ رکھو اور کثرت کو علیحدہ وحدت کا انکار نہ ہو۔ شیعوں کے درمیان ساری الجھنیں اور تمام تر اختلافات اسی لئے پیدا ہوئے کہ انھوں نے وحدت و کثرت کو خلط ملط کر دیا اور علی کا موازنہ دوسروں سے کرنے لگے۔ جب تک اس کائنات کو سب سے الگ کر کے نہیں سوچا جائے گا اس وقت تک غلو اور تقصیریت کا چکر ذہنوں میں گھومتا ہی رہے گا۔ تو یہیں سے پھر قیامت تک کوئی شے بھی سمجھ میں نہیں آئے گی اور پھر دین ایک بھول بھلیاں بنا رہے گا۔

وسیلہ معرفت کے سلسلے میں ہم مزید دو احادیث بیان کر کے اپنے بیان کو سمیٹتے ہیں اور اسکے بعد دیگر موضوعات کی طرف توجہ کریں گے۔

۱۔ التوحید صفحہ ۳۵۹ حدیث ۱۔ امام علی رضاؑ نے فرمایا: "اللہ کی معرفت کا اعتراف صفت اور اسماء کے ذریعے ہوتا ہے۔ اور اللہ کی صفات اس پر دلالت کرتی ہیں اور اسکے اسماء اس کی طرف دلالت کرتے ہیں تو مخلوق کی تمام جستجو اور معلومات اسکے معنی کا ادراک نہیں کر سکتے۔"

ہم نے کشف العقائد میں عرض کیا تھا اور اب پھر اپنی بات کو دہراتے ہیں کہ انسانی عقل کی آخری حد خالق کا ادراک کرنا ہے۔ اس سے آگے بڑھنا اسکے لئے ممکن ہی نہیں۔ جو مخلوق کو وسیلہ معرفت بناتے ہیں وہ دھوکہ کھاتے رہتے ہیں انکا خدا ان کے اپنے تصور کی بنا پر وہ جس خدا کی پرستش کرتے ہیں وہ ان کی اپنی ذہنی تخلیق ہوتا ہے۔ امام نے اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ اللہ کی معرفت کا واحد ذریعہ انکی صفات اور اسکے اسماء ہیں اور جیسا کہ ہم بار بار عرض کرچکے ہیں کہ یہ صفات اور اسماء کوئی ملفوظی یا مکتوبی شے نہیں ہیں بلکہ ایک مستقل وجود خارجی رکھتے ہیں اور جب یہ عالم خلق میں ظاہر ہوتے ہیں تو جسم و جسمانیت کے ساتھ قابل رویت و مشاہدہ ہوتے ہیں اور انکی یہی خصوصیت ہے جسکے ذریعے اللہ کا مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ اس پر ایمان لایا جاتا ہے اور انکی عبادت کی جاتی ہے۔

۲۔ نہج الاسرار جلد ۱ صفحہ ۴۴۔ حضرت امیر المومنین نے فرمایا۔ "اس (اللہ) کی معرفت کسی صفت سے کی جاتی ہے۔ نقطہ صفت ہے اللہ کی اور صفت دلالت کرتی ہے موصوف پر کیونکہ اس صفت کے ظہور سے اللہ پہچانا جاتا ہے"۔

حضرت امیر المومنین کے اس فرمان سے معلوم ہوا کہ نقطہ اللہ کی صفت ہے۔ یہ ایک ناقابل تقسیم کائن ہے۔ یہی وحدت مطلقہ کا مظہر ہے۔ یہی مرکز عالم وجود ہے اور آسمانوں اور زمین کو تھامے ہوئے ہے۔ یہ جب چاہتا ہے اس کو چھپا دیتا ہے اور جب چاہتا ہے ظاہر کر دیتا ہے۔ اسی نقطے سے "کل یوم ھو فی شان" کا مطلب سمجھ میں آتا ہے۔ جناب امیر کے ارشاد سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ نقطہ جب چاہتا ہے غائب و پوشیدہ رہتا ہے اور جب چاہتا ہے ظہور کرتا ہے۔ جب یہ غائب و پوشیدہ ہوتا ہے تو عالم ہویت کا نمائندہ ہوتا ہے اور جب یہ ظاہر ہوتا ہے تو لوگوں کو اللہ کا جلوہ ظاہر اور عیاں دکھاتا ہے۔ یہ پوشیدہ ہو تو نقطہ کہلاتا ہے اور ظاہر ہو تو خط کہلاتا ہے۔ خط نقاط کے مجموعے کو کہتے ہیں یعنی اگر سلوک اور بھی واضح طریقے پر سمجھنا ہو تو یہ کہا جائے گا کہ "خط نام ہے نقطے کے بار بار ظہور کرنے کا"۔

میں نقطہ ہوں میں خط ہوں

نقطہ جب خط کی شکل میں آتا ہے تو بادی النظر میں یوں نظر آتا ہے جیسے بہت سے نقطے ہوں یعنی یہ در اصل وہی ایک نقطہ ہوتا ہے جو بار بار ظہور کرتا ہے جیسا کہ یہ نقطہ خود

فرماتا ہے۔ "جس صورت میں خدا چاہتا ہے میں منقلب ہو جاتا ہوں۔ جس نے ان صورتوں کو دیکھا مجھے دیکھا اور جس نے مجھے دیکھا اس نے انہیں دیکھا۔ ہم درحقیقت اللہ کا وہ نور ہیں جسکو نہ زوال ہے اور نہ تغیر"۔ (نجی الاسرار جلد ا صفحہ ۹۱)۔

خطبہ رجعیہ کا آغاز آپ اس طرح فرماتے ہیں۔ "یقیناً میرے لئے پلٹ پلٹ کر آنا اور بار بار رجعت کرنا ہے"۔ اسی حقیقت کے پیش نظر حضرت امیر المومنین حضرت صاحب الزمان کے ظہور کو خود اپنا ظہور قرار دیتے ہیں اور نجی الاسرار جلد ا صفحہ ۵۹ پر فرماتے ہیں۔ "میں ہی وہ ہوں جسکے پیچھے عیسیٰ نماز پڑھیں گے۔ میں جس طرح چاہوں صورتیں اختیار کر لیتا ہوں"۔ اس بارے میں چند ارشادات معصومین ہم آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

۱۔ نجی الاسرار جلد ا صفحہ ۹۲۔ حضرت امیر المومنین فرماتے ہیں۔ "اے سلمان! میں اور وہ ہادی جو میرے بعد ہیں ایک ہی ذات سے ہیں خدا کے راز مکنون اور اسکے مقرب اولیاء ہیں۔ ہم سب ایک ہیں۔ ہمارا امر ایک ہے اور ہمارا راز ایک ہے۔ پس ہم میں تفرقہ نہ ڈالو ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے۔ ہم ہر زمانے میں حسب مشیت رحمانی ظاہر ہوتے ہیں"۔ یہاں سے معلوم ہوا کہ یہ بارہ کے بارہ علی ہیں۔

۲۔ تفسیر فرات صفحہ ۲۶۔ حضرت امیر المومنین نے فرمایا۔ "میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بارہا جب پیش ہوا اس نے مجھے اپنی ذات کی معرفت عطا کی اور غیب کی کنجیاں مجھے

دیں"۔

اس فرمان کا مطلب ہی یہ ہے کہ غدیر ایک ہی تھا جس نے ذات خداوندی سے بڑھ کر مرتبہ مخصوص کر لیا۔

۳۔ توحید صفحہ ۸۔ حدیث ۲۔ امام محمد باقرؑ نے فرمایا "ہم ہیں وہ مثانی جنہیں اللہ نے ہمارے نبی کو عطا کیا ہے اور ہم ہی وہ وجہ اللہ ہیں جو تمہارے درمیان روپ بدل بدل کر آتے ہیں۔ جس نے ہمیں پہچان لیا یا نہ پہچانا اور جو ہم سے ناواقف رہا تو اس کے سامنے یقیناً موت ہے"۔

اللہ کا ہاتھ

ہاتھ سے مقصود ہے چار چیزوں کا۔ خلق۔ قدرت۔ تصرف اور رزقیت۔ ہمارے ذاکرین اور اکثر پیشہ ور علی کی شان بیان کرتے ہوئے ید اللہ کا ذکر کرتے ہیں اور سامعین یہ سن کر اپنے نعروں سے آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں۔ لیکن اگر علی کو خالق، قادر، رازق کہہ دے تو یہی آسمان سر پر اٹھانے والے فوراً غلو کا فتویٰ صادر فرما دیتے ہیں۔ یہ عنوان ہم نے اس لئے قائم کیا ہے کہ جو شخص بھی علی کو ید اللہ مانتا ہے تو اس کے لئے لازم ہے کہ ید اللہ کے معنی بھی سمجھے اور پھر علی کو وہی سمجھا جائے جو ید اللہ کے معنی ہیں ورنہ ذاکرین کو ذریعہ تجارت اور مجالس کو مشاعرہ بنانا مقصود ہو تو اور بات ہے۔

خلق

اس سے قبل آپ یہ جان چکے کہ علی اللہ کا علم ہے تو اب یہ بھی جان لیجئے کہ علم ہی سرچشمہ تخلیق ہے۔ یہی علم خدا تھا جو مشیت خدا کے روپ میں ظاہر ہوا اور سمند خلق کی لگام پر ہاتھ ڈالا اور اسی سے ابتداء خلق ہوئی۔ یہ مشیت خود علم خدا سے ظاہر ہوئی اور باقی عالم امکان مشیت کے ہاتھوں خلق ہوا۔ اسی فرق کو واضح کرنے کے لئے توحید صفحہ ۱۰۷، حدیث ۵ میں امام حسنؑ فرماتے ہیں: ''وہ اشیاء جو اس نے اپنی مشیت سے فنا کے لئے خلق کی ہیں معدوم ہو جائیں گی اور وہ چیزیں باقی رہیں گی جو اس نے اپنے علم سے بقا کے لئے بنائی ہیں''۔

جب علی کے لئے علم خدا اور مشیت خدا ہونا ثابت ہے تو ایک خالق کل ہونے کا انکار درحقیقت اللہ کی خدائیت کا انکار کرنا ہے کیونکہ خلق بالحق اسی سے کیا جاتا ہے۔

روم ۸۔ ''کیا انھوں نے اپنے دلوں میں غور نہیں کیا کہ نہیں پیدا کیا اللہ نے آسمانوں اور زمین کو اور جو ان دونوں کے درمیان ہے مگر حق کے ساتھ''۔

ہم نے بہت سی آیات قرآن سے نقل کیا ہے جہاں ''بالحق'' کا ترجمہ ''حق کے ساتھ'' کیا گیا ہے۔ کیا یہی کیا گیا ہے یہ ترجمہ کرنے والے ہی بہتر جانتے ہوں گے۔ ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ مترجمین و مفسرین ہمیشہ دباؤ میں رہے ہیں۔ خواہ حکومتوں کا دباؤ ہو یا معاشرے کا۔ لغت میں ''ب'' کے معنی ہیں

ہے۔ ساتھ، قسم، مدد اور ذریعہ وغیرہ۔ اس مقام پر "ب" کا ترجمہ "ساتھ" کرنا ناقابل فہم ہے۔ اگر اس ترجمے کو صحیح مان لیا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہر مخلوق حق کے ساتھ ہے یہاں تک کہ کافرین، منافقین، منکرین، معاندین کے بارے میں بھی یہ ماننا پڑے گا کہ وہ حق کے ساتھ ہیں یہاں تک کہ شیطان کو بھی حق کے ساتھ ماننا پڑ جائے گا کیونکہ وہ بھی بہر حال اللہ کی مخلوق ہے جو سراسر خلاف عقل و حقیقت ہے۔ یہاں "ب" کا کوئی ترجمہ ممکن ہی نہیں ہے سوائے "ذریعہ" کے اور اب آیت کا ترجمہ یوں ہوگا کہ اللہ نے پوری کائنات کو حق کے ذریعے پیدا کیا اور ہم کشف الاعتقاد میں متعدد قرآنی آیات اور احادیث معصومین سے یہ ثابت کر چکے ہیں کہ حق نام ہے میرے مولا علی ابن ابی طالب کا۔ ان تمام شواہد کا اعادہ غیر ضروری ہوگا اور طوالت کا سبب بنے گا اور ذہنوں پر بار ہوگا لہٰذا انہیں کشف الاعتقاد میں ہی ملاحظہ فرمایا جائے۔ حضرت امیر المومنین جب خلافت ظاہری پر متمکن ہوئے اور پہلی بار منبر خلافت کو شرف بخشا تو پہلا جملہ یہی ارشاد فرمایا کہ "حق آگیا اور باطل بھاگ گیا اور باطل تو تھا ہی بھاگنے والا"۔ لہٰذا مذکورہ آیت کا واحد ترجمہ یہ ہے کہ اللہ نے پوری کائنات کو علی کے ذریعے خلق کیا اور جناب امیر المومنین "کرتا میں ہوں کہتا کا ہے"۔ اسی کی توثیق ذیل کی روایت سے بخوبی ہو جاتی ہے۔

۲۔ کتاب الامر جلد ا صفحہ ۲۲۷۔ جناب امیر نے فرمایا۔ "اے عمار! کائنات اور اشیاء کی تکمیل میرے علم سے ہوئی۔ میرے علم کے ساتھ تمام انبیاء کو مدد دیا گیا"۔

اس حدیث کے دوسرے ٹکڑے کی مختصر توضیح کرنا ضروری ہے کیونکہ اس پر آج تک بہت کم توجہ دی گئی ہے۔

نبی اور رسول

امت مسلمہ میں ''نبی'' اور ''رسول'' کے بارے میں شدید غلط فہمی پائی جاتی ہے اور یہ نتیجہ ہے اس اختلاف مفہوم کا جو بعض الفاظ کے لئے قرآن و حدیث میں پایا جاتا ہے۔ اس کی ایک مثال ہم نے کشف المسائل میں پیش کی تھی اور وہ تھا لفظ ''شہید''۔ قرآن میں یہ لفظ جہاں جہاں بھی استعمال ہوا ہے اپنے لغوی معنی ہی میں ہوا ہے یعنی ''چشم دید گواہ'' اور متعدد مقامات پر اللہ نے خود کو بھی شہید کہا ہے۔ جبکہ حدیث کی زبان میں آ کر اس لفظ کا مفہوم بدل گیا اور وہاں اس کے معنی ہو گئے ''مقتول فی سبیل اللہ''۔ یہی حال لفظ ''رسول'' کا بھی ہے۔ قرآن میں یہ لفظ ہر اس شخص کے لئے استعمال ہوا ہے جسے اللہ نے کسی اور کی طرف کسی خاص مقصد کے لئے بھیجا ہو اور اس میں عام آدمی، فرشتے اور انبیاء سب ہی شامل ہیں۔ لیکن ضرورت شرعی کے تحت حدیث میں بعض مقامات پر یہ لفظ انبیاء کے لئے خصوصی طور پر استعمال کیا گیا جس سے لوگوں نے یہ تاثر لیا کہ رسول کے لئے نبی ہونا شرط ہے حالانکہ یہ سراسر تکذیب قرآن ہے جیسا کہ مندرجہ ذیل آیات سے ظاہر ہو گا۔

۔ ہود ۷۷ ''اور جب ہمارے رسول (فرشتے) لوط کے پاس آئے تو ان سے غمگین ہوا

سے [illegible] پہنچا [illegible] ں"۔

۲۔ہود ۸۱: "وہ (فرشتے) بولے اے لوط ہم تیرے رب کے رسول ہیں"۔

۳۔حجر ۶۱: "پس جب اللہ کے رسول آل لوط کے پاس آئے [illegible] ں"۔

۴۔حج ۷۵: "اللہ فرشتوں اور انسانوں میں سے رسولوں کو چھانٹ لیتا ہے [illegible] ں"۔

۵۔فاطر ۱: "الحمد اللہ ہی کے لیے ہے۔(وہ) آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والا، فرشتوں کو رسول بنانے والا ہے"۔

ان تمام آیات سے ثابت ہو گیا کہ رسول کے لیے نبی ہونا ضروری نہیں ہے۔ اللہ نے بھی قرآن میں حضرت محمدؐ کی مرتبت کو خاتم النبیین کہا ہے۔ خاتم المرسلین کسی بھی مقام پر بھی نہیں کہا۔ یہ حقیقت ہے کہ عقیدہ ختم نبوت ضروریات دین سے ہے اور اس کا انکار کرنے والا یقینا کافر ہے لیکن مسلمانوں کی بربادی اس وقت شروع ہوئی جب وہ ٹکڑیوں میں تقسیم ہوئے اور ان پر ذلت و مسکنت اس وقت طاری ہوئی جب انھوں نے خود اپنے دل سے فرض کر کے اپنے باطل اور مذموم مقاصد کو پورا کرنے کے لیے ختم نبوت کے ساتھ ساتھ ختم رسالت کا نظریہ بھی بنا لیا۔ ایسا کر کے انھوں نے خود پر ہدایت کے دروازوں کو بند کر لیا اور فیض خداوندی کے سلسلے کو منقطع کر دیا اور اس طرح پورے دین کو مشتبہ بنا کر رکھ دیا کہ اب کوئی اس بات کا فیصلہ کرنے والا باقی نہ

دیا کہ تحقیق کیا جائے ورنہ خطا کیا۔ ختم رسالت کا عقیدہ کسی بھی نہج سے معقول نہیں ہوسکتا کیونکہ اگر ائمہ معصومین کو رسول نہ مانا گیا تو ان کا منجانب اللہ ہونا ہی ثابت نہیں ہوتا اور جب (معاذ اللہ) ان کی امامت ہی باطل قرار پاتی ہے۔

اس سلسلے میں ہم چند مزید شواہد پیش کرتے ہیں تا کہ شک و شبہ کی گنجائش باقی نہ رہے۔

سورۂ نساء ۱۵۰۔۱۵۱ "بیشک جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرنے والے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے مرسلین کے درمیان (معاملہ منقطع کرکے) فرق ڈال دیں اور وہ کہتے ہیں کہ ہم بعض رسولوں (انبیاء مرسلین) پر ایمان لاتے ہیں اور بعض (ائمہ مرسلین) کا انکار کرتے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ درمیانی راستہ (انبیاء مرسلین کا اقرار اور ائمہ مرسلین کے انکار کا) اختیار کریں وہ لوگ حقیقی کافر ہیں اور ہم نے ان کافروں کے لئے ذلیل کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے"۔

تفسیر قمی جلد ۱ صفحہ ۱۵۷ اس آیت کی تفسیر میں مولا فرماتے ہیں۔ "یہ وہ لوگ ہیں جو رسول اللہ کا اقرار کرتے ہیں اور حضرت امیر المؤمنین کا انکار کرنے والے ہیں"۔

(موجودہ کتاب صفحہ ۳۵)۔

۲۔ کمال الدین و تمام النعمہ صفحہ ۳۳۷ حدیث ۱۰ امام محمد باقرؑ نے فرمایا۔ "جب ہمارا قائم قیام کریں گے تو کہیں گے کہ میں تم لوگوں سے حکم خدا تمہارے خوف کی وجہ سے غائب ہو گیا تھا۔ اب اللہ کا حکم میرے پاس پہنچ گیا ہے اور اس نے مجھے مرسلین میں

سے قرار دیا ہے"۔

مناقب ابن شہر آشوب شیعوں کی مشہور و معروف کتاب ہے اور شیعہ مذہب میں ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ اردو میں اس کا ترجمہ دو بزرگوں نے کیا ہے۔ مولانا ظفر حسن صاحب (مترجم اصول کافی) نے اپنے ترجمے کا نام "مجمع الفضائل" رکھا ہے۔ دوسرا ترجمہ مولانا ملک محمد شریف صاحب نے کیا ہے اور اس کا نام "عمدۃ المطالب" رکھا ہے۔ ہم دونوں کتابوں سے احادیث پیش کر رہے ہیں تاکہ یہ گمان نہ کیا جا سکے کہ ترجمے میں کوئی غلطی ہوگئی ہے کیونکہ دونوں علماء نے الگ الگ ترجمہ کیا ہے اور یہ ممکن نہیں کہ دونوں نے بیک وقت غلط ترجمہ کردیا ہو۔

۳۔ مجمع الفضائل جلد ۲ صفحہ ۲۰۰، ۲۰۹۔ عمدۃ المطالب جلد ۱ صفحہ ۳۳۶۔

رسول اللہ نے فرمایا۔ "شب معراج خداوند عالم نے مجھے علیؑ کے بارے میں تین باتوں کی وحی کی ہے کہ وہ امام المتقین، سید المرسلین اور قائد الغر المحجلین ہیں"۔

۴۔ عمدۃ المطالب جلد ۱ صفحہ ۳۳۶ (یہ پہلی حدیث کے علاوہ ہے)۔

رسول اللہ نے فرمایا۔ "یا علیؑ تم سید المرسلین، امام المتقین، قائد الغر المحجلین اور یعسوب المومنین ہو"۔

یہ تمام وضاحت ہم نے اس لئے کی تاکہ ہم حضرت امیر المومنین کے فرمان کے آخری حصے پر کچھ روشنی ڈال سکیں جس میں آپ فرماتے ہیں۔ "میرے ہم

کے ساتھ تمام نبیوں کو مدعو کیا گیا۔ اور یہ اشارہ ہے دو آیات کی طرف۔

(الف)۔ آل عمران ۸۱۔ "(اس وقت کو یاد کرو) جب کہ اللہ نے تمام نبیوں سے میثاق لیا تھا کہ یقیناً ہم نے تم کو کتاب و حکمت عطا کی ہے۔ پھر تمھاری طرف وہ رسول آئے گا جو تمھاری تصدیق کرے گا لہٰذا تم پر لازم ہے کہ اس پر ایمان لاؤ اور اس کی مدد کرو۔ اللہ نے کہا کہ کیا تم نے میرا عہد و پیمان قبول کیا؟ انھوں نے کہا کہ ہاں ہم نے اقرار کیا تو فرمایا کہ ایک دوسرے پر گواہ رہو اور میں تم پر گواہ ہوں"۔

(ب)۔ احزاب ۷۔۸ "اور (اے رسول اس وقت یاد کرو) جب کہ ہم نے نبیوں سے اور تجھ سے اور نوح سے اور ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ ابن مریم سے میثاق لیا اور ہم نے ان سے پکا عہد لیا تا کہ وہ سچوں سے ان کی سچائی کے بارے میں سوال کرے اور اس نے کافروں کے لئے دردناک عذاب تیار کیا ہوا ہے"۔

پہلی آیت پر جب ہم غور کرتے ہیں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اللہ نے یہ عہد لیا ہے تمام انبیاء سے۔ جب کسی چیز پر لفظ کل کا اطلاق ہوتا ہے وہ سب اس عہد میں شامل ہے یعنی اللہ نے اس آیت میں کسی بھی قسم کا استثنیٰ روا نہیں رکھا۔ اور سورۂ احزاب کی آیت سے اس بات کی مزید توثیق ہو جاتی ہے۔ اور یہ عہد لیا گیا ایک رسول کے متعلق جو یقیناً نبی نہیں ہے ورنہ وہ بھی عہد لئے جانے والوں میں شامل ہوتا۔

کی بات تو باطل ہو، شخص ہے جس میں دلیل و حجت کی گنجائش ہے ہی نہیں۔ لیکن وہ مسلمان ہی کیوں کہلائے جو فرمانِ خدا کو جوں کا توں قبول کرلے۔ چنانچہ جب شروع ہوتی ہے مسلمانوں کے گھر کی، اونچ نیچ کی حکایت۔ غیروں کا تو میں نے کبھی ذکر کیا ہے اور نہ اب کروں گا لیکن اس آیت کے سلسلے میں شیعہ علماء و خطباء کا نظریہ قابلِ دید ہے۔ یہ ایک لوکل، دلچسپ کہانی ہے، اگر اجازت ہو تو سناؤں؟

اول تو اس اہم ترین آیت کی طرف توجہ ہی نہیں کی جاتی، اور اگر قرآنوں میں اسے تفسیر کے قابل سمجھا ہی نہیں گیا۔ البتہ ہمارے بڑے بڑے علماء اور خطباء جب کبھی حضرت صاحب الزمانؑ کے بارے میں تقاریر فرماتے ہیں تو یہ وضاحت فرماتے ہیں کہ رسول سے مراد حضرت ختمی مرتبتؐ ہیں اور ان کے نمائندے ہیں ہمارے امام زمانہ۔ اور انبیاء کے نمائندے ہیں جناب عیسیٰ۔ پس جب امام ظہور فرمائیں گے تو حضرت عیسیٰ بھی نازل ہوں گے اور تمام انبیاء کی طرف سے (For & On behalf of) امام کی بیعت بھی کریں گے اور نصرت بھی۔ یہ بڑے کمال کی بات ہے۔ میں سید نشاء کا حصہ تو نہیں پڑھوں گا لیکن تناظر و ربوں کا کہ وہ کتنی بڑی دور کی سوجھی لائے۔ حالانکہ اگر آپ آیت پڑھیں تو سارا معاملہ آپ کی سمجھ میں آجائے گا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ حضرت ختمی مرتبتؐ کسی ایک نبی کے زمانے میں بھی مبعوث برسالت نہیں ہوئے ورنہ ہی آنحضرتؐ کے زمانے میں انبیاء کو دوبارہ زندہ کیا گیا۔ اس لئے کسی ایک نبی

کیسے بھی یہ بات ممکن نہ تھی کہ آپ پر ایمان لا سکے اور آپ کی نصرت کر سکے۔ اور اللہ کی کوئی بھی تکلیف مالایطاق نہیں۔ پتا چلا آیت کا لب ولہجہ اور عہد کی شدت بتا رہی ہے۔ کہ ہر رسول پر ایمان لانا اور ان کی نصرت کرنا ہر نبی پر فرض واجب تھا کیونکہ وہ ایک دوسرے سے پہلے آ چکے تھے لیکن ہر ایک کو آگاہی دی جاتی تھی کہ دوسروں نے اس عہد کو پورا کیا ہے۔ مگر انسانی ذہن کی جولانی کی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔ لوگوں نے اس "مصاحب عیسیٰ" کو "مصاحب ثانی" میں تبدیل کر دیا۔ حالانکہ تمام انبیاء تو مر چکے ہیں اور کیسے حضرت عیسیٰ پیچھے رہ گئے کہ وہی مدد کریں اور وہی بچے ہیں۔ آپ خود ہی سوچ لیں کہ یہ ساری جد و جہد کس لئے کی گئی؟ اس کا واحد مقصد حضرت امیر المومنینؑ کی فضیلت کو چھپانا اور اللہ کے چہرے پر نقاب ڈالنا ہے۔

ہمارا فرض تھا کہ ہم مترجمان قرآن کی طرف رجوع کرتے تو اچھا تھا۔ یہ کوئی زحمت کا کام تو نہیں ہے۔ ہم یہاں صرف چند شواہد پیش کرتے ہیں تاکہ بات سمجھ میں آ جائے۔

۱۔ شہادت ولایت علی صفحہ ۹۲۔ امام محمد باقرؑ ان آیات کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔ "اللہ نے انبیاء سے ولایت علیؑ کا میثاق لیا تھا"۔

۲۔ حق الیقین جلد ۲۔ صفحہ ۱۸۔ امام محمد باقرؑ سے روایت ہے کہ جناب امیر المومنینؑ نے فرمایا۔ "جب اللہ نے انبیاء کی روحیں پیدا کیں تو ان سے عہد و پیمان لیا کہ تم میرے

ایمان لائیں اور ہماری مدد کریں"۔

۳۔ حق الیقین جلد ۲ صفحہ ۷۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: "انبیاء رجعت میں جناب امیر المومنینؑ کی نصرت کریں گے"۔

۴۔ اسی کتاب کے صفحہ ۸ پر حضرت امیر المومنینؑ ارشاد فرماتے ہیں: "بیشک اللہ نے مجھ سے اور محمدؐ سے عہد لیا کہ ایک دوسرے کی مدد کریں۔ بیشک میں نے محمدؐ کی مدد کی اور آپ کے روبرو جہاد کیا اور میں نے اس عہد و پیمان کو آنحضرت کی نصرت میں اللہ کی خوشنودی کے لئے پورا کیا لیکن ابھی انبیاء اور رسولوں میں سے کسی ایک نے بھی میری مدد نہیں کی ہے۔ مگر اس کے بعد رجعت میں میری مدد کریں گے۔ اس وقت مشرق و مغرب کے درمیان تمام ریاست میری ہوگی اور یقیناً اللہ آدم سے لیکر خاتم تک سب کو مبعوث کرے گا۔ جس قدر انبیاء و رسول ہوئے ہیں میرے روبرو ۔۔۔ تمام انبیاء، تمام جن و انس میں سے زندوں اور مردوں کے سروں پر جو اس وقت زندہ ہوئے ہوں گے تلواریں ماریں گے"۔

۵۔ مفاتیح الجنان صفحہ ۱۰۰۸، زیارت امام زمانہ کا ایک جملہ یہ ہے: "سلام ہو آپ پر اے اللہ کے وہ میثاق جو اس نے باندھا اور پکا کیا"۔

ہم "ید اللہ" کے حوالے سے حضرت علیؑ پر گفتگو کر رہے ہیں اور اس سلسلے میں دو شواہد پیش کر چکے اور اب تیسری دلیل پیش خدمت ہے۔

۳۔ ص ۷۵ ''(اللہ نے کہا) اے ابلیس کس چیز نے تجھے اسکو سجدہ کرنے سے روکا جسے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا ہے''۔

پس خلق کا تعلق یقیناً اللہ کے ہاتھ سے ہے اور یہی حقیقی خلاق کون و مکاں ہے۔ رہا اللہ کے دو ہاتھوں کا سوال سو اس پر بھی ہم ایک مختصر گفتگو کریں گے۔

قدرت و تصرف

ہاتھ سے مراد ہے قدرت و تصرف کا۔ پس جو بھی اللہ کا ہاتھ ہوگا وہ تصرف میں برحق ہوگا۔ اس کی قدرت و تصرف میں شک کرنا یا حیرت میں پڑ جانا یا کسی شے میں تقسیم کرنا اور یہ کہنا کہ وہ یہ کام کر سکتا ہے اور یہ نہیں حقیقتاً اللہ کو مجبور و عاجز ماننے کے مترادف ہے۔ ان باتوں کو معمولی سمجھنا اور علی کے بارے میں غیر حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کرنا کیونکہ توحید پر جا کر ختم ہوتا ہے لہٰذا انتہائی احتیاط لازم ہے۔ یہاں ہم اللہ کے ہاتھوں کی قدرت و تصرف کی ایک جھلک دکھاتے ہیں۔ اسکو سمجھنا اور اس کا تجزیہ کرنا خود آپکا کام ہے۔ لیکن پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم ایک لفظی وضاحت کر دیں اور وہ ہے ''ملکوت''۔ عام طور پر اسے ملک کی جمع سمجھا جاتا ہے حالانکہ ملک کی جمع ملائکہ ہے نہ کہ ملکوت۔ بلکہ یہ جمع ہے ''ملک'' کی۔ جسکے معنی ہیں قوت۔ پوری کائنات میں جتنی بھی قوتیں کام کر رہی ہیں انکو ملکوت کہتے ہیں۔ سائنس کی زبان میں انہیں زمان۔ مکان و توانائی (Time-Space-Energy) کہتے ہیں۔ یہ قوتیں اللہ

ہوں تو عالم، جو ہمیشہ زمان کے لئے بھی باقی نہیں رہتا اور ہمارا مقصود یہی ہے۔ صحیح معنا یہ ہے کہ ان تمام قوتوں کا مالک کون ہے۔

۱۔ یٰسین ۸۳۔ "پس پاک ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں ہر شے کا ملکوت ہے"۔

۲۔ مومنون ۸۸۔ "(اے رسول) تم پوچھو کہ اگر تم جانتے ہو تو بتاؤ کہ ہر چیز کی ملکوت کس کے ہاتھ میں ہے"۔

ان دونوں آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ پورا عالم کون و مکان خالق کی مٹھی میں ہے یعنی وہ اللہ کا ہاتھ ہے اور کوئی بھی شے اس سے طلب کی جاتی ہے جس کے قبضے میں وہ ہو۔ لہٰذا جب بھی کوئی دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو ہر شے جو مطلوب ہو وہ خالق ہی سے مانگے۔ "بیدہ ملکوت کل شیء"۔

۳۔ زمر ۶۷۔ "اور انہوں نے اللہ کی قدر نہیں کی جیسا کہ اس کا حق ہے کی قدر کرنے کا۔ اور قیامت کے دن ساری زمین اس کے قبضے میں ہوگی اور آسمان لپٹے ہوئے اس کے ہاتھ میں ہوں گے۔ پاک اور بلند و برتر ہے وہ ان چیزوں سے جن کو یہ شریک ٹھہراتے ہیں"۔

یہ ایک عظیم الشان آیت ہے۔ اس پر اگر تھوڑا سا بھی تدبر کیا جائے تو عقول سے بہت سے حجابات اٹھ جائیں گے۔

سب سے پہلے جس بات پر غور کرنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اس آیت میں

"اللہ" سے کون مراد ہے؟ اور اللہ کی قدر کرنے کا کیا مطلب ہے؟ کیا کبھی اللہ کسی کے گھر مہمان ہوا ہے کہ اس کی قدر نہیں کی گئی؟ کیا اللہ کبھی ظاہر بظاہر سامنے آیا ہے کہ اس کی قدر نہیں کی گئی؟ کیا کبھی کسی نے اللہ کو اس کے حق سے محروم کیا ہے کہ اس کی قدر نہیں کی گئی؟ کیا کبھی کسی نے اللہ کی شان کا انکار کیا ہے کہ اس کی قدر نہیں کی گئی؟ ہمیں سوچنا چاہئے کہ وہ کون اللہ ہے جس کی ناقدری کی گئی ہے! اس اللہ کی وضاحت آیت کا اگلا جملہ کر رہا ہے۔ "اور قیامت کے دن ساری زمین اسی کے قبضے میں ہوگی"۔ ہمارا سوال یہ ہے کہ کیا قیامت سے پہلے ساری زمین اس کے قبضے میں نہ تھی؟ پھر یہ قیامت کی تخصیص کیوں؟ یہ جملہ تو ایسے شخص کے لئے بولا جا سکتا ہے جس سے زندگانی دنیا میں زمین چھین لی گئی ہو اور اسے محروم کر دیا گیا ہو اور اس کی زمین پر ناجائز قبضہ کر لیا گیا ہو۔ اللہ کے لئے تو یہ جملہ بولا ہی نہیں جا سکتا۔ بغور سوچئے کہ وہ اللہ کون ہے جس کا حق صرف اس کی حیات ظاہری میں غصب کر لیا گیا تھا؟ اور اگر اب بھی وہ اللہ نظر نہیں آیا تو ہم حضرت امیر المومنین کا فرمان ایک بار پھر نقل کرتے ہیں جو سطور بالا میں پیش کیا جا چکا ہے اور جس میں آپ فرماتے ہیں۔ "اس وقت مشرق و مغرب کے مابین تمام زمین میری ہوگی"۔

اس کی مزید توضیح کے لئے ہم سورہ مومن کی آیت ۱۶ آپ کی خدمت میں ہدیہ کرتے ہیں جس میں ارشاد رب العزت ہوتا ہے۔ "جس دن وہ (قبروں سے) نکل پڑے

ہوں گے کوئی چیز اللہ پر پوشیدہ نہ ہوگی (آواز دی جائے گی) آج کے دن حکومت کس کی ہے؟ (جواب دیا جائے گا) اللہ کی جو واحد قہار ہے"۔

یہاں پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا آج اللہ کی حکومت نہیں ہے؟ پھر یہ "آج کے دن" کی تخصیص کیا معنی رکھتی ہے؟ معلوم ہوا کہ اس آیت میں "اللہ" سے مراد وہ ہے جسے زمین میں مزدور بنا دیا گیا تھا۔ اس سے اللہ کا حق حکمرانی غصب کر لیا گیا تھا۔ لیکن جب اللہ کا وارث ظہور فرمائے گا تب سوال کیا جائے گا کہ بتاؤ آج کس کی حکومت ہے؟ وہاں کہاں گئی تمہاری طرم خانی؟ کہاں ہیں تمہاری عالی شان کوٹھیاں؟ وہاں کہاں گئے تمہارے بلند و بالا محلات؟ اسی لئے یہاں اللہ نے صفت "قہاریت" کا ذکر کیا ہے۔ دنیا نے ابھی اللہ کا قہر دیکھا ہی کہاں ہے! اب تک تو وہ اس کی رحمانیت ہی دیکھتے آئے ہیں۔ اللہ کا قہر تو تب ہی دکھائی دے گا جب اس کے اسم "قہار" کا ظہور ہوگا۔ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ۔

اختصار کی وجہ سے ہمیں بہت کافی چھوڑ دینا پڑا ورنہ اس موضوع پر تو دفتر کے دفتر لکھے جا سکتے ہیں۔ لیکن یہ خیال ہمیشہ ہمیں تفصیل سے روکے رکھتا ہے کہ کہیں ہمارے قارئین کی نظروں سے اصل موضوع نہ اوجھل ہو جائے۔

"آسمان اس کے داہنے ہاتھ میں لپیٹے ہوئے ہوں گے"۔

یہ ایک عجیب و غریب جملہ ہے ذیلی تفصیل میں جائے بغیر بھی اللہ کے ہاتھ کی قوت اور تصرف کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ خاص طور پر لفظ "داہنے ہاتھ" توجہ کو کھینچتا ہے اور

ذہن فوراً اس حقیقت تک پہنچتا ہے کہ جب بایاں ہاتھ ہے تو یقیناً دایاں ہاتھ بھی ضرور ہوگا۔ چونکہ یہ تو طے ہے کہ اللہ کے دو ہاتھ ہیں جیسا کہ سورۂ ص میں ذکر ہے۔ دائیں ہاتھ کو تو ہم صاف صاف پہچان رہے ہیں لیکن یہ بایاں ہاتھ کون ہے؟ یہ مسلمہ ہے کہ دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر فضیلت حاصل ہوتی ہے اور یہ بایاں ہاتھ وہی ہوتا ہے جو دائیں ہاتھ کا محکوم ہو۔ قرآن نے فیصلہ دے دیا کہ الرجال قوامون علی النساء۔ یعنی مرد کو عورت کا حاکم بنایا گیا ہے۔ جب اللہ نے اپنے دونوں ہاتھوں کو دنیا میں بھیجا تو دونوں کی پہچان کرانے کے لئے ایک کو حاکم بنایا اور دوسرے کو محکوم تاکہ دنیا جان لے کہ دایاں ہاتھ کون ہے اور بایاں ہاتھ کون۔ انہی دو ہاتھوں کو اللہ نے سورۂ رحمٰن میں "دو سمندر" کہا ہے جو ایک دوسرے سے ملاقات کرتے ہیں۔ اور یہ دونوں اس قدر طاقتور سمندر ہیں کہ اگر برزخ (جناب ختمی مرتبتؐ) درمیان میں نہ ہو تو یہ ایک دوسرے پر غالب آنے کی کوشش کریں۔ لیکن حضرت ختمی مرتبتؐ کی وساطت سے زن و شوہر کے رشتے میں منسلک ہو جانے سے تعین فضیلت ہو گیا اس لئے دونوں سمندروں میں کوئی ہم آہنگی نہیں بلکہ باہم حسب محبت کا اظہار ہوتا ہے۔

۴۔ مفاتیح الجنان صفحہ ۸۴ "اے معبود امیر کی مہار تیرے ہاتھ میں ہے"۔

اس جملے سے سمجھا جا سکتا ہے کہ ہمارے جسم و جان کا مالک کون ہے۔ گھوڑے کی مہار

کے سہارے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ وہ اسے جب چاہتا ہے اور جس طرف چاہے موڑ سکتا ہے۔ جس چال سے چاہے اسے چلا سکتا ہے۔ اسی کی مرضی ہے کہ جب چاہے اسے چلائے اور جب چاہے روک دے۔ اس دعا کا مطلب یہ ہے کہ علی نہیں جس حال میں رکھے ہم اس حال میں خوش ہیں۔ اس بات کو واضح کرنا چاہتے کہ جب ایک شے ہے اور رضی و خوشنودی اسی کی ہے۔ ہم پر مصیبت ان کی وجہ سے جو مصیبتیں پڑتی ہیں ان پر ہم صبر نہیں کرتے بلکہ خوش ہوتے ہیں کہ جس میں وہ اور وہ لوگ خوش اس میں ہم بھی خوش۔

رزّاقیت

باقی مستقل رہ گیا رزاقیت کا مسئلہ مطابق تحریر کیا جاتا ہے۔

۱۔ حدید ۲۹۔ ''یقیناً فضل اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور اللہ فضل عظیم والا ہے''۔

۲۔ مائدہ ۶۴۔ ''اور یہود نے کہا کہ اللہ کا ہاتھ بندھا ہوا ہے۔ ان ہی کے ہاتھ بندھے گئے اور جو کچھ انھوں نے کہا اس کے سبب سے ان پر لعنت کی گئی۔ بلکہ اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں۔ جس طرح چاہتا ہے خرچ کرتا ہے''۔

اس آیت سے جہاں دست خدا کی رزاقیت ثابت ہوتی ہے وہیں یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ علی کی رزاقیت کا انکار کرنے والوں پر اللہ نے لعنت بھیجی ہے۔ اور ہم بھی

پیٹ کے ہوؤں سے بچے رہیں۔

عین اللہ

عین یعنی "آنکھ" استعارہ ہے حفاظت اور نگرانی کرنے کا۔ اس لئے ذیل میں جو آیت بیان کی جا رہی ہیں مترجم نے ان میں "عین" کا ترجمہ "ہماری نگرانی میں" کیا ہے۔

۱۔ ہود ۳۷: "اور (اے نوح) تو ہماری نگرانی میں اور ہماری وحی کے مطابق ایک کشتی بنا"۔

حضرت نوح پیشے کے اعتبار سے بڑھئی نہیں تھے لیکن باوجود اس کے انھوں نے ایک بڑی عظیم کشتی بنائی جس نے تاریخ کے سب سے ہیبت ناک طوفان کو زیر کر دیا۔ یہ کشتی کیسے بنی؟ وحی صحیح طریقہ بتاتی جا رہی تھی اور اللہ کی آنکھ اس کی نگرانی و حفاظت کر رہی تھی۔ اسی لئے اللہ کی اس نگرانی پر آنکھ نے ارشاد فرمایا "ہم نے ہی نوح کی کشتی کو طوفان سے بچایا"۔

۲۔ قمر ۱۴: "وہ (کشتی) ہماری نگرانی میں چلتی رہی"۔

معلوم ہوا کہ کشتی نوح بنی بھی عین اللہ کی نگرانی میں اور چلی بھی اسی کی نگرانی میں۔ اسی طرح طٰہٰ ۳۹ سے پتا چلتا ہے کہ حضرت موسیٰ کی پرورش بھی عین اللہ کی نگرانی میں ہوئی۔

۳۔ طور ۴۸: "اور (اے رسول) تو اپنے رب کے حکم کے لئے صبر کر۔ بیشک یقیناً تو ہماری نگرانی میں ہے۔"

اس آیت سے ظاہر ہوا کہ خاتم الانبیاء کی حفاظت اور نگرانی بھی اللہ کی آنکھ ہی کر رہی تھی اور وہ ہمہ وقت اللہ کی نگاہ میں تھے۔ یہی ہے اللہ کی آنکھ جس سے حضرت کی مرتبت کی عصمت ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ جس کی زندگی کا ہر لمحہ عین اللہ کی نگرانی میں گزرے اس سے صدور خطا و نسیان کا تصور بھی محال ہے۔

علی کے عین اللہ ہونے سے اس لئے دو باتیں حتمی طور پر ثابت ہوتی ہیں۔ اول یہ کہ حاضر و ناظر ہونا اور دوم یہ کہ عالم الغیب ہونا کیونکہ کسی بھی شے کا اللہ کی آنکھ سے غائب و پوشیدہ رہ جانا ممکن نہیں ہے۔

اللہ کا مقام

اس سے قبل ہم قرآت شدہ پر گفتگو کر چکے ہیں اور دلوں پر نصب شدہ سب سے مکمل کی مثال کے ذریعے اس موضوع کا ایک مختصر سا تصور آپ کے اذہان تک پہنچا چکے ہیں۔ یہ بہر حال ایک حقیقت ہے کہ انسان اپنے مشاہدات کا قیدی ہے اور کسی بھی شے کی طرف متوجہ ہونے کے لئے وہ اس شے کے مشاہدے کا محتاج ہے۔ اللہ ہمارا خالق ہے اور یقیناً وہ ہماری تخلیقی کمزوریوں سے پوری طرح واقف ہے لہذا اپنی قربت کی طرف دعوت دینا بے معنی نہیں ہو سکتا قریب ہو جاتا ہے مقام سے۔ چنانچہ

مقام زمانی ہو یا مکانی۔ ذہنی ہو یا قلبی۔ عقلی ہو یا معنوی۔ حقیقی ہو یا مجازی۔ حضرت بغیر مقام کے تعین کے ہوئے کسی سے قریب یا دور نہیں ہوا جا سکتا اور اللہ سے قربت کو بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں کیا جا سکتا جیسا کہ سورہ رحمٰن آیت ۴۶ میں اللہ خود ارشاد فرماتا ہے۔ ''ولمن خاف مقام ربه جنتان''۔ (اور جو شخص اپنے رب کے مقام سے ڈرے اس کے لئے دو جنتیں ہیں)۔ لہٰذا غور کرنا چاہئے کہ انسان کے لئے اللہ کی قربت کیونکر ممکن ہو سکتی ہے اور اگر ممکن نہیں ہو سکتی تو پھر اس علیم و حکیم نے اس کا حکم کیوں دیا ہے؟۔ پس جو شخص اس بات پر ایمان رکھتا ہے کہ حکم دینے والا حکیم مطلق ہے تو وہ اس بات کو بھی یقیناً تسلیم کرے گا کہ کوئی نہ کوئی مقام یا ضرور ہے جس کو اللہ نے اپنا مقام قرار دیا ہے جیسے کعبہ کو اپنا گھر قرار دیا ہے اور انسان کو اس مقام کا علم نہیں تو اس کے لئے قربت خدا بے معنی ٹھہرتی ہے اور اسطرح اسکی زندگی بھر کی عبادت بھی مہمل قرار پاتی ہیں۔ یہ ہم پر امام [illegible] کا احسان ہے کہ انھوں نے تمام باریک اور نازک مسائل کو ہمارے لئے آسان کر دیا اور اپنے [illegible] شرک کی جڑیں ہمیشہ کے لئے کاٹ دیں۔ اب ''شرک! شرک!'' کی پکار وہی لوگ مچاتے ہیں جو اللہ کے مقام سے ناواقف ہوتے ہیں۔ لیکن مومن جانتا ہے کہ اللہ لازمان و لامکان ہوتے ہوئے بھی ایک مقام رکھتا ہے۔ مومن جانتا ہے کہ اللہ دور ہوتے ہوئے بھی قریب اور قریب ہوتے ہوئے بھی دور اسطرح ہوتا

ہے اور وہ اس بات کو بھی اچھی طرح سمجھتا ہے کہ دوری اور قربت کا تعلق مقام اللہ سے ہے نہ کہ اللہ سے۔

مقام اللہ کون ہے؟

مقام نام ہے اللہ کی صفت کا۔ اللہ کی صفات ہماری طرح شخص ہیں بلکہ وہ وجود خارجی رکھتی ہیں اور ہم جیسے مجبوروں کی مشکل دور کرنے کے لئے مجسم انسانیت کے ساتھ ظہور کرتی ہیں اور ان سے قلبی اعتبار سے قریب ہونے کا نام قربت خدا ہے۔ اب ہم اللہ کے مقامات کا تعارف آپ سے کراتے ہیں اور کیسے ہم کہہ سکتے ہیں کہ معصومین کی رحمت سے دوچار نہیں کریں گے بلکہ آئمہ اطہار کی تعلیم کردہ دعائیں ہی ہماری رہنمائی کریں گی اور یہ وہ دعائیں ہیں جو کہ مومنین پنج نماز کے بعد پڑھتے ہیں اور ان شاء اللہ وہ ان دعاؤں سے حقیقی لطف اٹھائیں گے۔

مفاتیح الجنان صفحہ ۲۰۲۔ "پروردگار میں تجھ سے سوال کرتا ہوں ان تمام معنی کے ذریعے جن سے تیرے اسم کے ولی تجھے پکارتے ہیں۔ (یہاں سے معلوم ہوا کہ ہم اللہ کو اسکے اسم کے ذریعے پکارتے ہیں لیکن اسکے اولیاء اسم سے اسکے معنی کے ذریعے پکارتے ہیں)۔ جو تیرے راز کے امانتدار (یہ جاننا ضروری ہے کہ وہ کونسا راز ہے جسکے یہ امانتدار ہیں۔ پس سمجھ لیجئے کہ وہ راز خود اللہ کی ذات ہے جسکا تعارف کرنے کے لئے یہ مقدس ہستیاں دنیا میں آئی تھیں اور جنہوں نے خود کو ظاہر کرکے ذات کا

تعارف کرایا۔ اس طرح وہ ذات راز ہوتے ہوئے بھی ظاہر ہوئی اور ظاہر ہوتے ہوئے بھی پوشیدہ رہی)۔ تیرے امر کی خوشخبری پانے والے اور تیری قدرت کی توصیف کرنے والے ہیں۔ میں تجھ سے سوال کرتا ہوں تیری اس حیثیت کے واسطے سے جو ان میں ہوتی ہے۔ جن کو تو نے بنایا ہے اپنے کلمات کی کانیں۔ اپنی توحید کے ارکان۔ اپنی آیات اور اپنے مقامات۔ جو تجھے چھپاتا ہے اس کے ذریعے چھپتا ہے۔ ان میں اور تجھ میں کوئی تفریق نہیں علاوہ اس کے کہ وہ تیرے بندے اور تیری مخلوق ہیں اور ان کی حرکت اور سکون تیرے حکم سے ہے۔ ان کی ابتدا تجھ سے اور انتہا تجھ تک ہے۔"

آپ یقین فرمائیں کہ اگر ان دعاؤں کی تشریح کی جائے تو [illegible] سے ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ ہمارے احباب ہم سے اصرار کرتے ہیں کہ ہم ان دعاؤں کی شرح لکھیں لیکن ہم ان سے ہمیشہ معذرت کرتے ہیں۔ اول اس لئے کہ یہ ہمارا منصب نہیں ہے اور یہ بات بہت اہم ہے سمجھنا چاہئے۔ دوم اس لئے کہ ہماری صحت اس کام کی اجازت نہیں دیتی۔ سوم اس لئے کہ حقیقتاً یہ کام علماء کا ہی ہے اور ان ہی کو یہ کام کرنا چاہئے۔ آج تک بہت سے علماء نے مختلف دعاؤں اور زیارات کی شرحیں لکھی ہیں لیکن اس کے لئے انہوں نے فلسفے اور تصوف کی تحقیق اور ناقابل فہم اصطلاحوں کا سہارا لینا پسند کیا ہے۔ اپنی مصلحت وہ خود

جانتے ہوتے مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ عوام روز اول کی طرح آج بھی ان حقائق سے بے بہرہ ہیں اور ان اعمال اور زیارات کا مصرف ان کے نزدیک فقط تبرک رہ گیا ہے کہ حصول مقاصد کے لئے انہیں منتر سمجھ کر پڑھتے رہیں۔ اللہ ہمارے علماء کو توفیق عطا فرمائے کہ وہ حصول معرفت کے مقصد کے تحت ان اعمال اور زیارات کی شرح ایسے سہل انداز میں لکھیں جن سے ایک عام آدمی بھی مستفیض ہو سکے اور مذہب اہل بیت پروان چڑھ سکے۔ آمین

مقامات خدا کا تعارف ہو گیا لیکن ہم چاہتے ہیں کہ دو باتوں کی مزید وضاحت کردیں۔

توحید کے ارکان

ارکان رکن کی جمع ہے جس کے معنی ہیں ستون۔ کسی بھی عمارت کا دارومدار اس کے ستونوں پر ہوتا ہے اور پوری عمارت ستونوں پر ہی کھڑی ہوتی ہے۔ عمارت جتنی عظیم الشان ہوگی اتنا ہی اس کے ستونوں کا مضبوط اور پائیدار ہونا ضروری ہوگا۔ اگر ستونوں کو ہٹا دیا جائے تو پوری عمارت منہدم ہو جائے گی اور اسے دوبارہ اپنی اصلی حالت میں نہیں لایا جا سکے گا جب تک دوبارہ ستونوں کا شعور نہ ہو۔ بالکل اسی طرح عمارت توحید بھی اپنے ستونوں پر قائم ہے۔ یہ ستون نہ ہوں تو توحید کا کوئی تصور موجود بھی باقی نہیں رہتا۔ اب توحید جتنی بھی عظمت اپنے تصور میں رکھتی ہے کم از کم اتنی ہی عظمت

کے ارکان کی بھی تعمیم کرنا پڑے گی مگر یہ سوچ کر کہ عظمت کا یہ تصور ہماری حد ہے نہ کہ ارکانِ توحید کی۔ اور اگر کوئی آپ کے تصور سے بڑھ کر بات بتائے تو اس پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ آپ کی معرفت میں اضافہ ہو گیا نہ کہ اس پر فتوے لگانا شروع کر دیں۔ فتوے لگانے کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ توحید کی عظمت کو محدود سمجھتے ہیں اور یہ بات منافیِ ایمان ہے۔ اسی سے ہماری بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ ہمارے لئے توحید کا مطلب سوائے اس کے کچھ نہیں کہ مظاہرِ توحید کی معرفت حاصل کی جائے۔ انکو درمیان سے ہٹا دیں تو ہمارے لئے توحید کا وجود ہی باقی نہیں رہتا۔ اللہ اپنی ذات میں قدیم و قیوم ہے۔ اس میں کبھی کوئی تغیر نہیں ہوتا۔ کوئی اسے مانے یا نہ مانے اس سے اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اسے ماننے والی اور اس کی عبادت کرنے والی مخلوق نہ تھی تو وہ تھا اور جب کچھ بھی نہ رہے گا تب بھی وہ رہے گا۔ توحید کا مفہوم و معدوم ہونا ہماری نسبت سے ہے یعنی ہم بغیر ارکانِ توحید کے ادراکِ توحید کر ہی نہیں سکتے اور اگر یہ ارکان نہ ہوں تو مشاہدے کے اعتبار سے توحید ہمارے لئے معدوم رہے گی۔

ابتدا و انتہا

اس دعا کا ایک جملہ یہ ہے کہ الٰہی ابتدا تجھ سے اور انتہا تجھ تک ہے"۔

یہ ایک ایسا آسان اور روشن واضح جملہ ہے کہ ایک کم علم آدمی بھی اسے پڑھتے ہی اس کے مفہوم تک پہنچ جائے گا مگر ہر شخص اپنی کاوش سے حقائقِ معرفت کو

لوگوں کی نظروں سے اوجھل کر رکھا ہے۔

پہلا مطلب جو اس جملے سے ذہن میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ جس طرح اللہ کی کوئی ابتدا نہیں اسی طرح ظلی کی بھی کوئی ابتدا نہیں اور جس طرح اللہ کی کوئی انتہا نہیں اسی طرح ظلی کی بھی کوئی انتہا نہیں۔ اور یوں یہ دو جملے یہ بتاتیاں اس کی ذات کا تعارف کرتی ہیں اور قدیم کا تعارف قدیم سے ہی ہو سکتا ہے۔ حادث سے نہیں ہو سکتا۔ اس جملے کی مزید تفہیم ہم امام حسین کے ایک ارشاد کی روشنی میں کرتے ہیں جہاں ارشاد ہوتا ہے: "یعتصر نور دا من نور ربنا کشعاع الشمس من الشمس" یعنی ہمارے نور کی چھوٹ اپنے رب کے نور سے اس طرح ظاہر ہوتی ہے جیسے سورج کی شعاع سورج سے۔ (العالی سلطانا نصیر) سورج کا ہم صبح و شام مشاہدہ کرتے ہیں۔ سورج کی شعاعیں سورج سے ہی نکل رہی ہیں۔ گویا ظلی ابتدا سورج سے ہی ہوتی ہے اور یہ ابتدا وجود نہیں بلکہ ابتدائے ظہور ہے۔ اور شام کو یہ شعاعیں اگرچہ سورج میں چلی جاتی ہیں۔ گویا ظلی انتہا بھی سورج پر ہوتی ہے۔ سورج جب آ جاتا ہے تو ظاہر ہو جاتا ہے اور جب چلا جاتا ہے چھپ جاتا ہے۔ لیکن ایک لمحے بھی ایسا تصور نہیں کیا جا سکتا جب سورج ہو اور اس کی شعاعیں نہ ہوں۔ اسے شک نہیں بلا شرکت ہیں۔ سورج جب سے ہے اور جہاں کہیں بھی ہے اس کی شعاعیں اس کے ساتھ ہیں کیونکہ شعاعیں سورج کا اثر

ہیں۔ آگ جب سے ہے اور جہاں کہیں بھی ہے اسکی حرارت اسکے ساتھ ہے کیونکہ حرارت آگ کا اثر ہے۔ شرک تب ہوگا جب کوئی شعاع کو سورج اور حرارت کو آگ سمجھے۔ یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے سے جدا بھی ہیں اور جدا نہیں بھی ہیں۔

مردانِ خدا خدا نہ باشند

لیکن ز خدا جدا نہ باشند

یعنی مردانِ خدا خدا نہیں ہوتے لیکن اسکے باوجود خدا سے جدا بھی نہیں ہوتے۔

موجودگی کا ثبوت

تعالیٰ وہ ذات ہے جو لامکان ہوتے ہوئے بھی کائنات کے ذرے ذرے میں پنہاں بھی ہے اور ظاہر بھی۔ اور اسی نے تمام عالم سے وجود کا احاطہ کر رکھا ہے۔

برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار

ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

یعنی حقیقت میں لوگوں کے لئے درختوں کا سبز و شاداب پتہ معرفتِ کردگار کے ایک دفتر کی حیثیت رکھتا ہے۔ جو شخص طالب معرفت ہو اسکو ہر شے میں اس کا جلوہ نظر آئے گا اور یہی فرمایا ہے پروردگارِ عالم نے کہ تم جس طرف بھی رخ کروگے تمہیں اللہ کا چہرہ نظر آئے گا۔ لہٰذا جو شخص اشیاءِ عالم میں اللہ کا مشاہدہ نہیں کرتا وہ محسوس کا نہ ہی مگر

دل کا زندہ ہونا ضروری ہے جیسا کہ خواجہ میر درد نے فرمایا۔

تجھی کو جو یاں جلوہ فرما نہ دیکھا
برابر ہے دنیا کو دیکھا نہ دیکھا

ہر انسان کو چاہئے کہ زمین و آسمان پر نظر کرے۔ دریاؤں اور سمندروں کا مشاہدہ کرے صحراؤں، بیابانوں اور پہاڑوں کو دیکھے اور اپنے محبوب کا دیدار کرتا رہے کیونکہ یہ جلوہ مکان میں بھی ہے اور مکین میں بھی۔ مجازاً بھی ہے اور حقیقتاً بھی۔ وہ ہر شے میں ہے مگر ہر شے سے الگ۔

مفتاح البیان صفحہ ۱۳۸ ’’پروردگار میں سوال کرتا ہوں تیرے چہرے کے ذریعہ جو ہر شے کی فنا کے بعد باقی رہے گا۔ اور تیرے نام کے ذریعہ جنہوں نے ہر شے کے اجزاء کو پُر کر رکھا ہے۔ اور تیرے علم کے ذریعہ جس نے ہر چیز کو گھیر رکھا ہے اور تیرے چہرے کے نور کے ذریعہ جس سے ہر شے روشن ہوئی‘‘۔

یہ لوگ تو رہے ایک طرف۔ یہاں تو بعض علماء کا یہ حال ہے کہ نبی کے ایک وقت چند مقامات پر موجود ہونے میں شک کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان میں سے بعض اس بات میں بھی شک کرتے ہیں بلکہ انکار کرتے ہیں کہ نبی ہر مرنے والے کے پاس کیونکر پہنچ سکتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک وقت میں ہزاروں لاکھوں لوگ مرتے ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ شخص واحد آن واحد میں متعدد مقامات پر موجود رہے۔ ن

عقل کے اندھوں کو کوئی بتائے کہ علیؑ تو اللہ کا چہرہ ہے۔ وہ تو بیک وقت ہر جگہ نظر آتا ہے۔ نہ صرف یہ کہ نظر آتا ہے بلکہ حقیقتاً ہر جگہ موجود رہتا ہے۔ یہاں ہم کوکب دری صفحہ ۳۶ سے دو مختصر روایات نقل کرتے ہیں تا کہ اللہ کے چہرے کا معمولی سا تعارف ہو سکے۔

۱۔ "مقداد بن الاسود سے روایت ہے کہ جب احزاب کے دن علیؑ خندق کے کنارے پر کھڑے ہوئے تھے اور عمرو بن عبدود کو قتل کر چکے تھے اور اس کے قتل ہونے سے لشکر کفار دو فرقوں میں منقسم ہو گیا تھا اور میں دیکھتا تھا کہ ان دو جماعتوں میں سے ہر ایک فرقے کے پیچھے علیؑ تلوار لئے ہوئے تھے اور ان کو گھاس کی طرح کاٹ رہے تھے حالانکہ وہ جناب اپنے مقام پر کھڑے تھے اور بھاگنے والوں کا پیچھا نہیں کر رہے تھے کیونکہ آپ کی عادت تھی کہ بھاگنے کے پیچھے نہ جاتے تھے"۔

۲۔ جابر بن عبداللہ انصاری فرماتے ہیں کہ جنگ جمل میں امیر المومنین کے ہمراہ حاضر تھا اور ستر ہزار افراد اس عورت کی محبت میں آئے تھے۔ پس میں نے کسی بھاگتے ہوئے کو نہیں دیکھا مگر یہ کہ وہ کہتا تھا کہ مجھے علیؑ نے بھگایا ہے۔ اور نہ کسی زخمی کو بھی میں دیکھتا تھا وہ کہتا تھا کہ مجھ کو علیؑ نے زخمی کیا ہے اور نہ کسی مقتول کو بھی دیکھا وہ کہتا تھا کہ مجھ کو علیؑ نے قتل کیا ہے۔ میں میمنہ میں جاتا تو وہاں علیؑ کی آواز سنتا اور میسرہ میں جاتا تو علیؑ کی آواز سنتا۔ اور میں طلحہ کے پاس سے گزرا جبکہ وہ مر رہا تھا اور اس کے سینے میں ایک تیر لگا ہوا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ یہ تیر تجھے کس نے مارا؟ تو اس نے کہا کہ علیؑ

نے۔ میں نے کہا کہ حضرت بلقیس اور اسکے جد اعلیٰ نے کسی کے تیر نہیں مارے ہاتھ میں تو سوائے تلوار کے اور کچھ بھی نہیں۔ تو اس نے مجھ سے کہا۔ اسے جو ہرا آیا تو اسکی طرف نہیں دیکھا کہ کس طرح وہ ہوا میں اڑ جاتا ہے اور پھر زمین پر اتر آتا ہے۔ اور کبھی مشرق کی طرف سے آتا ہے اور مغرب طرف سے۔ اور اس نے تمام مشارق و مغارب کو اپنے ساتھ ایک کر دیا ہے جس سے دل سے وار کرتا ہے اسکی تلوار کی نوک چبھو دیتا ہے اور اسکو دیکھتا ہے جسکو وہ مارتا ہے یہ چوٹ لگا دیتا ہے یا اسکے دل پر دیتا ہے یا جلا دیتا ہے کہ مر جائے جس شخص کو خدا چاہے تو وہ مر جاتا ہے۔ پس اسکے ساتھ سے کوئی بچ نہیں جاتا''۔

بحر المسجور

سورہ طور۔ ۵۲ ''والطور۔ وکتٰب مسطور۔ فی رقٍّ منشور۔ والبیت المعمور۔ والسقف المرفوع۔ والبحر المسجور''۔

قسم ہے طور کی۔ اور لکھی ہوئی کتاب کی۔ جو پھیلی ہوئی جھلی میں ہے۔ اور بیت المعمور کی۔ اور بلند کی ہوئی چھت۔ اور قسم ہے جوش مارتے سمندر کی۔

ان آیات میں اللہ نے پانچ چیزوں کی قسم کھائی ہے۔ طور۔ کتاب مسطور۔ بیت

معمور، سقف مرفوع اور بحر مسجور۔ قسم اس چیز کی کھائی جاتی ہے جو قسم کھانے والے کو بہت پیاری ہو یا جس کی عظمت کا اظہار مقصود ہو۔ یہ عقل بھی تسلیم کرتی ہے کہ اللہ پہاڑوں، گھروں، چھتوں اور سمندروں کی قسم نہیں کھا سکتا کیونکہ اس کی عظمت سے بعید ہے۔ پھر یہ کون ہے جس کی قسم اللہ اتنے پیار سے کھا رہا ہے؟۔

یہاں طور (پہاڑ) استعارہ ہے مضبوطی اور قائمیت کا۔ کتاب مسطور سے مراد مضبوط معین وجود ہے۔ رق المنشور سے اشارہ ہے اس کی وسعت کی طرف۔ بیت المعمور علامت ہے عزت، عظمت اور جرأت کا۔ سقف المرفوع کا مطلب ہے انتہائی بلندی اور بحر مسجور نشانی ہے علم، قدرت اور قوت کی۔ یہ تمام خصوصیات کسی ایک ہستی میں جمع ہوئی ہیں جس کی اللہ قسمیں کھا رہا ہے۔ یہاں ہمارا مقصد تفسیر قرآن بیان کرنا نہیں ہے لیکن ہم آپ کو دعوت دیتے ہیں کہ سورہ طور کی تلاوت کریں۔ آپ دیکھیں گے کہ بعد کی آیات میں اس مقدس وجود سے دشمنی رکھنے والوں اور اس کی تکذیب کرنے والوں کے لئے شدید مذمت کی گئی ہے اور انہیں جہنم کی وعید دی گئی ہے۔ اور اس سے محبت رکھنے والوں کو خوشخبریاں دی گئی ہیں۔

کون ہے یہ طور؟۔ یہ کتاب مسطور؟۔ یہ بیت المعمور؟۔ یہ سقف المرفوع اور یہ بحر المسجور؟۔

۔ مفاتیح الجنان صفحہ ۷۹۹۔ زیارت امیر المومنین

"اے خدا کے امین، اے حجت خدا، اے اللہ کے ولی! آپ کی زیارت کی ہے آپ

کے غلام اور محب نے پناہ لیتے ہوئے اس قبر کی۔ یہ زیارت اس نے کی ہے جو آپ کے لئے سب کچھ چھوڑ آیا اور اللہ کے بعد آپ کو اپنے لئے کافی جانتا ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ بیشک آپ طور ہیں۔ کتاب مسطور ہیں۔ رق منشور ہیں اور علم کا بحر مسجور ہیں۔"

پس ہم نے جان لیا کہ وہ کون ہے جن کی قسمیں خدا نے کھائیں۔ تاکہ یقین ہو اور ہم یہ سب کچھ آپ کی زبان سے سنیں۔

[illegible] الاسرار جلد ۱ صفحہ ۱۵۸ حضرت امیر المومنین خود ارشاد فرماتے ہیں۔ "میں ہوں طور، میں ہوں کتاب مسطور، میں ہوں بحر مسجور، میں ہوں بیت المعمور، میں ہوں نوروں کا نور۔"

یہاں ہم خصوصی طور پر اس فرمان کے آخری الفاظ یعنی "نوروں کا نور" کا بھی جائزہ لینا چاہتے ہیں۔

ہم نے کشف العقائد میں نور کی تعریف بیان کی تھی جو ہم ایک بار پھر لکھتے ہیں تاکہ "نوروں کا نور" کا مطلب سمجھ میں آئے۔ نور کی تعریف ہے۔ "نور وہ ہے جو خود نفس الامر میں با تحقیق ہو اور وہ اپنے وجود سے دوسروں کو با تحقیق وجود میں لائے"۔ اس تعریف پر وہی پورا اتر سکتا ہے جو عین وجود ہو اور جو سب وجودوں کا نقطہ باء بسم اللہ ہو۔ ہماری بات کا گواہ ہے کہ اصل وجود حضرت امیر المومنین

کی ذات گرامی ہے جس سے "ب" کو وجود ملا ہے اور "ب" میں پورا قرآن ہے اور قرآن میں ہر وہ شے موجود ہے جو مخلوق ہے۔ پس یہ حقیقت ہی ہے جس نے عالم وجود کو وجود عطا فرمایا ہے۔ "نورھا کا نور" کا مطلب یہی ہے کہ وہ نور جس نے باقی تمام نوروں کو خلعت وجود بخشا ہے وہ نور علی ابن ابی طالب ہے۔

حدیث ابوذر

حضرت ختمی مرتبت نے جناب ابوذر سے ایک طویل حدیث بیان فرمائی ہے جس کے چند اقتباسات ہم آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

تفسیر فرات صفحہ ۲۵۳ ح ۲۶۔

"علی امت میں حجت خدا ہیں"۔

اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ حضرت امیر المومنین حجت خدا تو رسول اللہ کے بعد ہوئے لیکن حقیقتاً آدم سے لیکر قیامت تک ہر امت کے لئے علی ہی حجت ہیں یعنی ہر امت اگرچہ اپنے نبی کے زیر فرمان رہی لیکن اس کی نجات اور ہلاکت کا دارومدار ولایت علی پر ہی تھا اور آج بھی ہے۔ اسی لئے حضرت امیر المومنین نے ارشاد فرمایا ہے۔ "جتنی امتوں نے نجات پائی وہ میری وجہ سے اور جتنی امتیں ہلاک ہوئیں وہ بھی میری ہی وجہ سے"۔ امتیں تو رہیں ایک طرف۔ خود انبیاء کی نجات کا دارومدار علی کی ولایت پر ہے۔ ہم نے کشف الغطاء میں حضرت یونس کی مچھلی کا

زین العابدینؑ سے ایک مکالمہ نقل کیا گیا تھا، کا ایک جملہ ایک بار پھر ملاحظہ فرمائیں تاکہ ہماری بات کی تصدیق ہو جائے۔ مچھلی نے کہا: "آقا! آدم سے لے کر آپ کے نانا محمدؐ تک جتنے نبی گزرے ہیں ہر ایک پر آپ کی ولایت پیش کی گئی۔ انہوں نے ولایت کو قبول کیا اور نجات پائی۔ اللہ نے یونسؑ کو وحی کی کہ امیر المومنین اور آپ کے سبب سے پیدا ہونے والے ائمہ کو دوست رکھو۔ یونسؑ نے عرض کیا کہ میں اسکو کیسے دوست رکھوں جسکو دیکھا نہیں ہے۔ اللہ نے مجھے وحی کی کہ میں یونس کو نگل لوں۔ میں نے اسے نگل لیا۔ جب آپ حضرت کی ولایت کا اقرار کیا تو مجھے اللہ نے حکم دیا کہ میں اسے دریا کے کنارے پر پھینک دوں"۔ (مدینۃ المعاجز جلد ۲ صفحہ ۳۱۰)۔

۲۔ "بے شک اللہ نے اپنے عرش کے ہر رکن کے لئے ستر ہزار فرشتے خلق کئے ہیں۔ جن کی تسبیح و عبادات علیؑ کے لئے دعا کرنا اور آپ کے دشمنوں پر لعنت کرنا ہے"۔ یہاں سے تسبیح و عبادات کا صحیح مفہوم سمجھ میں آتا ہے۔ فرشتوں کی عبادات سے بھی اس کی عبادت ہوتی ہے اور فرشتے بھی وہ جو ارکانِ عرش پر معین ہیں۔ پس عبادت کی معراج یہ ہے کہ انسان دل اور زبان دونوں سے علیؑ کے فضائل بیان کرتا رہے اور علیؑ کے دشمن پر لعنت کرتا رہے اور دعا کرتے وقت اس بات کا لحاظ کرے کہ دشمن کون ہے اور کس حیثیت کا ہے۔ جس کسی سے بھی علیؑ کی دشمنی ظاہر ہو اس پر لعنت کرنا اعلیٰ ترین عبادت ہے۔

۳۔ "اگر علیؑ نہ ہوتے تو حق باطل سے الگ نہ ہوتا۔ نہ مومن کافر سے جدا ہوتا۔ نہ خدا کی عبادت ہوتی۔ اگر علیؑ نہ ہوتے تو ثواب اور عذاب کا تصور بالکل نہ ہوتا"۔

یعنی علیؑ کا احسان ہے حق پر بھی اور مومن پر بھی کہ اس نے ان کو باطل سے اور کافر سے جدا کر کے تمیز بخشی۔ علیؑ کا احسان ہے عبادت کرنے والوں پر کہ علیؑ نہ ہوتے تو پیشانیاں سجدوں سے محروم رہ جاتیں۔ علیؑ کا احسان ہے جنت اور جہنم پر کہ اگر علیؑ نہ ہوتے تو یہ دونوں اب تک بے زمانہ مکان کی طرح خالی پڑے اپنی تہی پر ماتم کرتے رہتے۔ علیؑ سے ہٹ کر حق کی تلاش کرنا باطل سے چمٹنا ہی ہے جیسے بغیر چراغ کے اشیاء کو دیکھنے کی کوشش کرنا۔ علیؑ وہ نور ہے جس کے بغیر پورے عالم وجود میں سوائے گھپ اندھیرے کے اور کچھ نہیں۔ اگر علیؑ نہ ہو تو کفر و ایمان کا تصور ہی باقی نہیں رہتا۔ جو شخص علیؑ کو چھوڑ کر عبادت کرتا ہے وہ خدا کی عبادت نہیں کرتا بلکہ کسی اور کی عبادت کرتا ہے۔ ثواب اور عذاب کوئی شے ہی نہیں سوائے علیؑ کی محبت اور علیؑ کی دشمنی کے۔

۴۔ "خدا کی ذات کا کوئی پردہ اور حجاب نہیں ہے۔ وہ خود پردہ اور حجاب ہے"۔

جب ہم پچھلی گفتگو کر چکے ہیں اور یہ ثابت کر چکے ہیں کہ علیؑ کا براہ راست تعلق ذات خدا سے ہے اسی لئے آنجناب نے فرمایا ہے۔ "یا من دل علی ذاته

بداتہ "الحق سے وہ جو اپنی ذات پر دلیل لاتا ہے خود اپنی ذات سے۔

یہ جملہ کوئی نئی زبان سے ادا ہی نہیں ہو سکتا سوائے انکے کامل فقیروں کے بات سوائے ذات کے اور جو موجود ہی نہ ہو۔ یہی وہ مقدس وجود ہے کہ جس کسی کو بھی اللہ کی معرفت حاصل ہوئی یا اللہ کا کوئی فیض پہنچا تو وہ انہی کے ذریعے پہنچا۔ یہی حجاب خدا ہے۔ یہی جامع صفات خدا ہے۔ یہی اسم خدا ہے۔ یہی مظہر ذات خدا ہے اور یہی مصاحب ہے جو اس دنیا میں اس پر فدا ہونے کا امان دیا گیا۔ حق کے بارے میں زبان کھولنے سے پیشتر ہزار مرتبہ سوچنا پڑتا ہے کیونکہ اس ذات بلند و برتر تک پہنچنا تو ممکن ہی نہیں بلکہ ان کی شان میں ذرا سی تنقیص کا بھی بہت زیادہ الٹا اثر پڑتا ہے۔ اللہ اللہ کرنے والوں کے لئے یہ مقام قرب ہے۔

۵۔ "اللہ جس کو ہدایت دیتا ہے سلطان کی ولایت کی معرفت دیتا ہے اور جس کو سلطان نہیں دینا چاہتا سلطان کی معرفت نہیں دیتا"۔

حضرت ختمی مرتبت کے اس فرمان سے یہ واضح ہو گیا کہ "ہدایت" کا مطلب معرفت ولایت حق ہے لہٰذا قرآن مجید میں جہاں جہاں لفظ ہدایت استعمال ہوا ہے سمجھ لینا چاہئے کہ وہاں ولایت حق کی معرفت مراد ہے۔ یہ بھی معلوم ہو گیا کہ نماز میں جب ہم "اھدنا الصراط المستقیم" بطور ہدایت کی دعا مانگتے ہیں تو درحقیقت معرفت ولایت حق کی طلب کرتے ہیں۔ کون بد بخت ہی ہو گا جو اللہ سے مکر و فریب جیسے ورد "اھدنا

"صراط مستقیم" ہمارے لیے بھی شہادت ولایت علی کو پہلا نماز جانے۔ لوگوں کو جان لینا چاہیے کہ اللہ نے مغفرت کا وعدہ صرف ان لوگوں سے کیا ہے جو معرفت و محبت علی رکھتے ہوں یعنی ہدایت یافتہ ہوں۔ اگر کوئی علی کی معرفت نہیں رکھتا تو وہ یقین رکھے کہ اس کے لئے توحید، نبوت، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ بیکار محض چیزیں ہیں جیسا کہ مندرجہ ذیل آیت سے ثابت ہے۔ اس آیت میں اللہ مغفرت کرنے کا وعدہ فرما رہا ہے لیکن اس کے لئے چند شرائط عائد فرما رہا ہے جن کے پورے ہو جانے پر ہی مغفرت کا وعدہ کرتا ہے۔

طٰہٰ ۸۲۔ "انی لغفار لمن تاب وآمن وعمل صالحا ثم اهتدى"۔
یعنی "میں اس کے لئے ضرور ضرور بخشنے والا ہوں"۔

(الف)۔ "جس نے توبہ کی"۔ (توبہ کر لینے کے باوجود بھی اللہ کا وعدہ مغفرت پورا نہیں ہو)۔

(ب)۔ "اور ایمان لایا"۔ (توبہ کر لینے اور ایمان لے آنے کے باوجود مغفرت کا مستحق پیدا نہیں ہو)۔

(ج)۔ "اور نیک عمل کرے"۔ (توبہ کر لینے، ایمان لے آنے اور عمل صالح کر لینے کے بعد بھی مغفرت کی کوئی ضمانت نہیں)۔

یہ سمجھ رہنا چاہیے کہ ان تینوں کے درمیان اللہ نے واو عطف استعمال کیا ہے یعنی اللہ نے ان تینوں چیزوں کو ایک ہی صف میں شمار کیا ہے۔ لیکن چوتھی شرط

کے ساتھ واؤ عطف استعمال نہیں کیا بلکہ لفظ "ثم" استعمال فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پچھلی تینوں چیزوں کی حیثیت صرف مقدمے کی ہے۔ اور اصل شرط یہ ہے جو "ثم" کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ یعنی پچھلی تین شرائط کا اصل مقصود چوتھی شرط کو پورا کرنا ہے۔

(د)۔ "پھر ہدایت پائی" ہدایت پانے کے بعد اب انسان اللہ کے وعدہ مغفرت کا حقدار ہو گیا اور اللہ نے اپنے اوپر واجب کر لیا کہ ایسے بندے کو ضرور بخشے گا۔ ہدایت کے معنی آپ حضرت ختمی مرتبت کی زبان اقدس سے سن چکے۔ تو اب یہ بات ثابت ہوئی کہ اللہ نے مغفرت کا وعدہ صرف ان سے کیا ہے جو معرفت ولایت علی رکھتے ہوں اور جو نہیں رکھتا اس کی مغفرت کی کوئی ضمانت نہیں۔

حضرت رسالت مآب کے جملے کے دوسرے ٹکڑے پر بھی غور کرنا ضروری ہے جس میں آپ فرماتے ہیں۔ "اور (اللہ) ان کے دل کو سکون نہیں دیتا جب تک علی کی معرفت نہیں دیتا"۔ آنحضرت کا یہ جملہ بات کرنے سے نہیں بلکہ مشاہدہ کرنے سے سمجھ میں آئے گا۔ جو کوئی علی سے بیزار ہو اس کو آپ ہمیشہ بے چین اور مضطرب ہی پائیں گے۔ سکون ایسے شخص کے نصیب میں ہے ہی نہیں۔ اسی بات کو قرآن نے اس طرح بیان فرمایا۔ "الا بذکر اللہ تطمئن القلوب"۔ (آگاہ ہو جاؤ کہ دل اللہ کے ذکر سے ہی اطمینان پاتے ہیں)۔

۶۔ "علی وہ کلمہ ہے جس کو متقین نے گرہ باندھ لیا ہے"۔

یہاں حضرت ختمی مرتبت نے سورہ فتح کی آیت ۲۶ کا مفہوم بیان فرمایا ہے جہاں

رشد و ہدی ہوتا ہے۔ "پس اللہ نے اپنے رسولؐ اور مومنین پر تسکین اتاری اور کلمہ تقویٰ کو ان پر لازم کر دیا"۔ پس حق وہ ہے جو کلمہ دلالت کا کسی سے بھی خود سے جدا نہ کرے۔ گرہ باندھ لینے کا یہی مطلب ہوتا ہے۔ یہ گرہ کسی مقام پر بھی نہیں کھلنی چاہیے وہ کلمہ ہو، اذان ہو، اقامت ہو یا نماز۔ اس گرہ سے مراد یہ بھی ہوتا ہے کہ اس کا کوئی تعلق تقویٰ سے نہ ہو اور یہ لوگوں کو جان لینا چاہیے کہ اللہ ہدایت متقین ہی کی کرتا ہے اور عمل صرف متقین ہی کا قبول کرتا ہے۔ بہتر ہے ہم لوگوں کو آخرت کی طرف سے مائل ہو جانا چاہیے اور اپنا تمام وقت نیکی امور کے حصول میں صرف کرنا چاہیے جو وہ پہلے ہی کر رہے ہیں۔

کہ "پہلے آسمان سے لے کر ساتویں آسمان تک میں جہاں بھی گیا تو فرشتوں کے گروہ جو آسمان پر میرے پاس آتے اور مجھے سلام کرتے۔ عرض کرتے کہ یا محمدؐ ہماری ایک درخواست منظور فرمائیے۔ مجھے خیال ہوا کہ فرشتے اللہ تعالیٰ سے شفاعت کا سوال کرتے ہیں چونکہ اللہ نے مجھے حوض کوثر اور شفاعت کا اعزاز دے رکھا ہے نبیوں پر فضیلت عطا کی ہے۔ میں نے کہا کہ اے میرے رب کے فرشتو! کیا درخواست ہے؟ انھوں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے نبی! جب آپؐ واپس زمین پر تشریف لے جائیں تو علیؑ کو ہمارا سلام کہنا اور آپ کو آگاہ کرنا کہ آپ کے شوق میں زمانہ بہت سا ہو گیا ہے"۔

فرشتوں سے کوئی جا کے کہے کہ صرف تم ہی اس شوق دیدار میں منفرد نہیں ہو۔ اور بھی لوگ ہیں جو گلی کوچوں میں روز شب سے نجف اور نجف سے شب ان رہ میں صرف رہتی ہیں کہ کبھی تو ہستی مرشد زیبا نظر آ ہی جائے گا۔

نہیں ہیں صرف فرشتے ہی منتظر تیرے

علی کی دید کے امیدوار ہم بھی ہیں

اللہ کا رنگ

رنگ وہ شے ہے جس سے اشیا نظر آتی ہیں۔ اس اعتبار سے اللہ کا رنگ وہی ہو سکتا ہے جس سے اللہ نظر آئے۔

بقرہ ١٣٨۔ "صبغة الله ومن احسن من الله صبغة ونحن له عبدون" ترجمہ۔ رنگ تو اللہ کا ہے اور اللہ کے رنگ سے بہتر کس کا رنگ ہو سکتا ہے اور ہم تو اسی کے لئے عبادت کرنے والے ہیں۔

تفسیر فرات صفحہ ٢٠۔ اس آیت کی تفسیر میں امام جعفر صادق فرماتے ہیں۔ "اس آیت میں صبغہ سے مراد عالم میثاق میں ولایت ہے"۔

اس بات پر غور کرنا لازم ہے کہ معصوم نے یہ نہیں فرمایا کہ "اس آیت میں صبغہ سے مراد علی ہیں" بلکہ علویوم الست کے حوالے سے بیان فرمایا ہے یعنی یوم الست جو نظر آیا تھا وہ جس نے "الست بربکم" کہا تھا وہی اللہ کا رنگ ہے۔ حضرت امیر المومنین

شیخ اکبر جلد ا صفحہ ۲۸ پر فرماتے ہیں۔ ''میں نے یہ قوم ازل کے حکم سے تنے الست بربکم کی ندا سنی تھی''۔ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ میرے مولا نے یہ نہیں کہا تھا کہ ''کیا اللہ تمہارا رب نہیں ہے؟''۔ بلکہ یہ فرمایا تھا کہ ''الست بربکم''۔ یعنی کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟۔ کچھ روحوں نے اللہ کو دیکھا اور کچھ روحوں نے اللہ کی آواز سنی اور جواب دیئے۔ روحوں نے اللہ کو جواب دیا کہ ''ہاں تو ہی رب ہے''۔ جو کافر و منافق تھے وہ یہ اقرار بھول گئے اور آج جب ان کے سامنے یہ سب کچھ بیان کیا جاتا ہے تو یہ شرمندہ ہیں اور فوراً اس کا انکار کرتے ہیں۔ لیکن جو مومن ہیں وہ کبھی اپنا یہ وعدہ اقرار نہیں بھولتے۔ وہ اللہ کے رنگ کو کبھی فراموش نہیں کرتے۔ اللہ کا رنگ کبھی ان کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوتا۔ انہیں تو زمین و آسمان میں، ذروں میں، صحراؤں میں، پہاڑوں میں، درختوں میں، جنگلوں میں اور سمندروں میں اللہ کا رنگ نظر آتا ہے۔ ''کل یوم ہو فی شان'' کا ظہور اللہ کے رنگ سے ہی ہوتا ہے۔ اسی لئے مومن اپنے عہد کو کبھی نہیں بھولتا اور اسی لئے عارف کامل حضرت لعل شہباز قلندر نے فرمایا ہے۔

من بغیر از علی ندانستم
علی اللہ از ازل گفتم

میں نے علی کے علاوہ کبھی کسی اور کو جانا ہی نہیں۔ میں صرف علی ہی کو جانتا ہوں

کیونکہ جس کو میں نے دیکھا تھا اس کی آواز میں نے سنی تھی اور اس کو میں نے جواب دیا تھا کہ "ہاں اتو ہی ہے"۔ میں نے اپنا یار نہیں بدلا۔ جو بات میں نے اس روز کہی تھی وہی بات میں آج بھی کہتا ہوں کہ "ہاں اتو ہی ہے"۔

اللہ کا رنگ ہر شخص پر اپنے ظرف کی مناسبت سے اثر کرتا ہے۔ کوئی تو وسعت کائنات میں پھیلے ہوئے اس رنگ کو دیکھتا ہے اور اسے نظر انداز کر جاتا ہے جیسے کچھ دیکھا ہی نہیں۔ مگر کچھ ہیں جو اس رنگ کو اپنے وجود میں لاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے ہمارے معبود! ہمیں اپنے رنگ میں رنگ لے۔

توحید صفحہ ۸۸ حدیث ۱۵ میں حضرت کی مرتبت کی اس کیفیت کو بیان کیا گیا ہے جو ان پر اس وقت طاری ہوتی تھی جب وہ اللہ کے رنگ کو دیکھتے تھے۔

"راوی نے امام جعفر صادقؑ سے عرض کیا کہ "میں آپ پر فدا ہو جاؤں! وہ بیہوشی اور غشی جو رسولؐ پر نزول وحی کے وقت طاری ہوتی تھی وہ کیا تھی؟"۔ آپ نے فرمایا: "وہ اس وقت طاری ہوتی تھی جب اللہ اپنی تجلی دکھاتا تھا"۔

زیر نظر احادیث فضیلت حضرت امیر المومنین پر ایک مکمل دلیل ہے کیونکہ خود خالق مکان فرماتا ہے کہ میرے رنگ سے بہتر ہونا ممکن ہی نہیں۔ ہم اس رنگ کو پہچاننے کی کوشش کرتے ہیں اور ایک اور حدیث آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں تا کہ آپ اپنے دل کو نور سے بھر دیں۔

توحید صفحہ ۸۸ حدیث ۱۳ امام رضا نے فرمایا۔

"بیشک اللہ کے نور سے بجز ہے بجز سبز ہے۔ اور سبزی سے سرخ ہے۔ اور اس سرخ کا سپید تھا"۔

معصوم صفات بیان فرمارہے ہیں سبز کی یہاں تعریف ہورہی ہے سرخ کی۔ ہماری جانیں قربان ہوں اس مرثیہ پر۔

تقدیم

قدیم اس شے کو کہتے ہیں جس کی ابتدا نہ ہو۔ یعنی جو قید زمان و مکان سے بری ہو اور جس کے لئے کب، کہاں، یہاں، وہاں اور کہاں جیسے الفاظ استعمال نہ کئے جا سکتے ہوں۔ ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ قدیم کا تعارف قدیم ہی کے ذریعے ممکن ہے۔ حادث کبھی بھی قدیم کا تعارف نہیں کرا سکتا۔ لہذا اس سے اللہ کا تعارف ہوتا ہو کا قدیم ہونا عقلاً واجب ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اللہ قدیم بالذات ہے اور یہ قدیم بالغیر۔ اس بات کو علامہ حلی نے بھی اپنی کتاب "احسن العقائد" میں تسلیم کیا ہے۔

اس مقام پر ہم بطور خاص انتہائی اختصار کے ساتھ اس موضوع پر گفتگو کرتے ہیں یقین ہے کہ ہمارے موضوعات میں بھی، کیا فکر گاہے بگاہے تذکرے گا اس سے ہماری

بات کی مزید تائید وتوثیق ہوگی۔ یہ عنوان قائم کرنے کا مقصد تفصیل بیان کرنا نہیں بلکہ محض آپ کی توجہ مبذول کرانا ہے تاکہ آپ کو آئندہ اس لفظ سے اجنبیت محسوس نہ ہو۔

۔ توحید صفحہ ۱۰۶ حدیث ۵ امام محمد باقرؑ نے فرمایا ''اللہ اپنی بارگاہ ثبات کے ساتھ ہے علم حقیقت و ماہیت میں یکتا ہے''۔

اس فرمان سے واضح ہوا کہ اللہ کے ساتھ معیت ذاتی ثابت ہے۔ جس کی بے ہے کا تصور نہیں پایا جا سکتا جب اللہ ہو اور کوئی ساتھ نہ ہو۔ اسی سے حضرت شمس تبریز فرماتے ہیں

ایں غرض باشد کہ غرض ایں است

تا است خالی باشد تا بود خالی بود

یعنی یہ بڑی غرض ہے اور یہی بڑا کام غرض ہے کہ جب تک لفظ ''ہے'' موجود ہے تب تک خالی ہے اور جب سے لفظ ''تھا'' موجود ہے تب سے خالی تھا۔

''ہے'' اور ''تھا'' ایسے الفاظ ہیں جو قید زمان کے اندر بھی ہیں اور اس سے خارج بھی ہیں۔ جب ہم اللہ کے لئے کہتے ہیں کہ ''وہ ہے'' تو اس ''ہے'' سے کوئی زمانہ مراد بھی ہوتا ہے اور مراد نہیں بھی ہوتا۔ یہی کیفیت لفظ ''تھا'' کی بھی ہے۔ اس بات کو حضرت امیر المومنینؑ نے یوں بیان فرمایا ہے۔ ''میں ہر زمانے کے ساتھ اور ہر زمانے سے پہلے تھا۔ میں ہر دور کے ساتھ اور ہر دور سے پہلے تھا۔ میں قلم کے

ساتھ تھا وہ ان سے پہلے۔ میں لوحِ محفوظ کے ساتھ تھا وہ ان سے پہلے۔ میں صاحبِ ازل ہوں"۔ (نہج الاسرار جلد ۱ صفحہ ۲۰۲)

۲۔ توحید صفحہ ۱۰۷ حدیث ۸ میں امام علی رضا فرماتے ہیں۔ "اس (اللہ) کا علم اس کی مشیت کے ساتھ ان اشیاء کے وجود سے پہلے تھا" اشیاء سے مراد مخلوق ہے یعنی سلسلہ خلق جاری ہونے سے پہلے علی کا وجود ثابت ہے۔

یہاں بھی اللہ کی ذات کے ساتھ اس کا علم اور اس کی مشیت بھی قدیم قرار پاتی ہے۔ اس کے علم و مشیت کے لئے لفظ "ہے" اور "تھا" علی الاطلاق ثابت ہیں۔

۳۔ نہج الاسرار جلد ۱ صفحہ ۳۰ پر حضرت امیر المومنین فرماتے ہیں: "تمام اشیاء نقطے پر ختم ہوتی ہیں اور نقطہ ذات پر دلالت کرتا ہے۔ یعنی وہ نقطہ ہے جو خداوند عالم کا اسم اول ہے"۔

اللہ کی ذات قدیم ہے اور یہ بات عقلی ہے کہ حادث کبھی بھی قدیم پر دلیل نہیں بن سکتا کیونکہ حادث کے ذریعے جو بھی تصور ذہن میں آئے گا وہ حادث ہی ہوگا۔ قدیم ہرگز نہیں ہوگا۔ نقطہ چونکہ ذات پر دلیل ہے اس لئے اس کا قدیم ہونا لازم ہوا جب سے وہ نقطہ ہونے کا دعویٰ ہوا ہے میرے مولا امیر المومنین کے نہ کبھی کسی نے کیا ہے ورنہ کسی کو یہ دعویٰ کرنے کی جرأت ہو سکتی ہے۔ اور یہ جو مشہور ہے کہ شب معراج حضرت ختمی مرتبت اللہ سے ملاقات کے لئے تشریف لے گئے تھے تو یہ جاہلوں کے تعصب اور بے عقلی کی دلیل ہے۔ معراج کا مقصد ہی رسول اللہ کو اللہ کے خاص ولی سے متعارف

کرنا درحقیقت علوی کا یہ اظہار تھا جیسا کہ وہ شخص اول خود ارشاد فرماتا ہے۔ "حجاب معرفت ہمارے نبی کے نقطہ عبودیت اطلاق پانے سے متعلق ہے"۔ (نہج الاسرار جلد صفحہ ۳۷)۔

اس شخص اول کو لباس بشری میں دیکھ کر غلط نظریہ قائم نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ لباس بشری میں آنا ذات شخص خداوندی ہے۔ صورت کی حقیقت نورانی ہے۔ نہج الاسرار جلد اصفحہ ۵۶ پر حضرت امیر المومنین اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ "میں وہ بندہ ہوں جس کے لئے موت نہیں اور جب مرتا ہوں تو مرتا نہیں۔ میں اللہ کا پوشیدہ اور مخزون راز ہوں"۔ ان مقدس ہستیوں کا ظاہری لباس میں آنا اور ان پر تغیرات وارد ہونا ہماری حقانیت پر مطالبہ کی خاطر ہے۔ یہ ہماری مجبوری ہے کہ ہم اس وقت تک اللہ کو نہ تو تسلیم کرتے ہیں اور نہ اس کی عبادت کرسکتے ہیں جب تک کہ مشاہدہ نہ کرلیں۔ یہ ان پاک ہستیوں کی مجبوری نہیں ہے کہ وہ لباس بشری میں ضرور ہی آئیں۔ بشریت ان کے لئے محض لباس ہے جسے جب چاہے پہنا جاسکتا ہے اور جب چاہے بدل دیا جاتا ہے۔ اس بات کو سمجھنے میں کوتاہی نہیں کرنی چاہیے کیونکہ یہی وہ مقام ہے جہاں عدم تفہیم کا لازمی نتیجہ شرک ہے خواہ وہ نظریہ حلول کے ذریعے ہو یا اللہ کو جسم مان کر ہو یا پھر اسے اپنی جیسی مخلوق بنا کر پہچاننے کے ذریعے ہو۔ یہ مقدس وجود خود جب چاہیں لباس بدل لیں مگر ہم

حقیقت متغیر نہیں ہوتی کیونکہ وہ مظہر ذات ہے۔

یہ بات اگرچہ عقلی ہے لیکن پھر بھی ہم نقلی توثیق کے لئے قول معصوم پیش کرتے ہیں تاکہ شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہ رہے۔

توحید صفحہ ۲۶۵ حدیث ۲۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: "مخلوق کے اسماء میں تغیر ہوتا رہتا ہے لیکن اللہ کے اسماء میں کبھی تغیر نہیں ہوتا"۔

حدوث اسی شے کا ہوتا ہے اور فنا اسی شے کا مقدر ہوتا ہے جس پر تغیر واقع ہوتا ہو جو شے فنا ہونے والی نہ ہو تو اس کا فانی نہ ہونا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ تغیر سے منزہ ہے اور اس حقیقت کا خود ذات باری تعالیٰ نے واشگاف الفاظ میں اعلان فرمایا ہے اور سورہ رحمٰن کی آیات ۲۶ اور ۲۷ اس کی محکم دلیل ہیں جہاں ارشاد ہوتا ہے: "کل من علیہا فان ویبقی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام" یعنی جو کچھ اس (زمین) پر ہے فنا ہو جانے والی ہے اور باقی رہے گا تیرے رب کا ذو الجلال والاکرام چہرہ۔

مالک الملک

ہر شے کا مالک بلاشبہ اللہ ہے کیونکہ وہی ہر شے کا خالق ہے اور مخلوق اپنے خالق کی ملکیت ہوتی ہے۔ لیکن یہ اللہ کی شان سے بعید ہے کہ وہ حادث و فانی اشیاء کا مالک ہونے پر فخر کرے۔ وہ تو فخر کرتا ہے اپنی اس ملکیت پر جو ہمیشہ سے اس کے ساتھ ہے۔ جب کسی کا بھی ملک نہیں رہا، وہ تب بھی مالک الملک ہے لہٰذا وہ قدیم ہے تو اس کا ملک بھی قدیم ہے اور اپنی اسی ملکیت پر وہ فخر کرتا ہے۔ اپنی اس ملکیت کو اس نے مختلف نام دیے ہیں مثلاً ملک، سلطان اور الحمد۔ ہم ان تینوں چیزوں پر الگ الگ غور کریں گے لیکن ابتدا کرتے ہیں "ملک" سے۔

ملک

یہ لفظ قرآن مجید میں تین مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ایک ملک وہ ہے جو عارضی ہے اور جو سب انسانوں کو مل جاتا ہے اور اس میں مومن و منافق اور کافر و مشرک کی کوئی قید نہیں ہے۔ اس ملک کا مقصد کسی کو آزمانا یا کسی کی رسی دراز کرنا یعنی مہلت دینا ہوتا ہے تاکہ اس کے کفر و طغیان میں اضافہ ہو اور اس طرح وہ خود اپنے لئے شدید عذاب کا استحقاق پیدا کرے۔ ظالموں کو بھی ملک مل جاتا ہے اور اس کا مقصد ان کے عذاب میں اضافہ اور ظلم کے ذریعے ظالم کو فنا کرنا ہوتا ہے۔

دوسرا ملک وہ ہے جو اللہ کے خلفاء کے لئے مخصوص ہے۔ یہ ملک ظاہری بھی ہوتا ہے اور باطنی بھی۔ ظاہری ملک غصب کیا جا سکتا ہے لیکن باطنی ملک کی طرف نگاہ اٹھانے کی کسی کو مجال نہیں۔ اور ظاہری ملک بھی غصب ہو جانے کے باوجود خلیفۃ اللہ ہی کی ملکیت رہتا ہے اور وہ اس میں جو چاہے تصرف کرسکتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ حکمت الہیہ کے تحت وہ خاموش رہے۔ اس خاموشی کا مطلب بے بسی و مجبوری نہیں ہوتا بلکہ یہ ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے کہ کون ہے جو ملک کے اصل مالک کو پہچانتے ہوئے حکومت و ریاست سے دست کش رہتا ہے اور کون ہے جو مختلف حیلوں بہانوں سے حکومت پر قبضہ کر کے خود کو مالک و مختار سمجھنے لگتا ہے۔ فرعون ایک زمانہ تک خدائی کا دعویٰ کرتا رہا لیکن اللہ خاموش رہا۔ وہ گھر جسے اللہ اپنا گھر کہتا ہے اس میں صدیوں تک تین سو ساٹھ بت حکومت کرتے رہے لیکن اللہ خاموش رہا۔ اس خاموشی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ (معاذ اللہ) اللہ بے بس و مجبور تھا بلکہ یہ اس کی حکمت تھی اور اسی حکمت کا اظہار اس کے خلفاء سے بھی ہوتا ہے۔

تیسرا ملک وہ ہے جو اللہ کی ذات کے لئے مخصوص ہے اور اس میں کسی اور کے لئے کوئی حصہ نہیں ہے۔ اللہ اپنے اس ملک کو کبھی اپنا نفس کہتا ہے۔ کبھی اپنی قدرت کہتا ہے۔ کبھی علیم کہتا ہے۔ کبھی خبیر کہتا ہے۔ کبھی حکیم کہتا ہے۔ کبھی خالق کل کہتا ہے اور کبھی کن کہتا ہے۔ اللہ کی یہی ملکیت ہے جو ماسوا اللہ کی مالک و حاکم ہے۔ ہر مخلوق اس کے آگے سر تسلیم خم کئے ہوئے ہے اور کائنات و ماورائے کائنات بلا تامل فرمان

ہے۔ اب ہم ملک کی ان اقسام کو قرآن مجید اور ارشادات معصومین کی روشنی میں بیان کرتے ہیں۔

پہلی قسم

آل عمران ۲۶۔ "(اے رسول) کہو کہ اے اللہ ملک کے مالک تو جسکو چاہتا ہے ملک عطا فرماتا ہے اور جس سے چاہتا ہے ملک چھین لیتا ہے اور تو جسکو چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسکو چاہتا ہے ذلت دیتا ہے۔ تیرے ہاتھ ہی میں خیر ہے۔ بیشک تو ہر چیز پر پوری پوری قدرت رکھنے والا ہے۔"

اس آیت میں اس عارضی اور وقتی ملک کا ذکر کیا گیا ہے جو ہر کسی کو مل جاتا ہے اور یہی وہ ملک ہے جسکے بارے میں امام حسینؑ فرماتے ہیں۔ "مومن وہ ہے جسے اس بات کی پروا نہ ہو کہ حکومت کس کے ہاتھ میں ہے۔"

تاریخ شاہد ہے کہ جن لوگوں کو یہ ملک ملا ان میں سے بیشتر اس دنیا سے عزت و آبرو کے ساتھ نہیں گئے۔ وہ آئے تو فرعون بن کر مگر گئے ذلیل ہو کر۔

دوسری قسم

ملک کی دوسری قسم وہ ہے جو خانوادہ اللہ کے لئے مخصوص ہے۔ اسی لئے اس ملک کو اللہ نے اپنی طرف بھی نسبت دی ہے اور یہ نسبت دے کر اپنے خانوادہ کی منزلت بیان کی ہے تاکہ دنیا متعارف ہو سکے اور اس کی وسعت اقتدار کا اندازہ لگایا جا سکے۔

۔انعام ۷۳۔ "اور وہ (اللہ) وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمینوں کو حق کے ساتھ پیدا کیا اور جس دن وہ کہے گا کہ "ہو جا" (کن) تو وہ ہو جائے گا۔ اس کا قول حق ہے۔ جس دن صور پھونکا جائے گا اس دن ملک اسی کا ہوگا۔ وہ غیب اور حاضر کا جاننے والا ہے اور وہ حکیم و خبیر ہے۔"

۲۔مومن ۱۶ "جس دن وہ قبروں سے نکل کھڑے ہوں گے ان کی کوئی چیز اللہ سے پوشیدہ نہ ہوگی۔ (آواز دی جائے گی) آج کے دن ملک کس کا ہے (جواب دیا جائے گا) خدائے واحد قہار کا۔"

ان دونوں آیات میں اللہ نے اپنے خلیفہ کی علامت کی شان بیان کی ہے جس سے زندگانی دنیا میں حق حکومت غصب کر لیا گیا تھا۔ پہلی آیت کا تعلق قیامت سے اور دوسری کا رجعت سے ہے۔ اپنے خلیفہ کی حکومت کو اس نے اپنی حکومت قرار دیا اور ساتھ ساتھ کئی چھ صفات کو بھی بیان کیا اور پھر ان صفات کو بھی اپنی طرف منسوب کیا۔ ان باتوں کو پہلے ہی ثابت کیا جا چکا ہے لہذا دہرایا نہیں کیا جائے گا۔ اس کا خلیفہ جو مالک ملک ہے اس کی پہلی صفت اعلیٰ خلاقیت ہے۔ دوسری صفت اس کا صدق ہے۔ اس صدق کے بارے میں اللہ نے سورہ شعراء ۸۴ میں حضرت ابراہیم کی یہ دعا نقل فرمائی۔ "اور میرے لئے آخری زمانے کے لوگوں میں لسان صدق (سچائی کی ایک زبان) مقرر کر دے"۔ اس دعا کی قبولیت کا اعلان پروردگار عالم نے سورہ

مریم کی آیت ۵۰ میں یوں فرمایا "اور انکو ہم نے اپنی رحمت سے کچھ حصہ بخشا اور ہم نے انکے لئے لسان صدق (سچائی کی ایک زبان) علی ابن ابی طالب کو قرار دیا"۔ (اس آیت میں حرف بحرف نحوی بحث تفسیر المتقین صفحہ ۲۰۰ پر موجود ہے۔ جن صاحبان کو شوق ہو وہ ملاحظہ فرماسکتے ہیں)۔ یہیں سے آپ یہ جان کر بھی خوش ہوں کہ کتب انبیاء سلف میں جہاں پیغمبر اسلام کے بہت سے نام ہیں وہاں ایک نام "ملک صدق" بھی ہے جسکے معنی ہیں "سچائی کا بادشاہ"۔

تیسری صفت ہے "عالم الغیب والشہادۃ" ہوتا ہے۔ چوتھی صفت "حکمت" ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ انکی ذات والا صفات بذات خود حکمت ہے۔ سورہ جمعہ میں ارشاد رب العزت ہوتا ہے "اللہ وہ ہے جس نے امیوں میں ایک رسول بھیجا جو انہی میں سے تھا وہ ان پر اللہ کی آیتیں پڑھتا ہے۔ انکا تزکیہ کرتا ہے اور انکو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے"۔

تفسیر فرات صفحہ ۳۲ پر ابن عباس سے روایت ہے کہ "یہاں کتاب سے مراد قرآن اور حکمت سے مراد علی ابن ابی طالب کی ولایت ہے"۔

پانچویں صفت "شہید" ہے اور اس پر ہم پہلے ہی گفتگو کرچکے ہیں۔

۳۔ بقرہ ۱۰۷ "کیا تو نہیں جانتا کہ آسمانوں اور زمین کا ملک بلاشبہ اللہ ہی کے لئے ہے اور اللہ کے سوا تمہارا کوئی ولی ہے اور نہ نصیر"۔

۴۔ توبہ ۱۱۶ : "یقیناً آسمانوں اور زمین کا ملک اللہ ہی کے لئے ہے۔ وہی زندہ رکھتا ہے وہی مارتا ہے اور اللہ کے سوا تمہارا نہ کوئی ولی ہے اور نہ نصیر"۔

ان دونوں آیات میں "مالک الملک" کا مطلب ولی، نصیر، محی اور ممیت بیان کیا گیا ہے۔

۵۔ مائدہ ۱۷ : "اور اللہ ہی کے لئے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے کا ملک ہے۔ وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور اللہ ہر چیز پر پوری پوری قدرت رکھنے والا ہے"۔

۶۔ ملک ۱ : "وہ (اللہ) بڑی برکت والا ہے جس کے ہاتھ میں ملک ہے اور وہ ہر چیز پر پوری پوری قدرت رکھنے والا ہے"۔

ان دو آیات میں اللہ نے ملک کا مطلب قدرت بیان فرمایا ہے۔

۷۔ شوریٰ ۴۹ : "اللہ ہی کے لئے آسمانوں اور زمین کا ملک ہے۔ وہ جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ وہ جس کے لئے چاہتا ہے لڑکیاں عطا کرتا ہے اور جس کے لئے چاہتا ہے لڑکے عطا کرتا ہے"۔

اس آیت میں یہ صراحت ہے کہ اولاد عطا کرنا مالک الملک ہی کا کام ہے۔

۸۔ مائدہ ۱۸ : "وہ جس کو چاہتا ہے بخش دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے عذاب دیتا ہے۔ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اللہ کا ملک ہے اور اسی

کی طرف بازگشت ہے"۔

اس آیت میں ملک کا مطلب دنیا و آخرت کا مالک ہونا ہے۔ پس دنیا و آخرت کا ملک اللہ کے لئے ہے۔ سا حنیفہ کی ملکیت ہے اسکے لئے وہ تمام صفات ثابت ہیں جو مندرجہ بالا آیات میں بیان ہوئی ہیں۔

تیسری قسم

یہ وہ ملک ہے جو خاص اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے جس میں اس کا کوئی شریک نہیں۔

فرقان ۲: "وہ وہی ہے جس کے لئے آسمانوں اور زمین کا ملک ہے اور جس نے نہ کوئی بیٹا بنایا اور نہ ملک میں اس کا کوئی شریک ہوا"۔

یہ وہ ملک ہے جس کا مالک ہونے پر اللہ فخر کرتا ہے اور یہی وہ ملک ہے جو قدیم ہے۔

مفتاح الجنان صفحہ ۹۶: "سبحان ذی الملک الفخر القدیم" یعنی پاک ہے وہ ذات جو قابل فخر اور قدیم ملک کا مالک ہے۔

مفتاح الجنان صفحہ ۱۵۸: "اے اللہ میں سوال کرتا ہوں تیرے عزت والے چہرے، تیرے عظیم اسم اور تیرے قدیم ملک کے واسطے سے"۔

پس معلوم ہو گیا کہ اللہ کا قدیم ملک وہی ہے جو اس کا چہرہ بھی ہے اور اسکا اسم اعظم بھی۔ آپ نے اس چہرے سے، اپنے اس اسم اعظم اور اپنے اس ملک کو جس نے سلطان بھی کہا اور حمد بھی جنکا ذکر ہم باری باری کریں گے۔

سلطان

سلطان ایک ایسا لفظ ہے جس کا ترجمہ ہر مترجم اپنی مرضی اور اپنی پسند سے کرتا ہے حالانکہ اس کے لغوی معنی ہیں "صاحب سلطنت" یا "حجت بالغہ"۔ ہم سمجھتے ہیں کہ جس صاحب سلطنت کو اللہ نے سلطان کہا ہے وہ کون ہے۔ یہ صاحب سلطنت وہ ہے جو اس سلطنت کا حاکم و مالک ہو اور اللہ کی ملکیت ہے اسی لئے اللہ نے اسے "سلطان مبین" اور اسے "سلطان نصیر" کہہ کر پکارا ہے۔

۱۔ نساء ۱۵۳۔ "اور ہم نے موسیٰ کو سلطان مبین دیا"۔

۲۔ ہود ۹۶۔ "اور یقیناً ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیاں اور سلطان مبین دے کر بھیجا"۔

۳۔ مومنون ۴۵۔ "پھر ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی ہارون کو اپنی نشانیوں اور سلطان مبین کے ساتھ فرعون اور اس کے ساتھیوں کی طرف بھیجا"۔

۴۔ القصص ۳۵۔ "(اللہ نے) فرمایا ہم تیرے بازو کو تیرے بھائی سے مضبوط کریں گے اور تم دونوں کے لئے ایک سلطان قرار دیں گے"۔

۵۔ مومن ۲۳۔ "اور یقیناً ہم نے موسیٰ کو معجزوں اور سلطان مبین کے ساتھ بھیجا"۔

۶۔ دخان ۱۹۔ "(موسیٰ نے کہا) اللہ پر سرکشی نہ کرو۔ یقیناً میں تمہارے پاس سلطان مبین لایا ہوں"۔

۷۔ ذاریات ۳۸۔ "اور موسیٰ (کے واقعہ) میں (بھی ایک نشانی ہے) جب کہ ہم

نے اسے فرعون کی طرف سلطان مبین کے ساتھ بھیجا"۔

ہم نے سات آیات قرآنی نقل کی ہیں جن میں کسی "سلطان مبین" کا ذکر آیا ہے اور یہ ساتوں آیات حضرت موسیٰ سے متعلق ہیں۔ قرآن کا اس بات کو بار بار دہرانا کوئی نہ کوئی معنی ضرور رکھتا ہے اور قرآن کے ہر قاری کا فرض ہے کہ اس امر سے سرسری طور پر نہ گزرے۔ سو قرآن مجید نے اتنی شدت سے بیان کیا ہے ورنہ بھلا ایک ہی بات کی تکرار اور اتنی بار تکرار بے معنی ہو سکتی ہے۔ ہم رجوع کرتے ہیں علامہ سید ہاشم بحرانی کی مشہور زمانہ کتاب "مدینۃ المعاجز" (اردو) صفحہ ۹۳ کی طرف اور دیکھتے ہیں کہ یہ سلطان مبین کون ہے؟ اس عبارت کی سرخی ہے۔ "موسیٰ و ہارون کی مدد کرنے والا سلطان کون تھا؟"۔

"رجب برسی مشارق الانوار الیقین میں لکھتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ و ہارون کو حکم دیا کہ وہ فرعون کو جا کر تبلیغ کریں تو حکم الٰہی پا کر دونوں بھائی دربار فرعون طرف روانہ ہوئے اور دونوں دل ہی دل میں گھبرا رہے تھے کہ نہ جانے فرعون ہم سے کیا سلوک کرے۔ اتنے میں انہوں نے دیکھا کہ ایک سوار آ گئے جس نے زربفت کا لباس پہنا ہوا تھا اور اس کے ہاتھ میں سونے کی تلوار تھی۔ اس نے ان سے کہا کہ تم دونوں بے خطر ہو کر میرے پیچھے چلے آؤ"۔

اس سوار نے فرعون کے پاس پہنچ کر فرعون سے کہا۔ "ان دونوں بزرگواروں کی اطاعت کرو ورنہ میں تجھے قتل کر دوں گا" فرعون یہ جملہ سن کر گھبرا گیا اور پھر وہ مشہور

سب کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ فرعون نے حضرت موسیٰ و ہارون سے کہا کہ تم کل میرے پاس آنا اور جو کچھ تمہیں مجھ سے کہنا ہو کہنا۔

جب موسیٰ و ہارون وہاں سے چلے گئے تو فرعون نے اپنے دربانوں سے کہا۔ "تم نے اس شہسوار کو میری اجازت کے بغیر کیوں آنے دیا تھا؟"۔ دربانوں نے کہا۔ "ہمیں آپ کی عزت کی قسم! ہم نے کسی شہسوار کو یہاں سے گزرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ہمارے سامنے سے تو صرف یہی دو بھائی گزر کر آپ کے پاس آئے ہیں"۔

وہ شہسوار کون تھا؟ علی تھا جو شروع سے اللہ کے انبیاء کی حمایت کرتا رہا اور محمد مصطفیٰ ﷺ کی تائید کرنی تھی۔ کیوں کہ علی ہی اللہ کا وہ کلمہ کبریٰ (کلمۂ تامہ) ہے جسے اللہ نے اپنے اولیاء کی مدد کے لئے مختلف اوقات میں مختلف صورتوں میں بھیجا اور علی نے بتایا: انبیاء نے ہر دور میں اسی کلمہ کبریٰ کا واسطہ دے کر ہی خدا سے دعائیں کیں۔ اللہ نے ان کی دعاؤں کو شرف قبولیت بخشا اور انہیں مشکلات سے نجات دی۔ اور قرآن مجید کی اس آیت میں اسی واقعے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ابن عباس نے کہا: "ان دونوں کے لئے وہ شہسوار آیت کبریٰ اور سلطان تھا"۔ مفسرین نے اس آیۂ مجیدہ کی تفسیر میں کہا: "یہ آیت اور سلطان علی کی صورت تھی۔ اس طرح سے دوسرے انبیاء کے لئے بھی علی کی صورت آیت اللہ کبریٰ بنتی رہی"۔

معلوم ہو گیا کہ سلطان مبین سے مراد حضرت امیر المومنین

ہے۔ ہمارے نبی کو مثیل موسیٰ کہا جاتا ہے۔ چونکہ حضرت موسیٰ کے تذکرے میں اللہ نے بار بار سلطان کا ذکر کیا ہے لہذا لازم ہے کہ حضرت ختمی مرتبت کو بھی یہی سلطان عطا کیا گیا ہو۔ چنانچہ سورہ بنی اسرائیل کی آیت ۸۰ میں ہم اس سلطان کا جلوہ ایک دوسرے رنگ میں دیکھتے ہیں۔ حضرت موسیٰ کا حال تو یہ تھا کہ جب کبھی وہ مشکل میں پڑتے تھے تو اللہ سلطان کو بھیج دیتا تھا مگر خاتم الانبیاء کی شان ہی کچھ اور ہے۔ آپ کے ساتھ تو یہ سلطان ہر لمحے ہر آن موجود رہتا ہے۔ لطف یہ ہے کہ اللہ نے خود یہ خواہش جیسی بیدار تمنا پیدا کی اپنے نبی کو حکم دیا کہ وہ مانگیں۔

"اور (اے رسولؐ) دعا کرو کہ میرے پروردگار مجھے داخل کر سچا داخل کرنا اور مجھے نکال سچا نکالنا اور میرے لئے اپنی جناب سے ایک سلطان نصیر قرار دے۔"

یہی وہ سلطان ہے جو اللہ کی عظمت و جبروت ہے۔ اسی کے سامنے گردنیں خم ہوتی ہیں اور اسی کے ہیبت سے پیشانیاں سجدے کرتی ہیں۔ یہی سلطان ہے جو اللہ کی ملکیت ہے۔ اللہ کا ملک ہے اور اسی ملک کی نسبت سے اللہ کو مالک الملک کہا جاتا ہے۔ یہی سلطان ہے جو قدیم ہے اور اللہ کی ازلی و ابدی حکومت ہے۔

۱۔ مفاتیح الجنان صفحہ ۵۲۔ "اے اللہ میں تجھ سے سوال کرتا ہوں تیرے اسم عظیم اور سلطان قدیم کے واسطے سے"۔

۲۔ مفاتیح الجنان صفحہ ۱۳۸۔ "پروردگار میں تجھ سے سوال کرتا ہوں تیرے سلطان کے

ذریعے جو ہر شے سے بلند ہے"۔

یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ علی کہتے ہی اسکو ہیں جو ہر شے سے بلند ہو۔ اللہ نے علی کا نام علی ویسے ہی نہیں رکھ دیا بلکہ اس لفظ کی پوری معنویت کے ساتھ رکھا ہے۔ علی نے کبھی پستی دیکھی ہی نہیں۔ وہ ظاہر ہوا کعبے میں جس کا مطلب ہے بلند۔ کا جسم اطہر دفن ہوا نجف میں جس کا مطلب ہے بلند۔ علی جب بھی نظر آئے گا بلندی پر نظر آئے گا چاہے وہ خانۂ کعبہ میں بت شکنی کا واقعہ ہو یا میدان غدیر۔

۳۔ مفاتیح الجنان صفحہ ۱۵۹: "پروردگار میں سوال کرتا ہوں تیرے سلطان کے واسطے سے جس کے ذریعے ہمیشہ ہمیشہ تیرے غلبے کی پہچان ہوتی ہے اور آسمانوں اور زمین میں اس سے تیری حمد ہوتی ہے"۔ (یعنی اس کی وجہ سے تیری حمد کی جاتی ہے کیونکہ یہی سلطان ہے جو تیرا چہرہ۔ تیری آنکھ۔ تیرا کان۔ تیرا پہلو۔ تیری زبان اور تیرا ہاتھ ہے اور جو وہ امر کرتا ہے تیری حمد کی جاتی ہے اسی سے ظاہر ہوتا ہے)۔

دوسرا پہلو

اب ہم "سلطان" کو ایک اور زاویے سے دیکھتے ہیں جہاں سورہ رحمٰن کی آیت ۳۳ میں ارشاد ہوتا ہے۔

"اے جنوں اور انسانوں کے گروہ! اگر تم استطاعت رکھتے ہو کہ آسمانوں اور زمین کے کناروں سے نکل جاؤ تو نکل جاؤ۔ لیکن تم نہیں نکل سکو گے مگر سلطان کی مدد

ہے"۔

اس بات کی وضاحت ہے کہ آسمانوں اور زمین کے کناروں سے کوئی ایک وجود بھی نہیں نکل سکا سوائے ایک مقدس ہستی کے جس نے تمام امکان کی حدود کو عبور کر کے دکھا دیا تو کیا بغیر سلطان کی مدد کے یہ بات ممکن ہوئی؟ جب نبی کریم کا اس دنیا میں بغیر اس سلطان کے کام نہ چلتا تو حد و امکان کو پامال کرنا کیونکر ممکن ہو سکتا تھا جب تک اس سلطان کی مدد شامل حال نہ ہو۔ بحر المعارف (عربی) صفحہ ۳۳۳ پر حضرت شیخ مرتبت اس حقیقت کا اعتراف یوں فرماتے ہیں: "یا علی انا معک فی الدنیا والآخرۃ" یعنی یا علی میں تیرا ساتھی ہوں دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی"۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ مرحلہ کس طرح طے ہوا۔

توضیح عارفین از کلام المعصومین صفحہ ۱۵۷۔ حضرت شیخ مرتبت نے معراج کے بارے میں فرمایا: "سریت من حسّی بحسّی الی حسّی"۔ یعنی میں گیا اپنی طرف سے اپنی ہی مدد سے اپنی طرف۔

ایک اور حیرت کا ازالہ

ایک طویل عرصے سے ہم حضرت شمس تبریز کا ایک شعر پڑھتے آ رہے تھے اور حیرت کرتے تھے مگر مندرجہ بالا حدیث پر غور کرنے سے یہ گتھی بھی سلجھ گئی۔ شمس تبریز نے فرمایا تھا۔

ہم اوّل، ہم آخر، ہم ظاہر، باطن

ہم عابد، ہم معبد، معبود علی بود

دوسرے مصرعے میں عابد، معبود تو سمجھ میں آتا تھا یعنی خود ہی سے مولا نے ارشاد فرمایا ہے "انا عابد، معبود" یعنی میں ہی عابد ہوں اور میں ہی معبود۔ لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ جس تحریر سے لفظ "معبد" کس طرح استعمال کیا۔ معبد کے معنی ہیں وہ مقام جہاں عبادت کی جائے۔ یعنی مسجد۔ تو یہ بات اب واضح ہوئی۔

سورہ بنی اسرائیل کی پہلی آیت میں ارشاد ہوتا ہے۔ "سبحان ہے وہ ذات جس نے سیر کرائی اپنے عبد کو رات کے ایک حصے میں مسجد حرام کی طرف سے مسجد اقصیٰ کی طرف جس کا ماحول (اردگرد) ہم نے مبارک بنایا تا کہ اس عبد کو اپنی کچھ آیات دکھائیں"۔

اس آیت میں اللہ فرما رہا ہے کہ میں اپنے بندے کو لے گیا مسجد حرام کی طرف سے۔ اور نبیؐ فرما رہے ہیں کہ میں آیا علی کی طرف سے۔ اللہ فرما رہا ہے کہ میں لے گیا اپنے بندے کو مسجد اقصیٰ کی طرف۔ نبیؐ فرما رہے ہیں کہ میں گیا علی کی طرف۔ اس کا صاف مفہوم یہ ہے کہ مسجد حرام بھی علی ہیں اور مسجد اقصیٰ بھی علی ہیں۔ اللہ نے مسجد اقصیٰ کے ماحول کو مبارک بنانے کا ذکر کیا ہے۔ سورہ نمل کی آٹھویں آیت میں حضرت موسیٰ کے واقعے کے متعلق ارشاد ہوتا ہے۔ "پس جب وہ

کے پاس گیا تو ندا آئی کہ جو آگ میں ہے اور جو اس کے ارد گرد ہے برکت دیا گیا ہے"۔ پس علی جہاں بھی ہوتے وہی مسجد اقصیٰ ہے یہاں تک کہ انھوں نے یہ فرمایا ہے کہ "جو آگ میں تھا وہ میں ہی تھا"۔ ن

ہم عابد و ہم معبود و جلوہ نشیں ہو

الحمد

ہم نے مقدمہ میں عرض کیا تھا کہ اللہ ہر ملک کا مالک ہے وہ قدیم ہے یہاں ایسا کوئی وقفہ ممکن نہیں ہے جبکہ اللہ بے ملک رہا ہو اور اس بات کو ہم ملک اور سلطان کے ذیل میں ثابت کر چکے ہیں۔ اللہ کی اسی ملکیت کا ایک نام "الحمد" بھی ہے۔

الحمد میں جو "ال" داخل ہے اس کو مترجمین نے "ال جنسیہ" قرار دیا ہے اور اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ "تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں"۔ یہ عظمت خدا سے ناواقف ہونے کی دلیل ہے۔ اس لئے کہ یہ صاف ظاہر ہے کہ اللہ اور اس کے مظاہر کی مکمل معرفت حاصل کرنا محالات سے ہے۔ اور بغیر معرفت کے جو بھی تعریف کی جائے گی وہ ناقص ہوگی اور ناقص شے کو اللہ سے منسوب کرنے کی جرات نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا یہاں "ال" کو معرفہ تعظیم کے بنا کوئی چارہ نہیں۔ اس طرح الحمد کے معنی ہوئے "ایک خاص حمد"۔ اسی طرح لفظ "للہ" کا مسئلہ ہے جس کا ترجمہ کیا جاتا ہے کہ الحمد اللہ کے لئے ہے۔ اگرچہ ظاہری طور پر یہ ترجمہ درست ہے لیکن "للہ" میں جو "لام" ہے وہ "لام ملکیت" ہے اور اس کا

حقیقی ترجمہ ہوگا کہ "الحمد اللہ کی ملکیت ہے"۔ پس یہ وہ ملکیت ہے جو اللہ کے ساتھ مخصوص ہے اور اس ملکیت میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے اس نے کسی مقام پر "ملک" اور کہیں "سلطان" کہا ہے اور اللہ کی اس ملکیت میں کسی کو شریک کرنے کا نام شرک ہے۔ پس حمد کے ذریعے اللہ کا "شکر" ادا کیا جاتا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ لفظ حمد عمومی طور پر تعریف کے لئے نہیں بلکہ شکر کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اصول کافی میں ہے کہ ایک مرتبہ امام محمد باقرؑ کی سواری گم ہو گئی اور آپ کے چند اصحاب اسے ڈھونڈنے کے لئے گئے۔ آپ نے باقی اصحاب کے سامنے فرمایا: "اے اللہ اگر میری سواری مل گئی تو میں تیرا پورا پورا (مکمل) شکریہ ادا کروں گا"۔ لوگ حیران تھے کہ اللہ کا مکمل شکر کیونکر ادا کیا جا سکتا ہے۔ اتنے میں معلوم ہوا کہ سواری مل گئی ہے تو آپ نے فرمایا: "الحمد للہ رب العالمین"۔ لوگ انتظار میں تھے کہ دیکھیں امام کس طرح اللہ کا پورا پورا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ جب آپ سوار ہونے لگے تو بالآخر لوگوں سے نہ رہا گیا اور انہوں نے پوچھ ہی لیا کہ "مولا! آپ تو فرما رہے تھے کہ میں اللہ کا پورا پورا شکریہ ادا کروں گا؟"۔ آپ نے فرمایا: "تم نے دیکھا نہیں کہ میں نے الحمد للہ رب العالمین کہا۔ یہی اللہ کا پورا پورا شکریہ ہے"۔ ہمیں بھی حکم ہے کہ دن میں دس مرتبہ اور رات میں دس مرتبہ اگر الحمد للہ رب العالمین کہا جائے تو اس دن اور رات میں اللہ نے جتنی نعمتیں عطا فرمائی ہیں ان سب کا پورا پورا شکریہ ادا ہو جائے گا۔ پس یہ اقرار کرنا کہ "ملک اللہ کی ملکیت ہے اس میں اس کا کوئی شریک نہیں" اللہ کا پورا پورا شکر ہے اور

قیامت کے روز بھی مومنین یہی جملہ اللہ کا شکریہ ادا کریں گے کہ "الحمد ہے اللہ کے لئے جس نے ہم کو اس طرف ہدایت کی اور اگر اللہ ہمیں ہدایت نہ کرتا تو ہم ہدایت پا ہی نہیں سکتے تھے"۔ (اعراف ۴۳)۔ ذیل میں جو شواہد ہم پیش کریں گے ان سے یہ بات بالکل واضح ہو جائے گی کہ الحمد اللہ کا وہی ملک ہے جو قدیم ہے جس میں کوئی شریک نہیں۔ جنکے ذریعے اس نے ہر شے کو خلق کیا جو اس کا علم، اسکی قدرت اور اس کا تصرف ہے۔ جنکے ذریعے وہ اللہ کرتا ہے جو کرتا ہے۔ جنکے ذریعے اسکی عبادت اور تسبیح کی جاتی ہے۔ جسکا فیض ہمیشہ جاری رہتا ہے اور کبھی منقطع نہیں ہوتا۔ جن کی سے بھی اللہ کی معرفت حاصل کی جا سکتی۔

۱۔ بنی اسرائیل ۔ "اور حمد اللہ ہی کے لئے ہے جس نے نہ کوئی بیٹا بنایا اور نہ ملک میں اس کا کوئی شریک ہے"۔

۲۔ تغابن ۔ "جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اللہ ہی کی تسبیح کرتا ہے۔ ملک اسی کے لئے ہے اور الحمد اسی کے لئے ہے اور وہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والا ہے"۔

سورۃ الحمد کے کئی نام ہیں۔ الحمد۔ فاتحہ۔ ام الکتاب اور سبع مثانی۔ ہم دیکھیں گے کہ ان سب کا مصداق کون ہے۔

۔ [illegible] الاسرار جلد ۱ صفحہ ۱۳۹۔ حضرت امیر المومنین نے فرمایا "میں ہی ام الکتاب اور فاتحہ ہوں"۔

رعد ۳۹ میں ارشاد ہوتا ہے۔ ''اللہ جس چیز کو چاہتا ہے محو کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے قائم رکھتا ہے اور اسکے پاس ام الکتاب ہے''۔

اس آیت سے ثابت ہوا کہ اللہ جو کچھ خلق کرتا ہے۔ جو کچھ مٹاتا ہے اور جو کچھ باقی رکھتا ہے علی ہی کے ذریعے کرتا ہے۔

۲۔ مفاتیح الجنان صفحہ ۷۹۱۔ زیارت امیر المومنین کے چند جملے۔

''جن کا ذکر اللہ نے اپنی محکم آیات میں کیا ہے۔ جیسا کہ فرمایا خدائے تعالیٰ نے کہ بیشک وہ ام الکتاب میں ہمارے نزدیک علی حکیم ہے۔ سلام ہو علی پر جو اللہ کا پسندیدہ امام ہے''۔

۳۔ [illegible] جلد ۱ صفحہ ۲۸۔ حضرت امیر المومنین نے فرمایا۔ ''ہم ہی وہ مثانی ہیں جنہیں خدا نے اپنے نبی کو عطا کیا ہے''۔

جب یہ معلوم ہو گیا کہ الحمد سے مراد علی ابن ابی طالب ہیں تو اب ہم مفاتیح الجنان سے اسی الحمد کے بارے میں چند اقتباسات پیش کرتے ہیں۔

صفحہ ۷۶۰۔ ''الحمد ہے اس اللہ کے لئے جس نے الحمد کو اپنے ذکر کی کلید بنایا''۔

حمد کی کلید نقطہ بائے بسم اللہ ہے اور ذکر اللہ بھی وہی ہے۔ یعنی علی کی معرفت علی ہی کے ذریعے ہو سکتی ہے۔ کسی اور ذریعے سے نہیں۔ اسی لئے آنجناب نے خود ارشاد فرمایا۔ ''میں وہ نقطہ ہوں جس کا پہچاننا ممکن نہیں ہو سکتا''۔ اس فرمان کا مطلب یہی

ہے کہ عالم کون و مکاں میں کوئی ایسا ہو جو اس کی ہستی کا تعارف کر سکے۔

۲۔ صفحہ ۴۸۔ "یہی ملک اسی کا ہے اور الحمد اسی کی ملکیت ہے۔ وہی زندہ کرتا ہے اور موت دیتا ہے۔ وہی موت دیتا ہے اور زندہ کرتا ہے۔ وہ زندہ ہے اسے موت نہیں۔ خیر اسی کے ہاتھ میں ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے"۔

۳۔ صفحہ ۶۷۔ "الحمد ہے اس اللہ کے لئے جس کا کوئی شریک نہیں۔ حمد ہے اللہ کے لئے۔ وہ حمد جو اس کی عزت اور جبروت اور اس کی عزت و جلال کے لائق ہے"۔

۴۔ صفحہ ۵۰۔ دعائے عشرات۔ یہ ایک طویل دعا ہے جس کے چند جملے ہم نقل کر رہے ہیں۔

(الف)۔ "تیرے لئے حمد ہے جس کا پایا ختم نہیں ہوتا ہے اور جس کی حد ختم ہونے والی نہیں"۔

(ب)۔ "اے معبود، حمد تیرے ہی لئے ہے۔ ایسی حمد کہ آسمان تیرے آگے اپنے شانے جھکائے اور زمین اور جو چیز اس پر ہے تیری تسبیح کرے"۔

(ج)۔ "اے معبود، حمد تیرے ہی لئے ہے جو ہمیشہ ہمیشہ جاری رہتی ہے۔ وہ نہ رکتی ہے نہ ختم ہوتی ہے۔ وہ تیرے ہی لائق ہے اور تجھ ہی تک پہنچتی ہے اور وہ میرے دل میں۔ میری زبان پر۔ میرے سامنے۔ میرے ساتھ۔ مجھ سے پہلے میرے بعد۔ میرے پہلو اور میرے اوپر اور میرے نیچے ہے جب میں مروں اور قبر میں تنہا رہ جاؤں۔ پھر خاک در خاک ہو جاؤں"۔

(و)۔ ''اور تیرے لئے الحمد ہے جب میں قبر میں تنہا ہوں اور چھوڑ دیا جاؤں۔ اے میرے مولا، اے میرے محبوب الحمد اور شکر تیرے ہی لئے ہے تیرے تمام کمال اوصاف کے ساتھ۔ تیری سب ہی نعمات کے ساتھ۔ حتیٰ کہ الحمد وہاں پہنچے جہاں تو چاہتا ہے۔ یہاں تک تیری رضا ہے''۔

(قبر میں وقت گزرے گا یہ آپ سب جانتے ہیں اور بندگی تمام رضا اس کے پاس ہے اس سے بھی بہترین وقت ہے)۔

(ہ)۔ ''اے محبوب الحمد تیرے ہی لئے ہے کہ تو مالک الحمد ہے۔ حمد تیرے ہی سے ہے کہ تجھ سے بندہ الحمد ہے اور تجھ پر انتہا الحمد ہے''۔

(ی)۔ ''اے محبوب الحمد تیرے ہی لئے ہے۔ ہمیشگی والی حمد تیرے دوام کے ساتھ۔ حمد تیرے ہی لئے ہے کہ تو خریدار الحمد ہے (ہر شخص جانتا ہے کہ اللہ نے اس کا نفس خرید لیا ہے)۔ اور الحمد تیرے ہی لئے ہے کہ تو نگہبان الحمد ہے۔ اور حمد تیرے ہی سے ہے۔ وہ الحمد جو قدیم ہے''۔

(ز)۔ ''اے محبوب الحمد تیرے ہی لئے ہے رات میں جب وہ چھپا جائے اور حمد تیرے ہی سے ہے دن میں جب وہ روشن ہو جائے''۔

(ح)۔ ''حمد تیرے ہی لئے ہے دنیا و آخرت میں۔ وہ الحمد جو اے پروردگار تجھے پسند ہو اور جس پر تو راضی ہے اور جتنی الحمد تیرے چہرے کی عزت اور جلالت کے

ادق ہے''۔

الفضیلہ

اب ہم اس کتاب کے اختتام کی طرف بڑھ رہے ہیں لیکن معرفت خدا ۔ صفات خدا اور محمد خدا کے حقائق ہم نے بیان کئے ہیں، ایک چند ضروری مسائل جب تک آپ تک نہ پہنچائے جائیں اس وقت تک ہماری بات نامکمل رہے گی۔ ہم نے حتی المقدور کوشش کی ہے کہ اپنے بیان کو اس سطح پر رکھیں کہ ہر سطح عقل اور ہر درجہ ایمان سمجھ سکے اور قبول کر سکے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایمان و معرفت کے مختلف درجات ہوتے ہیں۔ کوئی مومن ایمان کے اعلیٰ درجے پر فائز ہوتا ہے اور کوئی ادنیٰ درجے پر اور یقیناً معصوم یہ دونوں ایک دوسرے کے لئے باعث اذیت ہوتے ہیں لہذا یہ ضروری ہے کہ ایک دوسرے کی بات سمجھنے کی کوشش کی جائے اور بغیر سوچے سمجھے اعتراض نہ کیا جائے اور نہ اس بات کو کسی کے زجر و توبیخ عقائد سے بڑھ کر رہ کر حیرت و تذبذب میں گرفتار نہ ہو جائے کیونکہ عالم امکان میں ایک بھی فرد یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس نے حضرت امیر المومنین کی مکمل معرفت حاصل کر لی ہے۔ اس صورت میں آنجناب کی کسی بھی فضیلت کے بارے میں لب کشائی نہیں کی جا سکتی اور یہ اللہ کی قدرت تو ہے کہ آپ کی وہ فضیلت قرآن اور متواترات احادیث سے ثابت ہوتی ہے۔ ان حقائق کو ہمارے عقائد کی حیثیت سے نہیں جھٹلایا جا سکتا ہے۔

فضل کے معنی ہیں صفات کمال میں کسی سے آگے بڑھ جانا۔ اس لفظ کو اللہ نے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر استعمال کیا ہے لہذا پہلے ہمیں یہ جان لینا چاہیے کہ اللہ نے اپنے فضل سے کیا مراد لیا ہے۔

عمدۃ المطالب جلد ۱ صفحہ ۱۲ پر "ولو فضل الله علیکم و رحمة" کی تفسیر میں ابن عباس سے منقول ہے کہ "فضل اللہ" سے مراد حضرت امیر المومنین اور رحمت سے مراد جناب فاطمہ ہیں۔

جب یہ پتہ چل گیا کہ اللہ کا فضل حضرت امیر المومنین ہیں تو پھر یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ اللہ نے انسان کو بھی فضیلت عطا فرمائی ہے وہ علی ہی کے ذریعے علی ہی کی جہت سے اور علی کی معرفت کی مقدار کے مطابق عطا فرمائی ہے کیونکہ فضیلت کی جہت علی کی ہے جو مجسم فضل ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب علی کی فضیلت بیان کی جائے گی تو فضیلت پانے والے کے طور پر نہیں بلکہ فضیلت تقسیم کرنے والے کے طور پر اور علی کی ہر فضیلت کو اسی تناظر میں دیکھنا چاہیے۔

۱۔ کمال دین بولایت امیر المومنین صفحہ ۱۵۷ بحوالہ فرائد السمطین جلد ۱۔

رسول اللہ نے فرمایا "اللہ کا میری رسالت پر راضی ہو جانا علی کی ولایت کے باعث ہے"۔

۲۔ نہج الاسرار جلد ۱ صفحہ ۹۰ حضرت امیر المومنین نے فرمایا۔

"محمد کی نبوت کامل ہوئی میری وجہ سے"۔

۳۔ کتاب سلیم بن قیس صفحہ ۲۰۵۔ حضرت محمد مصطفیٰؐ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ ہدایت میں علی کو ہر امت میں بطور حجت پیش کرتا رہا ہے۔ اس میں نبی مرسل بھی شامل ہیں۔ تکوین بات کا گواہ بنایا تھا۔ ان کے لئے سب سے زیادہ وجہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک علی کی معرفت ہے"۔

۴۔ شرح ابن حدید ا صفحہ ۹۱۔ حضرت امیر المومنینؑ نے فرمایا:

"اے سلمان! ابراہیم نے ہمارے ہی سبب سے شرف حاصل کیا"۔

علی اعلیٰ - علی اعظم - علی اکبر - علی اکرم

۱۔ مفاتیح الجنان صفحہ ۳۰۰۔ (دعائے رجبیہ)

"پروردگار میں سوال کرتا ہوں تیرے اس نام کے واسطے سے جو عظیم، عظیم، عظیم ہے اور جو تیرا ذکر علی الاعلیٰ ہے۔ پروردگار میں سوال کرتا ہوں اس تجلی اعظم کے واسطے سے جو حج کی رات اس بزرگ و برتر مہینے میں ظاہر ہوئی۔ میں سوال کرتا ہوں اس ماہ (رجب) کے واسطے سے اور تیرے اس اسم کے واسطے سے جو اعظم الاعظم الاعظم اور اجل واکرم ہے"۔

۲۔ مفاتیح الجنان صفحہ ۱۴۷۔ "میں سوال کرتا ہوں تجھ سے تیرے اس اسم کے واسطے

ہے جو عظیم بھی ہے اور اعظم بھی۔ بڑا بھی ہے اور اکبر بھی"۔

علی اور تسبیح

سورہ اعلیٰ: "سبح اسم ربک الاعلیٰ"۔

ترجمہ: "(اے رسولؐ) تو اپنے رب کے اس نام کی تسبیح کرتا رہ جو علی ہے"۔

سورہ واقعہ ۹۶: "فسبح باسم ربک العظیم"۔

ترجمہ: "پس (اے رسولؐ) تو اپنے رب کے اس نام کی تسبیح کرتا رہ جو عظیم ہے"۔

علی کا ذکر

سورہ دہر ۲۵۔۲۶: "اور (اے رسولؐ) تو اپنے رب کے نام کا ذکر صبح و شام کرتا رہ اور رات کے چھوٹے سے حصے میں اس کے لئے سجدہ کرتا رہ اور طویل رات تک اس کی تسبیح کیا کر"۔

انسان کی زندگی کے دو حصے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو دوسرے لوگوں کے ساتھ گزرتا ہے (Public Life) اور یہ صبح سے شام تک ہوتا ہے۔ دوسرا حصہ وہ ہوتا ہے جو وہ ذاتی طور پر گزارتا ہے (Private Life) اور یہ رات کی تنہائی کا وقت ہوتا ہے۔ اللہ نے اپنے نبیؐ کے لئے دونوں زندگیوں کا لائحہ عمل طے کر دیا اور ہمیں یہ بتا دیا کہ نبیؐ کی ابتدا بھی علی اور انتہا بھی علی ہیں۔ لہٰذا اس نبیؐ کا امتی ہونے کا دعویٰ وہی کر سکتا ہے جس کی صبح و شام کی ابتدا "یا علی!" سے ہوتی ہو۔

۲۔مزمل ۸۔ "اور (اے رسولؐ) تو اپنے رب کے نام کا ذکر کیا کر اور سب سے الگ ہو کر اسی کا ہو جا"۔

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر وہ لمحہ جو علیؑ کے بغیر گزر جائے رائیگاں ہے اور ہر وہ عمل جس میں علیؑ نہ ہوں اکارت اور برباد ہے۔

یاعلیؑ مدد

یہ ایک طویل موضوع ہے جس کے لئے تفصیل درکار ہے۔ بعثت و اعلانیہ سے لے کر آخری سانس تک حضرت ختمی مرتبتؐ کا وظیفہ ہمیشہ "یا علیؑ مدد" رہا ہے۔ بدر ہو یا احد، خندق ہو یا خیبر، تبوک ہو یا حنین۔ ہمیں ہر مقام پر "یا علیؑ" اور "یا علیؑ مدد" ہی کی گونج سنائی دیتی ہے۔

یہ تمام واقعات مؤمنین کے سنے اور پڑھے ہوئے ہیں لہٰذا لکھے جانے کی ضرورت نہیں۔ ہم صرف ابتدائے نبوت اور انتہائے نبوت کے بارے میں عرض کرتے ہیں۔

اعلان نبوت کی ابتداء اس وحی سے ہوئی جس میں ارشاد ہوا "اقرا باسم ربک الذی خلق" یعنی (اے رسولؐ) پڑھ اپنے رب کے اس نام سے مدد مانگ کر جس نے خلق کیا۔

یہ ابتدا بھی جو "یا علیؑ مدد" سے ہوئی اور اب ہم انتہا پر نظر کرتے ہیں۔

۲۔ ینابیع المودۃ صفحہ ۲۳۔ رسول اللہ نے فرمایا۔ "علی کو پانچ فضیلتیں ایسی عطا کی گئی ہیں کہ وہ میرے لئے دنیا و مافیہا سے زیادہ محبوب ہیں۔ ان میں پہلی فضیلت یہ ہے کہ وہ مجھے اللہ عزوجل کے سامنے سہارا دیں گے"۔

قیامت کا امام

امامت وہ شے ہے جو کبھی منقطع نہیں ہوتی۔ ہر دور میں کوئی بھی مظہر امام کا موجود ہونا اس کی بقاء کے لئے لازمی ہے۔ ہم جس دور میں زندہ ہیں وہ اس زمین کا آخری دور ہے۔ رجعت سے دور قیامت کی ابتداء ہوگی اور یوم قیامت اسی دور کا خاتمہ ہے لہٰذا اس دور قیامت اور روز قیامت کے لئے بھی کسی نہ کسی امام کا ہونا لازمی ہے۔

۱۔ کوکب دری صفحہ ۱۸۶۔ رسول اللہ نے علی کے بارے میں فرمایا۔

"یوم قیامت کے روز میری امت پر اللہ کی حجت ہے"۔

۲۔ کوکب دری صفحہ ۱۹۰۔ رسول اللہ نے علی سے فرمایا۔

"قیامت کے اوقات تیرے ہاتھ ہیں اور تجھ سے متعلق ہیں"۔

۳۔ رسول اللہ کی ایک حدیث ہے جو مناقب کی ہر کتاب میں موجود ہے۔ ہم نے تفسیر فرات صفحہ ۲۵۵ سے اخذ کر رہے ہیں لیکن پہلے اس حدیث کا صرف ایک ٹکڑا نقل کرتے ہیں کے بعد انشاء اللہ پوری حدیث بیان کریں گے اور اس کی تائید ایک اور حدیث سے کریں گے۔

رسول اللہ نے فرمایا "علیؑ ابن ابی طالبؑ امامی بیدہ لواء الحمد"۔
اس کا ترجمہ کرنے سے پیشتر ایک اشتباہ کا ذکر کرنا ضروری ہے جو لفظ "امامی" کے معنے میں پیدا کر دیا گیا ہے۔ دلی منشاء صرف یہ ہے کہ کسی بھی صورت سے فضیلت علی پر پردہ ڈال دیا جائے اور یہ لوگوں کا محبوب مشغلہ ہے اسی لئے حضرت امیر المومنین نے ارشاد فرمایا ہے کہ "ہمارا امر تو بھی مشکل ہے اور اس کا سمجھنا بھی مشکل ہے۔ اسے برداشت نہیں کر سکتا مگر نبی مرسل یا ملک مقرب یا وہ مومن جس کے دل کا امتحان ایمان کے ساتھ لیا جا چکا ہو"۔

"امامی" کا مطلب ہے "میرا امام" اس طرح اس حدیث کا ترجمہ یہ بنتا ہے کہ "علی ابن ابی طالب میرا امام اس کے ہاتھ میں لواء الحمد ہوگا"۔
ایک محفل میں جہاں چند علماء بھی تشریف فرما تھے اسی حدیث کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی۔ میری زبان سے لفظ "امامی" سن کر ان کی زیر لب علمیت چھڑ گئی اور وہ فوراً بولے۔ "جناب یہاں یہ لفظ "امامی" نہیں بلکہ "امامی" ہے جس کا مطلب ہے "آگے چلنے والا"۔ میں نے عرض کیا کہ "قبلہ امام کہاں ہوتا ہے؟ آگے یا پیچھے"۔ تو بولے کہ "آگے"۔ میں نے عرض کیا کہ "پھر اس زیر زبر کے الٹ پھیر سے آپ کو کیا حاصل ہوا؟"۔ یہاں تو یہ حال ہے کہ ایک معمولی امام جماعت سے آگے کوئی نہیں بڑھ سکتا پھر کون ہے جو امام مبین سے آگے بڑھ سکے؟ اس گفتگو سے آپ اندازہ رکھتے ہیں کہ زبان سے علی علی کرنے والے علی کی طرف سے کتنے دور رہتے

ہیں کہ "نجات" کی کوئی بھی فضیلت سن کر ان کے کان فوراً کھڑے ہو جاتے ہیں۔ علیؑ بڑی ہی بڑی چیز کہ دشمنوں کو بھی ان کے مقابلے کے لئے کوئی نعرہ مجبوراً نہیں علیؑ کے مقابلے کے لئے اللہ کو ادا کیا۔ اس لئے یہ دیوانوں سے "یا علیؑ مدد" اور "یا محمدؐ" کہتے پھرتے ہیں۔ بہر حال اب آپ پوری حدیث سنئے جس کے بعد ہم ایک اور حدیث سے اس کی تائید و توثیق کریں گے۔

رسولؐ اللہ نے فرمایا "علیؑ ابن ابی طالب میرے امام ہیں جن کے ہاتھ میں لواء الحمد ہوگا۔ (لواء الحمد کا مطلب ہے کہ حمد کا جھنڈا یعنی جو کوئی "الحمد" ہے یہی اس کا علم ہوگا)۔ قیامت کے روز علیؑ میرے آگے ہوں گے۔ آپ کے ہاتھ میں لواء الحمد ہوگا جس کے دو پھریرے ہوں گے۔ ایک سبز ریشم کا اور دوسرا سفید کا"۔ یہ سن کر ایک اعرابی کھڑا ہو گیا۔ کہنے لگا "علیؑ کے بارے میں آپ جو کہتے ہیں اس میں بہت اختلاف ہوگا"۔ رسولؐ اللہ مسکرا رہے تھے اور ہنس رہے تھے۔ فرمایا "اے اعرابی! اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ علیؑ کو مجھ سے وہی نسبت ہے جو میرے سر کو میرے بدن سے"۔ (اور سر ہمیشہ بدن سے آگے ہوتا ہے)۔

کوکب دری صفحہ ۳۳ بحوالہ مناقب ابن مردویہ۔

جابر بن عبداللہ انصاری سے روایت ہے کہ "خدائے عزوجل کا ایک نور کا تاج اور ایک عمود یاقوت کا ہے جس پر لکھا ہے۔ "اللہ کے سوا کوئی قابل عبادت نہیں اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں اور محمدؐ کی آل تمام مخلوقات سے بہتر ہے اور اس علم کا مالک اور قیامت

<u>کا نام علی ابن ابی طالب ہے</u>"۔

<u>سر اور بدن</u>

سر جسم کا اشرف ترین حصہ ہے۔ حواس خمسہ میں سے چار حواس سر میں ہوتے ہیں۔ انسان کی پہچان چہرے سے ہوتی ہے جو سر میں ہے۔ سر بلندی اور عظمت کا مظہر ہے۔ اسی لئے کسی قوم کے لیڈر اور سب سے زیادہ باعزت شخص کو سر کہتے ہیں جس کی اطاعت پوری قوم پر واجب ہوتی ہے۔ بدن گردن کے نیچے سے پاؤں تک کے حصے کو کہتے ہیں اور یہ ہر شخص جانتا ہے کہ بدن کے وجود کا عمل دارومدار سر پر ہوتا ہے۔ انسان اس وقت تک مقبول رب العزت نہیں ہو سکتا جب تک اس کا سر درگاہ خداوندی میں نہ جھکے۔ یہ تمام باتیں اور آپ کے اذہان میں محفوظ ہو چکیں تو ہم اس حدیث کی طرف رجوع کرتے ہیں جو ہم نے تفسیر فرات صفحہ ۲۵۵ سے نقل کی تھی جس میں حضرت ختمی مرتبتؐ نے فرمایا۔

"<u>علی کو مجھ سے وہی نسبت ہے جو میرے سر کو میرے بدن سے</u>"۔

یہ حدیث مناقب کی ہر کتاب میں ملتی ہے۔ اور کوئی شیعہ سنی بھی اس کا انکار نہیں کرتا۔

علی وہ مقدس وجود ہے کہ اللہ اور رسولؐ دونوں ہی اسکے طلب گار ہیں۔ اللہ کہتا ہے کہ علی میرا نفس ہے۔ رسولؐ فرماتے ہیں کہ میرا نفس ہے۔ اللہ کہتا ہے کہ علی میرا چہرہ ہے اور ظاہر ہے کہ چہرہ سر ہی میں ہوتا ہے۔ رسولؐ فرماتے ہیں کہ علی میرا سر ہے

درحقیقت بھی یہی ہے کہ اگر علی نہ ہو تو توحید و نبوت دونوں بے معنی الفاظ بن کر رہ جاتے ہیں۔ اسی لئے اللہ کو اپنی الوہیت اور نبی کو اپنی نبوت کے اظہار کے لئے علی چاہئے۔

اللہ اور اسکے رسولؐ کے دعوے تو آپ نے سن لئے۔ اب ذرا سی بات بھی سن لیں جسکو یہ مومن پسند کر سکتے ہیں۔

نہج الاسرار جلد صفحہ ۲۷۹ حضرت امیر المومنین نے فرمایا۔

"سب سے زیادہ خوبصورت چیز بدن پر سر ہے"۔

تو آپ نے جان لیا کہ علی راس نبوت و رسالت ہے۔ اب اس سر کے بھی تھوڑا سا ملاحظہ کریں۔ سر بدن کے لئے تو [illegible] باعث زینت ہوتا ہے۔ لیکن ایک اور چیز بھی ہوتی ہے جو خود سر کے لئے باعث زینت ہوتی ہے اور وہ ہے "تاج"۔ کمال کی بات یہ ہے کہ سر بھی علی ہے اور تاج بھی خود علی ہی ہے۔

۱۔ مفاتیح الجنان صفحہ ۴۹۳۔ "اے معبود رحمت فرما مومنوں کے امیر پر جو تیرے مرتضی بندے۔ تیرے سچے امانتدار۔ تیری مضبوط رسی۔ تیرے بلند ہاتھ۔ تیرے علی پہلو اور دین کے ستون اور رسول اللہ کے سر کا تاج ہیں"۔

۲۔ مفاتیح الجنان صفحہ ۴۴۳۔ (زیارت امیر المومنین)

"وہ کام نہ تیرے نبی کا بھائی۔ غموں اور پریشانیوں کو دور کرنے والا

لئے سر کا تاج اور نجی کامیابی کی کلید"۔

علیؑ علیؑ ہے

۱۔ نہج الاسرار رشید صفحہ ۱۲۱ حضرت امیر المومنین نے فرمایا۔

"میں سب سے بڑے فخر کرنے والے پر بھی فضیلت رکھتا ہوں۔ میں شدید القوی ہوں"۔

اس عظیم الشان جملے اور خاص طور پر اس کے آخری ٹکڑے یعنی "شدید القوی" پر ایک طویل گفتگو کی جا سکتی ہے مگر یہ گفتگو ہمیں کسی اور کوچے میں لے جائے گی جہاں ایک بورڈ لگا ہوا ہے کہ "اس کوچے میں وہی داخل ہو سکتا ہے جو پہاڑ جیسا کلیجہ رکھتا ہو" لہٰذا جو لوگ بیمار دل و دماغ رکھتے ہوں وہ سورہ نجم کی تلاوت فرمائیں اور اسی کی مدد و توفیق سے گلشن معرفت کی سیر کریں۔ اور وہ حضرات جو اپنے سائے سے بھی ڈرتے ہوں ان کے لئے اس کی سمت سے دور رہنا مناسب ہے۔

جستجو ہوں دین و جاں عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

۲۔ مفاتیح الجنان صفحہ ۴۰۳۔ (زیارت امیر المومنین)

"پس خدا کی، اس کے فرشتوں کی اور اس کے رسولوں کی لعنت ہو اس پر جس نے آپ کی فضیلت کو چھپایا اور آپ کے حق کا منکر ہوا یا آپ سے بڑا بنا، جب کہ اس پر خدا نے آپ کو اس کے نفس سے زیادہ اختیار دیا"۔

۳۔ عمدۃ المطالب جلد ا صفحہ ۵۴۴۔ رسول اللہ نے فرمایا کہ آیت "جو لوگ ایمان لائے اور عمل صالح بجا لائے وہ تمام لوگوں سے افضل ہیں" سے مراد یہ ہے کہ علی تمام کائنات سے افضل ہے"۔

ان امور میں کسی قسم کا شک یا ترمیم نہیں کرنا چاہئے کیونکہ ہر شخص بلا تحقیق اس بات کا قائل ہے کہ علی نفس اللہ ہیں اور مسلمانوں کی تائید اس پر سند ہے جیسے کہ عمدۃ المطالب جلد صفحہ ۵۳۵ پر آیت "ویحذرکم اللہ نفسہ" (اور اللہ تمہیں اپنے نفس سے ڈراتا ہے) کی تفسیر میں مجاہد اور ابن عباس سے روایت ہے کہ "نفس اللہ سے مراد علی ہیں"۔ اور امام رضا نے فرمایا کہ "علی کے ذریعے اللہ نے لوگوں کو ڈرایا"۔ پس جب آنجناب نفس اللہ ہیں تو آپ پر کسی کو فوقیت دینا گویا اللہ پر فوقیت دینا ہے اور چونکہ نفس خدا علی ہر شے کا مالک مختار اور ہر نفس پر متصرف علی الاطلاق ہے۔

۴۔ مدینۃ المعاجز جلد ا صفحہ ۱۰۳۔۱۰۴۔

"رسول اللہ نماز پڑھا رہے تھے۔ نماز کے بعد آپ نے صفوں پر نظر کی اور آخری صف میں بیٹھے ہوئے حضرت علی پر نظر فرمائی اور کہا۔ "علی! آج تم نے میرے ساتھ پہلی صف میں کیوں شامل نہ ہوئے؟" آپ نے عرض کیا "یا رسول اللہ مجھے تجدید وضو کی ضرورت تھی اور میں وضو کی غرض سے اپنے گھر گیا تھا"۔ رسول اللہ نے فرمایا "علی اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں محمد کی جان ہے جب تک تم نماز میں شامل نہیں ہوئے اس وقت تک جبرئیل رکوع میں میرے گھٹنے کو تھامے رہے اور

رکوع نے مجھے کچھ نہیں دیا۔ کیا اس فضیلت کے باوجود بھی تیری محبت چھوڑ کے لوگ مجھے ملامت کرتے ہیں؟"۔

یہ فضیلت ہم نے علیؑ کے گھر میں ہی دیکھی کہ ان کے بیٹے کے سبب رسولؐ سجدے سے سر نہ اٹھا سکے اور خود علیؑ کے لئے رکوع سے نہ اٹھ سکے۔ جب نبی کی نماز بحیثیت علیؑ و حسینؑ ہے تو ہم ایسے کون سے خدا کے خاص مقرب بندے ہو گئے کہ بغیر علیؑ و حسینؑ کے ہی ہماری نماز مقبول بارگاہ خداوندی ہو جائے؟۔ اس حدیث سے ایک بات ظاہر ہوتی کہ سجدہ مخصوص ہے حسینؑ سے اور رکوع مخصوص ہے علیؑ سے۔

امیر المومنینؑ

اس لفظ کی عظمت کو وہی لوگ جانتے ہیں جو اس کا مطلب سمجھتے ہیں۔ کتنا شیریں ہے یہ لفظ کہ جیسے ہی لبوں پر جاری ہوتا ہے تو سانسوں میں محبت کی مٹھاس گھلنے لگتی ہے اور دل کی دھڑکنیں جوش و مستی کی سرگوشیوں میں تبدیل ہونے لگتی ہیں۔ اس لفظ میں کتنی کشش ہے کہ چودہ سو برس کی ذاتیں اس پرچم میں اور جہاں آنجناب کے دیگر القابات غصب ہوئے وہیں یہ لقب بھی غاصبین کی دست برد سے محفوظ نہ رہا۔ لیکن یہ لقب غصب کرنے والے لوگوں نے اپنے لئے ایک سند حاصل کرنی چاہی تو اسے ان احادیث میں ملے گا۔ آج کل یہ طریقہ رائج ہو گیا ہے کہ لوگوں کو غلط عمل سے بچانا اور

پکار چاہتا ہے نہ کہ اپنے عقیدے سے۔ اس لئے یہ شناخت کرنا کہ کون حقیقت میں کون ہے بہت مشکل ہو گیا ہے۔ ایک دن ٹی وی کے ویڈیو چینل پر ایک علامہ صاحب کی تقریر ہو رہی تھی۔ یہ وہی علامہ ہیں جن کا ذکر ہم نے کشف الاسرار میں بھی کیا ہے اور اس کتاب میں بھی ان کا ذکر خیر آ چکا ہے۔ اس تقریر میں تو انہوں نے غضب ہی کر دیا۔ یہ پہلی مرتبہ سنا پایا کہ کسی شیعہ مولوی نے علی کے لئے لفظ "امیر المومنین" کو ناجائز قرار دیا ہو۔ ہم اللہ کی پناہ مانگتے ہیں ایسے شیاطین سے اور دعا کرتے ہیں کہ اللہ مذہب شیعہ اور شیعہ قوم کو ایسے لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

نکتہ انہوں نے یہ اٹھایا کہ چونکہ اللہ کا ایک نام مومن بھی ہے اس لئے وہ مومنین میں شامل ہے۔ جس کے بقول اگر علی کو بھی امیر المومنین کہا جائے گا تو وہ اللہ کا بھی امیر ہو گا۔ نعوذ باللہ من ذالک

علامہ صاحب کو چاہئے کہ وہ اپنی بات پر ڈٹے رہیں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ کچھ عرصے بعد وہ اپنی بات سے مکر جائیں۔ چلیے ہم اللہ تعالیٰ کے قرآن پہ چلتے ہیں کیونکہ قرآن میں اللہ نے خود کو مومن کہا ہے۔ قرآن میں مومنوں کو حکم ہے نماز پڑھنے کا۔ روزہ رکھنے کا۔ زکوۃ دینے کا اور حج و جہاد کرنے کا۔ پس چونکہ خود اللہ بھی مومن ہے اس لئے (معاذ اللہ) اس پر بھی ازروئے قرآن یہ تمام چیزیں واجب ٹھہریں گی۔ قرآن میں کئی مقامات پر مومنین کے لئے تنبیہات وارد ہوئی ہیں تو چونکہ اللہ خود بھی مومن ہے تو (معاذ اللہ) یہ

تعبیرات کسی طرف بھی رجوع ہونگی۔ علامہ صاحب کو کیا کرنا چاہئے اور کیسی جہت اور خالق پر ماتم کرنا چاہئے۔ جو قدم وہ اٹھا رہے ہیں اس سے خالق کا کچھ نہیں بگڑتا بلکہ قدرت توحید ضرور منہدم ہوجاتی ہے۔ وہ اشتراک لفظی کو بنیاد بنا کر اشتراک معنی کا حکم لگا رہے ہیں جبکہ توحید کا بنیادی اصول ہی یہ ہے کہ اللہ کے لئے تشبیہ جائز نہیں ہے۔ معصوم سے کسی نے پوچھا کہ کیا اللہ "شئے" ہے؟ آپ نے فرمایا "ہاں! بشرطیکہ اسے دو حدوں سے نکال دو، حد تشبیہ اور حد تعطیل"۔ لیکن علامہ صاحب اشتراک لفظی کی بنا پر اللہ کو کسی مخلوق سے تشبیہ دے رہے ہوتے ہیں۔ عقل سے دشمنی کا یہی نتیجہ ہوتا ہے کہ پہلے عقل جاتی ہے اور پھر توحید رخصت ہوتی ہے۔

خالق و مخلوق ایک دوسرے سے بالکل جدا ہیں۔ ان میں نہ کوئی مشابہت ہوسکتی ہے اور نہ کوئی اشتراک۔ لفظ اگرچہ ایک ہی ہو لیکن جب مخلوق کی طرف رجوع ہوگا تو اسکے معنی کچھ اور ہونگے اور جب وہ خالق سے منسوب ہوگا تو اسکے معنی کچھ اور ہونگے۔ اصول کافی کتاب توحید میں امام رضا کا ایک طویل خطبہ موجود ہے جس میں آپ نے ایسے ہی الفاظ کی وضاحت فرمائی ہے جو خالق و مخلوق دونوں کے لئے بولے جاتے ہیں۔ ہمارا مقصد اپنے بیان کو طول دینا نہیں ہے بلکہ فقط معاملے کی تفہیم ہے اس لئے ہم صرف ایک لفظ پر اکتفا کرتے ہیں تاکہ بات واضح ہو جائے اور وہ لفظ ہے "حی" اسکے معنی ہیں "زندہ" یہ لفظ جاندار شے کے لئے بولا جاتا ہے اور یہی لفظ

اللہ نے خود اپنے لئے بھی استعمال فرمایا ہے۔ لیکن جب یہ لفظ مخلوق کے لئے بولا جائے گا تو اس کے معنی ہوں گے "وہ جو زندگی دی گئی ہے"۔ اور جب یہی لفظ خالق کے لئے بولا جائے گا تو "خالق حیات" کے معنی میں بولا جائے گا کیونکہ خود اس نے ہی فرمایا ہے۔ "خلق الموت والحیات"۔ اور جس شے کو اس نے تخلیق کیا ہو وہ اس پر طاری نہیں ہو سکتی۔ یہی حال لفظ مومن کا بھی ہے۔ جب یہ مخلوق کے لئے استعمال ہوگا تو اس کے معنی ہوں گے "ایمان لانے والا"۔ اور جب خالق کے لئے بولا جائے گا تو اس کے معنی ہوں گے "امن دینے والا"۔ اب یہ بات کہ اللہ نے اپنا نام مومن کیوں رکھا تو اس کا جواب رسول اللہ نے خود ہی دے دیا ہے۔ رسول اللہ نے علی کی محبت کو شرط قرار دیا ہے مومن ہونے کے لئے اور فرمایا ہے۔ "اے علی! تجھ سے محبت نہیں کرے گا مگر مومن"۔ اب کون ہے جو اللہ سے بڑھ کر علی سے محبت کرتا ہو۔ جب وہ متقین سے محبت کرتا ہے تو امام المتقین سے کتنی محبت کرتا ہوگا؟ جب وہ پاکیزہ لوگوں سے محبت کرتا ہے تو مالک تطہیر سے کتنی محبت کرتا ہوگا؟ اس نے اس لئے اپنا نام مومن رکھا تاکہ محبت علی کی شرط پوری ہو جائے اور اسکے رسول صادق پر کوئی اعتراض نہ ہو سکے۔ یہی سبب ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا "اللہ نے اپنا نام مومن اس لئے رکھا ہے تاکہ علی کے احترام کو ظاہر کرے"۔

اس لفظ کی عظمت و اہمیت کو واضح کرنے کے لئے ہم چند سوالات قائم کرتے ہیں تاکہ اس لفظ کا اصل مفہوم ذہنوں تک پہنچ جائے۔ کیونکہ ہمارے معاشرے میں

القابات تقسیم کرنے کا رواج عام ہے اور رفتہ رفتہ ایک ایسی ذہنیت پیدا ہوئی ہے جو یہ سمجھتی ہے کہ جیسے غیر معصوم لوگوں کے لئے بطور احترام مختلف القاب استعمال کئے جاتے ہیں ویسے ہی (معاذ اللہ) معصوم کے لئے بھی بہ احترام مختلف القاب استعمال کرتے ہیں جنکے حقیقی معنی کچھ نہیں ہوتے۔ مقصد فقط احترام اور تعظیم ہوتا ہے۔ اس غلط فہمی کو اب رفع ہو جانا چاہئے۔

پہلا سوال

علی کو امیر المومنین کا لقب کس نے عطا کیا؟

۱۔ کوکب دری صفحہ ۳۳۹۔ حضرت امیر المومنین نے فرمایا: "اہل آسمان میرا نام احمد لکھتے ہیں۔ پانچویں آسمان پر میرا نام علی ہے۔ حضرت رب العزت نے مجھ کو امارت کی مسند پر بٹھایا ہے اور میرا نام امیر المومنین رکھا ہے"۔

۲۔ عمدۃ المطالب جلد ۱ صفحہ ۲۰۲۔ تفسیر مجلد میں ہے کہ اللہ نے علی کا نام ۸۹ مقامات پر قیامت تک امیر المومنین اور سید المخلصین رکھا ہے"۔

۳۔ مدینۃ المعاجز جلد ۱ صفحہ ۳۸۔ ابو حمزہ ثمالی نے امام محمد باقرؑ سے روایت کی کہ آپ نے اپنے آبائے طاہرین کی سند سے بیان کیا: "اللہ تعالیٰ نے جبریل امین کو حضرت محمد مصطفیٰ کے پاس بھیجا اور حکم دیا کہ وہ اپنی زندگی میں علیؑ کی وصایت دیں اور انہیں امیر المومنین کے لقب سے ملقب کریں"۔

۴۔ مدینۃ المعاجز جلد ۱ صفحہ ۴۴۔ رسول اللہ نے فرمایا۔ "علیؑ کا نام امیر المومنین میں نے نہیں بلکہ اللہ نے رکھا ہے"۔

یہاں ہم نے صرف چار احادیث پر اکتفا کیا ہے جبکہ ایسی احادیث کثیر تعداد میں ہیں اور ان میں سے بعض آئندہ آنے والے سوالات کے ذیل میں آتی رہیں گی جن سے ثابت ہوتا ہے کہ علیؑ کو امیر المومنین کا لقب کسی اور نے نہیں بلکہ خود اللہ نے عطا فرمایا ہے۔

دوسرا سوال

یہ لقب علیؑ کو کب عطا کیا گیا؟ یعنی علیؑ کے اس لقب کا اعلان کب کیا گیا؟

یہ سوال اس لیے قائم کیا گیا ہے کہ لوگوں نے ہمیشہ یہی سمجھا کہ علیؑ کو یہ لقب مدینے میں عطا کیا گیا اور یہ اسی زمانے کے لیے تھا۔

۱۔ عمدۃ المطالب جلد ۱ صفحہ ۴۴۔ جابر جعفی سے روایت ہے کہ مجھ سے امام محمد باقرؑ نے فرمایا۔ "اگر لوگوں کو اس بات کا علم ہوتا کہ جناب علیؑ کا نام امیر المومنین کب رکھا گیا تو لوگ آپ کی ولایت کا انکار نہ کرتے"۔ میں نے عرض کیا۔ "اللہ آپ پر رحم کرے۔ آپ کا نام امیر المومنین کب رکھا گیا؟"۔ فرمایا۔ "جب اللہ نے اولادِ آدم کے صلب سے نسل کو نکالا اور ان کو اپنے نفسوں کا گواہ بنایا اور کہا کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ محمدؐ میرے رسول ہیں اور علیؑ امیر المومنین ہیں"۔

یہ حدیث وضاحت کے ساتھ بتا رہی ہے کہ ازل سے ابد تک جتنے مومنین گزر چکے ہیں یا گزریں گے۔ علیؑ ان سب کے امیر ہیں۔ یہاں تک کہ اگر ایک بھی مومن باقی رہ جائے گا تو علیؑ اس کے بھی امیر ہوں گے۔ حدیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ صلب آدمؑ سے نکلنے والا ایک ایک مومن علیؑ کی رعایا میں شامل ہے۔

۲۔ مدینۃ المعاجز جلد ۱ صفحہ ۳۲۵۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔

(الف)۔ "جب اللہ نے عرش کو پیدا کیا تو اس پر لا الٰہ الا اللہ محمدؐ رسول اللہ علیؑ امیر المومنین تحریر کیا"۔

(ب)۔ جب اللہ نے پانی کو پیدا کیا تو اس کی لہروں پر لا الٰہ الا اللہ محمدؐ رسول اللہ علیؑ امیر المومنین لکھا۔

(ج)۔ جب اللہ نے زمین کو پیدا کیا تو اس کے پایوں پر تحریر کیا لا الٰہ الا اللہ محمدؐ رسول اللہ علیؑ امیر المومنین۔

(د)۔ جب اللہ نے لوح کو پیدا کیا تو اس پر لکھا لا الٰہ الا اللہ محمدؐ رسول اللہ علیؑ امیر المومنین۔

(ہ)۔ جب اللہ نے اسرافیلؑ کو پیدا کیا تو اس کی پیشانی پر لکھا لا الٰہ الا اللہ محمدؐ رسول اللہ علیؑ امیر المومنین۔

(و)۔ جب اللہ نے جبرئیلؑ کو پیدا کیا تو اس کے دونوں پروں پر لکھا لا الٰہ الا اللہ محمدؐ

رسول اللہ علی امیر المومنین۔

(ز)۔ جب اللہ نے آسمان بنائے تو ان کے اطراف پر لکھا لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ علی امیر المومنین۔

(ح)۔ جب اللہ نے زمینیں پیدا کیں تو ان کے طباق پر لکھا لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ علی امیر المومنین۔

(ط)۔ جب اللہ نے پہاڑ بنائے تو ان کی چوٹیوں پر لکھا لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ علی امیر المومنین۔

(ی)۔ جب اللہ نے سورج بنایا تو اس پر لکھا لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ علی امیر المومنین۔

(ک)۔ جب اللہ نے چاند پیدا کیا تو اس پر لکھا لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ علی امیر المومنین۔ اور چاند میں تمہیں جو سیاہی دکھائی دیتی ہے وہ یہی تحریر ہے۔ جب بھی تم میں سے کوئی بھی لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھے تو فوراً کہے علی امیر المومنین"۔

تیسرا سوال

کیا حیات پیغمبرؐ میں بھی جناب علی امیر المومنین تھے؟۔

یہ بہت اہم سوال ہے کیونکہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اپنے زمانے میں خود رسولؐ اللہ امیر المومنین تھے اور بعد رسول علی امیر المومنین کہلائے۔

۱۔ عمدۃ المطالب جلد ۱ صفحہ ۴۴۔

"اہل سنت کے بہت سے علماء نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ کی خدمت میں بوبکر حاضر ہوئے۔ آنحضرت نے فرمایا: "جاؤ امیر المومنین کو سلام کرو۔" عرض کیا: "یا رسول اللہ آپ زندہ ہیں آپ کے ہوتے ہوئے کون امیر المومنین ہوسکتا ہے؟" فرمایا: "میری زندگی میں سلام کرو"۔

۲۔ مدینۃ المعاجز جلد ۱ صفحہ ۳۹۔

بریدہ بن خصیب کا بیان ہے کہ "رسول خدا نے مجھ سمیت سات افراد کو جن میں بوبکر، عمر، طلحہ، زبیر بھی شامل تھے حکم دیا تھا کہ تم علی کو امیر المومنین کہہ کر سلام کرو۔ ہم نے رسول خدا کی موجودگی میں انہیں امیر المومنین کہہ کر سلام کیا"۔

چوتھا سوال

کیا خود حضرت ختمی مرتبت علی کو امیر المومنین کہہ کر مخاطب کرتے تھے؟۔

۱۔ عمدۃ المطالب جلد صفحہ ۴۲۔

"ایک بھوکا شخص رسول اللہ کے پاس آیا اور کھانے کا سوال کیا۔ کسی نے اسے کھانا کھلانے کی حامی نہ بھری تو وہ جناب امیر کے گھر گئے۔ آپ کے گھر میں صرف ایک بچے کا کھانا تھا۔ آپ نے فرمایا: "ہم ایثار کریں گے"۔ بچوں کو بھوکا سلا دیا اور کھانا اس بھوکے کو کھلا دیا۔ صبح رسول اللہ نے نماز کے بعد جناب امیر کو دیکھا تو بہت روئے اور

فرمایا: "اے امیر المومنین! تمہارے رات والے کام سے اللہ تعالیٰ تعجب میں ہے"۔

۲۔ مدینۃ المعاجز جلد ۱ صفحہ ۳۹۔

ابن عباس روایت کرتے ہیں کہ ہم نبی اکرمؐ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں علیؑ آئے اور انہوں نے "السلام علیکم یا رسول اللہ" کہہ کر آنحضرتؐ کو سلام کیا۔ جس کے جواب میں رسول اکرمؐ نے فرمایا: "وعلیک السلام یا امیر المومنین و رحمۃ اللہ و برکاتہ"۔ حضرت علیؑ نے کہا: "یا رسول اللہ آپ کی زندگی میں مجھے امیر المومنین کہہ کر پکارتے ہیں؟" آنحضرتؐ نے فرمایا: "جی ہاں میری زندگی میں بھی ہوں گا"۔

۳۔ انسائیکلو پیڈیا حضرت علیؑ جلد ۲ صفحہ ۴۴ بحوالہ بحر المناقب۔

"حضرت ابوذر غفاری سے روایت ہے کہ حضرت علیؑ تشریف لائے تو رسول اکرمؐ نے فرمایا۔ وہ امیر المومنین آئے۔ فرمایا کہ علیؑ کا مجھ سے پہلے امیر المومنین نام رکھا گیا ہے۔ کہا گیا کہ یا رسول اللہ! آپ سے پہلے؟ فرمایا۔ ہاں۔ پھر کہا گیا کہ عیسیٰ اور موسیٰ سے بھی پہلے؟ فرمایا۔ ہاں۔ پھر کہا گیا کہ سلیمان بن داؤد سے بھی پہلے؟ فرمایا۔ ہاں۔ اسی طرح تمام انبیاء کا نام لیا گیا اور حضرت آدم تک۔ پھر آپؐ نے فرمایا کہ جب خدا نے جنت کو خلق فرمایا تو اس کے سامنے پیش کیا اور خلق کیا گیا۔ وہ اللہ کی تسبیح بھی بیان کرتا تھا اور تحمید بھی۔ پھر خدا نے فرمایا کہ میں تجھ میں

ایک مرد کو ساکن کر رہا ہوں جسے میں سب کا امیر المومنین بناؤں گا۔ پھر جب خدا نے علی کو خلق فرمایا تو اسے اس درہ میں ساکن فرمایا۔ اس لحاظ سے حضرت آدم سے بھی پہلے علی کا نام امیر المومنین رکھا گیا"۔

پانچواں سوال

کیا حضرت علی کے علاوہ کسی بھی نبی، وصی، ولی یا امام حق کو خواہ رسول اللہ اور کیا وہ مثلاً کو امیر المومنین کہا جا سکتا ہے؟۔

۱۔ کتاب سلیم بن قیس صفحہ ۱۶۴ پر حضرت امیر المومنین نے فرمایا۔

"خدا کی قسم امیر المومنین کا لقب میرے سوا کسی اور کے لئے درست نہیں"۔

۲۔ اصول کافی۔ کتاب حجت۔ باب ۱۰۲۔ حدیث ۴۔

ایک شخص نے امام جعفر صادق سے سوال کیا کہ "کیا قائم آل محمد کو امیر المومنین کہہ سکتے ہیں؟" فرمایا "نہیں! یہ نام اللہ نے امیر المومنین کا رکھا ہے۔ اس سے پہلے یہ نام کسی اور کا نہیں ہوا اور آپ کے بعد کوئی اس نام سے موسوم نہ ہوگا مگر کافر"۔

۳۔ مدینۃ المعاجز جلد ۱ صفحہ ۴۰۔ رسول اللہ نے فرمایا۔

"اے علی! تو آسمان والوں کا امیر ہے اور تو زمین والوں کا امیر ہے اور جو لوگ اس جہان سے چلے گئے تو ان کا امیر ہے اور جو باقی ہیں تو ان کا امیر ہے۔ نہ تو تجھ سے پہلے کوئی امیر گزرا ہے اور نہ تیرے بعد کوئی امیر ہوگا کیونکہ ان لوگوں کا اللہ نے یہ نام

نہیں رکھا، ان کے لئے یہ نام رکھنا حرام ہے"۔

۴۔ مدینۃ المعاجز جلد ۱ صفحہ ۱۲۱۔

ایک شخص امام جعفر صادق کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے کہا "السلام علیک یا امیر المومنین"۔ جیسے ہی اس شخص نے آپ کو امیر المومنین کہا تو آپ چونک کر کھڑے ہو گئے اور اس سے فرمایا "رک جاؤ! یہ نام حضرت علی کے علاوہ کسی کے لئے بھی درست نہیں ہے۔ اللہ نے یہ نام صرف انہی کو عطا کیا ہے۔ ان کے علاوہ کسی دوسرے کا یہ نام نہیں رکھا اور حضرت کے علاوہ جو بھی اپنے لئے یہ نام پسند کرے گا تو وہ لعنت شدہ شخص ہوگا"۔ (بعض روایات میں ہے کہ وہ لعنت یا جہل میں مبتلا ہوگا۔ لیکن معنی دونوں کے ایک ہی ہیں)۔

۵۔ مدینۃ المعاجز جلد ۱ صفحہ ۳۸۹۔ رسول اللہ نے معراج کا واقعہ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ نے فرمایا "علی حقیقی امیر المومنین ہے۔ اس سے نہ تو پہلے کوئی امیر المومنین بنا اور نہ اس کے بعد کوئی دوسرا امیر المومنین ہوگا"۔

بات یہ ہے کہ علی کسی ایرے غیرے کا امام بنتا ہی نہیں اور نہ وہ کسی ایرے غیرے کا امیر بنتا ہے۔ وہ امام ہے صرف متقین کا اور وہ امیر ہے صرف مومنین کا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ قوم و قبیلہ کوئی بھی ہو اس کا سردار ایک ہی ہوتا ہے اور وہ مومنین کا سردار ازل سے ابد تک صرف اور صرف علی کی ذات ہے۔ جس

جو کوئی جس کسی کو بھی علی کی امارت سے نکالنا چاہے تو پہلے اسکے مومن ہونے کا انکار کرے ورنہ اگر وہ مومن ہے تو علی اسکا امیر ہے۔

ان تمام باتوں کا خلاصہ یہ نکلا کہ:۔

محمد چودہ ہیں۔

علی بارہ ہیں۔

لیکن امیر المومنین صرف اور صرف ایک ہے۔

بحرِ طویل میں منظوم نذرانہ عقیدت

علیؑ حق!

موالیانِ حیدرِ کرارؑ کے لئے بطورِ خاص۔

یاعلیؑ! تیری ولایت وہ سمندر ہے کہ جو اس میں اتر جائے تو پھر قیدِ زماں قیدِ مکاں توڑ کے پہنچے وہ کسی ایسے نگر میں کہ جہاں دن کا اجالا ہے نہ ہے شب کی سیاہی نہ کوئی چاند نہ سورج نہ ستارے نہ کوئی کوہ نہ وادی نہ گلستاں نہ بیاباں نہ کوئی چاند سا چہرہ نہ ستاروں سے بھری مانگ نہ زلفوں کی گھٹائیں نہ کسی جلوۂ جاں سوز کی مخمور ادائیں نہ کسی آنکھ کا جادو نہ کسی سانس کی خوشبو مگر اے جانِ حقیقت نظر آتا ہے تو بس تو! فقط تو! فقط تو! فقط تو!

اندھی ہو جائیں وہ آنکھیں جو نہ دیکھیں ترا جلوہ ترا چہرہ ترے عارض ترے گیسو ترے ابرو تری قامت کہ تو ہی عینِ وجود اور تو ہی اصلِ وجود اور تو ہی رنگِ خدا بوئے خدا روئے خدا خوئے خدا جو بھی بڑھا تیری طرف اس نے اٹھایا ہے قدم سوئے خدا۔ اب نہ کوئی ساز نہ آواز مگر ایک ندائے لبِ عشاق جو اٹھتی ہے چلتی ہے پھر اٹھتی ہے چلتی ہے علیؑ حق! علیؑ حق!

یاعلیؑ! تیری ولایت وہ شجر ہے کہ جو پھیلا ہے سرِ کون و مکاں جسکی ہر ایک شاخ ہے بندوں کے لئے دستِ اماں جسکا ہر اک پتہ خموشی میں بھی ہے سچ کی زباں جسکے ہر اک حرف سے ایجاد ہوا حسنِ بیاں جسکے ہر اک پھل میں ہے وہ رنگ وہ آہنگ جو ہر آنکھ کو دیوانہ بنادے جو ہر اک سینے میں طوفان اٹھادے جو نظر آئے کبھی کچھ کبھی کچھ کبھی آنکھ یہ بولے کہ یہ بندہ ہے کبھی دل کی صدا آئے کہ معبود یہی ہے!

یہ شجر وہ ہے کہ اللہ کرے اسکے وسیلے سے کلام اور اگر اسکا وسیلہ نہ ہو ملتی نہیں موسیٰ کو نبوت نہ رسالت نہ امامت یہ شجر وہ ہے کہ موسیٰ سرِ تسلیم کرے خم تو یہ بولے کہ نہ ڈر اے میرے بندے میں خدا ہوں میں خدا ہوں میں خدا ہوں!

سوچتے رہ گئے موسیٰ جسے کہتا ہوں میں اللہ وہ ہے واحد و یکتا وہ احد ہے وہ صمد ہے وہ کہاں صوت اور آواز کا پابند؟ تو پھر کس نے پکارا کہ میں رب ہوں؟ میں خدا ہوں؟ تو ہر اک ذرے میں وادی میں پہاڑوں میں ہواؤں میں فضاؤں میں صدا گونج اٹھی حق! علیؑ حق! علیؑ حق!

یاعلیؑ! تیری ولایت وہ بلندی ہے جسے چھو نہیں سکتی ہے کوئی اور بلندی نہ پہنچ

عرش کی اس تک نہ ہے کرسی کی رسائی کہ وہ رتق ہے سراپردۂ وحدت میں جہاں لفظ ''کہاں'' اور ''وہاں'' کچھ نہیں جز کلمۂ بے معنی و مہمل کہ وہی اوّل و آخر ہے وہی ظاہر و باطن ہے وہی عالی و اعلیٰ ہے وہی اعظم الاعظم ہے وہی اکرم الاکرم ہے وہی اکبر الاکبر ہے وہی ہے کہ اذانوں میں جسے کہتے ہیں اکبر یہ وہی ہے کہ نظر آتی ہے ذروں میں ستاروں میں شعاعوں میں خلاؤں میں پہاڑوں میں سمندر میں گلستان و بیابان میں اسکے رخِ زیبا کی جھلک بس گئی بُستانِ شب و روز میں اس گیسوئے مشکیں کی مہک جب سے بجی دل میں وہ دھن موہنی صورت تو سنائی نہیں دیتی کوئی آہٹ کوئی دھڑکن دلِ بے تاب کے ہر تار میں ہے ایک ہی جھنکار کہ بس حق! علی حق! علی حق!

وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم

یہ کتاب ''کشف المعارف'' آج بتاریخ ۱۴ اکتوبر ۲۰۰۴ء مطابق ۲۸ شعبان ۱۴۲۵ ہجری روز جمعرات بوقت سوا بارہ بجے دن بتوفیق خداوندی وبتائید وامداد حضرت صاحب الزمانؑ پایۂ تکمیل کو پہنچی۔

الحمد للہ رب العالمین۔ والصلوٰۃ والسلام علی خاتم النبیین و آلہ الطیبین الطاہرین المعصومین المظلومین ولعنۃ اللہ علی اعداءہم اجمعین من یومنا ھذا الی یوم الدین۔

تحفۂ یا علیؑ مدد